قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2022 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

مالیگاؤں کتاب میلہ 2021

24ویں قومی اردو کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں

اردو دنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24، شمارہ:02، فروری 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

ربط والتفات — قارئین کے خطوط — 5

رپورٹ

مالیگاؤں کتاب میلہ — نایاب حسن — 8

ادب: زاویے اور جہات

مخدوم کی شاعری میں تصور عشق کی حقیقت — اسلم آزاد — 20

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تنقیدی بصیرت اور خسرو شناسی — ریاض توحیدی — 23

آزادی کے بعد نمائندہ خواتین ناول نگاروں کا تنقیدی جائزہ — سیدہ نسیم سلطانہ — 25

مولوی عبدالرحمن کی تصنیف 'مرآۃ الشعر' — جسیم الدین — 28

بہار میں اردو فکشن کی تنقید — مسرت جہاں — 32

خراج عقیدت

حسین الحق فکشن کے ایک روشن باب کا خاتمہ — محمد شارب — 36

زبیر الحسن غافل کی شاعری کے امتیازی پہلو — فاطمہ خاتون — 39

کتاب دریچہ

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — فیاض انور صبا — 41

دانش گاہیں

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں اردو تحقیق کی سمت و رفتار — سمیرہ بانو — 43

زبان و تعلیم

پر لطف اور انہماکی اکتساب — ذکی ممتاز — 46

سلسلۂ صحافت

ایڈیٹنگ کے رموز وفن — محمد توحید خان — 49

اردو طنز و مزاح اور اودھ پنچ — محمد فاروق — 53

چراغ راہ

اردو زبان کی ترویج واشاعت میں صوفیائے دکن کا حصہ — احمد — 55

خصوصی گفتگو

عبدالودود انصاری سے ایک ملاقات — کیپٹن ایم ایم شیخ — 58

زبان اور زمینی صورت حال

اردو جوڑنے کا کام کرتی ہے توڑنے کا نہیں — عمران عاکف خان — 61

نیا آسماں نئے ستارے

اردو غزل کا علامتی نظام — ساجد ممتاز — 63

1857 کے بعد اردو شاعری میں حب الوطنی کا تصور — سنیل کمار — 67

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ — 69

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 80

ہماری بات

قارئین کرام!

ڈیجیٹل ایج میں زیادہ تر لوگوں کی نگاہیں موبائل اور کمپیوٹر کی اسکرین پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں کیونکہ موبائل اور کمپیوٹر کی اسکرین پر وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی آج کے عہد میں ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انٹرنیٹ نے انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور ترقی کی رفتار میں بھی تیزی پیدا کر دی ہے، مگر یہ بھی اپنی جگہ تلخ حقیقت ہے کہ بعض چیزیں موبائل اور انٹرنیٹ کی وجہ سے متاثر بھی ہو رہی ہیں۔ باشعور افراد کا خیال ہے کہ اس ڈیجیٹل عہد میں کتاب کلچر کو نقصان پہنچا ہے۔ جب کہ ایک زمانہ تھا، جب پڑھے لکھے لوگ کتابیں پڑھتے اور خریدتے تھے، لیکن آج صورت حال تھوڑی تبدیل ہوتی نظر آرہی ہے۔ ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جس میں کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق تقریباً معدوم سا ہو گیا ہے۔ کتابوں سے بے رغبتی اور مطالعے سے عدم دلچسپی عام ہوتی جارہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جن سے ہمیں تھوڑی سی امید بندھتی ہے کہ حالات تبدیل ہوں گے اور کتاب کلچر سے لوگوں کا رشتہ پھر سے جڑے گا، مگر پھر بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ موبائل اور انٹرنیٹ کے بڑھتے اثرات کی وجہ سے کتابوں کی مارکیٹ محدود ہوتی جارہی ہے اور شخصی کتب خانے ختم ہو رہے ہیں۔ کتنی پرانی لائبریریاں بند ہو چکی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ لائبریریوں میں بھی نئی کتابوں کی خریداری کا تصور ختم ہو رہا ہے۔ صورتِ حال کبھی کبھی اتنی بدتر ہو جاتی ہے کہ بعض لائبریریاں مفت کتابیں لینے سے بھی معذرت کر لیتی ہیں۔

دراصل اب لائبریریوں میں قارئین کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ جب کہ ایک دور تھا جب پبلک لائبریریوں میں بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی اور اب یہ حال ہے کہ کتابیں قارئین کے دیدار کو ترستی ہیں۔ لیکن اس دوران ایک تبدیلی یہ بھی آئی ہے کہ بہت سے علاقوں میں لائبریریوں کی تشکیل اور قیام کے تعلق سے لوگ مستعد ہیں اور انھیں اپنے ماضی کے ثقافتی اور ادبی ورثے کے تحفظ کا خیال بھی ستا رہا ہے۔ یہ ایک مثبت اشاریہ ہے۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سی پرانی لائبریریاں دم توڑ چکی ہیں، خاص طور پر جن لائبریریوں میں نوادرات کا خزانہ محفوظ ہے، ان لائبریریوں کی حالت نہایت خستہ ہے ان پر توجہ دینے والوں کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔

کتابوں اور لائبریریوں کی زندگی قارئین سے ہوتی ہے۔ پڑھنے والے ہوتے ہیں تو کتابوں اور لائبریریوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب پڑھنے والے ہی نہیں رہیں گے تو کتابوں یا لائبریریوں کی کیا ضرورت؟ پرنٹ کتابوں میں قارئین کی دلچسپی کی کمی کے باعث بعض حضرات نے کتابوں کو انٹرنیٹ پر جمع کرنا شروع کر دیا ہے، اس طرح گزشتہ چند سال کے عرصے میں کئی ایک ڈیجیٹل لائبریاں وجود میں آگئی ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کو کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ ان ویب سائٹوں پر جا کر کتاب تلاش کر لیتے ہیں۔ اس طرح عارضی طور پر ان کا کام چل جاتا ہے مگر کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ وہ بھی نہیں کر پاتے، کیونکہ اسکرین پر کتاب پڑھنا اپنے آپ میں ایک دشوار گزار عمل ہے۔ ڈیجیٹل لائبریریاں پرنٹ لائبریریوں کا پورے طور پر متبادل نہیں بن پارہی ہیں۔ ایسے ہی اسکرین پر موجود کتابیں بھی مطبوعہ کتابوں کی جگہ نہیں لے پارہی ہیں، اس لیے مطبوعہ کتابوں کا پڑھنا اور خریدنا بہت ضروری ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام مالیگاؤں کتاب میلے سے یہ اندازہ ہوا کہ اگر کوشش کی جائے تو کتاب کلچر کو زندہ کیا جاسکتا ہے اور کتابوں سے قارئین کا رشتہ جوڑا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میلے میں کتابوں کی اچھی خاصی فروخت ایک صحت مند علامت ہے۔ اگر اس تعلق سے تمام ادارے، تنظیمیں سنجیدہ ہو جائیں تو یقینی طور پر اس کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ قومی اردو کونسل اس سمت میں برسوں سے کوشاں ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض خاص طور پر دیہی علاقوں میں اس طرح کے کتاب میلوں کے انعقاد سے معاشرے کی ذہنیت اور ان کی ترجیحات کو بدلنے میں کامیابی مل سکتی ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

ماھنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نھیں ھوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ھوتا ھے۔ ماضی میں مکتوبات بھت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ھوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ھے که ماھنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رھا ھے۔ آپ کے خطوط ھمارے لیے بھت اھمیت کے حامل ھوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (ادارہ)

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' بابت جنوری 2022 موصول ہوا۔ اداریے میں اردو کی ترویج کو فروغ دینے کے لیے قارئین کی حصے داری پر موثر انداز میں گفتگو کی گئی ہے، تاکہ اردو زبان وادب کا حلقہ روز بہ روز وسیع تر ہوتا رہے۔

شمارے میں نوشاد حسین نے تحقیق میں اخلاقیاتی ملفوظات کے تحت مختلف نکات کو عرق ریزی کے ساتھ پیش کیا ہے، جسے کلیدی مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔ تیج بہادر سپرو کی آئینی اور تہذیبی بصیرت کا احاطہ کرنے میں عمیر منظر کامیاب نظر آتے ہیں۔ اردو صحافت کی خشت اول کچھ عجیب سا ہے۔عنوان اردو صحافت کا نقش اول: جام جہاں نما ہوتا تو مناسب تھا۔

جریدے کے باقی ماندہ مضامین اپنے تنوع کے باعث متوجہ کرتے ہیں۔

رفعت عزمی: بی 314، سول لائنس، بارہ بنکی۔ 225001 (اتر پردیش)

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا جنوری 2022 کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے کے تمام مضامین اچھے لگے۔ آپ اردو کو فروغ دے رہے ہیں جو کہ بہت اچھی بات ہے۔ قارئین اور عوام کا بہت بڑا طبقہ اردو زبان وادب سیکھ رہا ہے۔لوگ اردو کی طرف راغب اور متوجہ ہو رہے ہیں۔

سیف الاسلام خان: جمال پور، ضلع دربھنگہ (بہار)

✍ 'اُردو دنیا' (دسمبر 2021) موصول ہوا۔اس میں آپ نے میرا مضمون 'دلی کا ایک گمنام شاعر— منوہر لال ہادی' شائع کیا ہے۔اس کے لیے میں سراپا سپاس ہوں۔امید ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر دلی کے پروفیسر اور ریسرچ اسکالر حضرات ضرور چونکیں گے اور ہادی کے گم شدہ سرمایۂ شعری کو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔'اردو دنیا' کا ایک اپنا معیار و وقار ہے جسے برقرار رکھنے میں مدیر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور مشیر حقانی القاسمی کامیاب ہیں۔اس دفعہ 'ہماری بات' کے باب میں کورونا کی تباہ کاریوں نے اردو کے کئی نامور ادیبوں کو کس طرح ہم سے چھین لیا ہے، اس بابت عقیل صاحب نے بڑے رقت آمیز لہجے میں روشنی ڈالی ہے۔تقریباً تمام مضامین معلومات افزا ہیں اور مزید تحقیق و تفتیش کی دعوت دیتے ہیں۔ل۔احمد اکبرآبادی پر ارشاد احمد خاں کا مضمون پڑھ کر بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ 1974 میں مجھے اپنی اہلیہ اور بچی کے ساتھ ان کے یہاں آگرہ میں دو دن کے لیے مہمان ٹھہرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ان کا پورا نام لطیف الدین احمد تھا جس کا ذکر ارشاد صاحب نے نہیں کیا ہے۔ان کا پورا خاندان مہمان نواز، خلیق اور شفیق تھا۔حالانکہ ل احمد بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں رومانوی اور ادب لطیف کی تحریک سے وابستہ تھے، لیکن وہ ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریک سے بھی واقف تھے۔میں نے جب ان کو اپنا شعری مجموعہ 'شعاعوں کی صلیب' بھیجا تو بہت متاثر ہوئے اور اس ناچیز کو 'جدیدیت کا مجدد اول' جیسے لقب سے نوازا۔انھوں نے بھی اپنی ساری کتابیں میرے پاس بھجوائیں۔ بعد میں انھوں نے اپنی ایک نادر کتاب 'چو یو آن' بھجوائی جو چھپ تو گئی تھی، لیکن چند ٹیکنیکل دشواریوں کی بنا پر منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ یہ دراصل چینی زبان کے پہلے ڈرامے کا اردو ترجمہ تھا۔اس کا ایک نسخہ میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ل احمد، جوش اور نیاز فتح پوری نے مل کر آگرہ سے 'نگار' نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔بعد میں 'نگار' اردو ادب کا ایک رجحان ساز رسالہ ثابت ہوا۔حالانکہ اپنی نثری تخلیقات کی وجہ سے ل احمد کو ایک زمانے میں 'اردو نثر کا معمار' قرار دیا جاتا تھا، لیکن انھیں نئی نسل بالکل بھلا چکی ہے۔ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ کولکاتا میں گزرا اور ان کی عمر کے آخری پڑاؤ میں 'مغربی بنگال اردو اکادمی' نے ان کی متعدد کتابیں شائع کیں۔ملاقات پر انھوں نے

مجھے ایک مزے دار بات بتائی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ''بچپن سے ہم 'تاج محل' کو 'تاج بی بی کا روضہ' کہتے آئے تھے۔ معلوم نہیں کیسے اس کا نام 'محل' پڑ گیا۔'' موصوف مجھے پابندی سے خط لکھتے۔ اچانک یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ ان کی نواسی شگفتہ نازلی سے خط کے ذریعے معلوم ہوا کہ گر جانے کی وجہ سے انھیں چوٹ آئی اور ان کا ایک پیر چھوٹا ہوگیا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد شگفتہ نازلی نے اس بابت تفصیل سے بتایا۔ بعد میں شگفتہ کی شادی کولکاتا میں ہوگئی اور شگفتہ کا خط آنا بند ہوگیا۔ اس طرح موصوف کے خاندان سے میرا رشتہ منقطع ہوگیا۔ کولکاتا سے ل احمد کی وابستگی کا سبب یہ ہے کہ ان کا وہاں کاروبار تھا۔ میں ڈاکٹر ارشاد احمد خاں کی اس تجویز سے متفق ہوں کہ ''نئے ادبی تناظر میں ل۔ احمد کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا اعادہ کیا جائے''

اٹل بہاری واجپئی اچھے شاعر تھے، لیکن سیاست میں وہ اس بلندی تک پہنچ گئے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت دب کر رہ گئی۔ ہندی کے دانشوروں سے گذارش ہے کہ ادب میں واجپئی جی کو ان کا جائز مقام عطا کریں۔ موصوف پر جگ موہن سنگھ اور سرپو استورند کے مضامین پسند آئے۔ نیاز سلطان پوری کا مضمون 'اردو میں بین العلومی تنقید' نہایت تشنہ ہے۔ انھوں نے جن نقادوں کے نام گنوا دیے ہیں، ان میں سے کس کا تعلق کس علم وفن سے ہے، بتا دیتے تو بہتر ہوتا۔ انھوں نے جو نام درج کیے ہیں، ان میں دو اہم نام چھوڑ دیے ہیں۔ عالم خوندمیری اور وحید اختر، جن کی تنقید کا تعلق 'علم فلسفہ' سے تھا۔ محمد اسداللہ صاحب نے وور بھ کی جن خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے زہرہ جبین اور زرینہ ثانی سے میری ملاقات ہے۔ دونوں ناگپور کی ایک ہی بلڈنگ کے دو الگ الگ حصوں میں رہتی تھیں۔ دہلی جاتے ہوئے ناگپور میں ایک شب کے لیے میں ڈاکٹر زرینہ ثانی کا مہمان تھا۔ زہرہ جس نے زرینہ ثانی کو پڑھایا بھی تھا اور دونوں ایک ہی ویمنز کالج میں شعبۂ اردو سے وابستہ بھی تھیں۔ ان دونوں کے مضامین نظم ونثر ہمارے رسالہ 'شاخسار' میں شائع ہوتے تھے۔ میرے شعری مجموعے 'شعاعوں کی صلیب' پر زرینہ ثانی نے ایک بھرپور مضمون 'سب رس' حیدرآباد میں چھپوایا تھا۔ زہرہ جبین نے

میری نظم 'بتاؤ، کیا لکھوں، کیسے لکھوں، کس کے لیے لکھوں' کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ محمد اسداللہ نے اپنے مضمون میں 'نیلوفر ناہید' کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں لکھا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، نیلوفر ناہید کی زندگی کا بیشتر حصہ کولکاتا میں گزرا (ممکن ہے ان کے خاندان کا تعلق وور بھ سے ہو)۔ ان کی ایک خلیری بہن بھی تھیں، جن کا نام تھا ثریا محمود ندرت 1960 کے آس پاس ان دونوں بہنوں کی تخلیقات اردو رسائل میں خوب چھپتی تھیں۔ ہم لوگوں نے ان دونوں کی تخلیقات 'شاخسار' میں بھی چھاپی ہیں۔ شاعری میں نیلوفر ناہید آرزو سہارنپوری کے اور ثریا محمود ندرت سید حرمت الاکرام کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھیں۔ نیلوفر ناہید کا ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ بھدرک (اڑیسہ) میں نیلوفر ناہید کی شادی ہوئی تھی۔ کینسر کی وجہ سے وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ اگر نیلوفر ناہید کو وور بھ سے متعلق سمجھا جائے تو ثریا محمود ندرت کو بھی وہیں کی ادیبہ کہنا پڑے گا۔ ندرت کولکاتا سے ڈھاکہ چلی گئی تھیں جہاں انھوں نے کئی افسانوں کے علاوہ دو ناول بھی لکھے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ پھر کولکاتا چلی آئیں۔ اس کے بعد ان کا اتا پتا کسی کو نہیں معلوم۔

کرامت علی کرامت: رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک۔ 753001 (اوڈیشا)

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر................................ بتاریخ................................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.: magazines@ncpul.in

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➤ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➤

نایاب حسن

رپورٹ

آؤ کرتے ہیں بپا جشنِ زباں، اردو سے

مالیگاؤں میں تاریخ ساز قومی اردو کتاب میلہ

ضلع ناسک (مہاراشٹر) کے دوسرے سب سے بڑے شہر میں منعقد ہونے والا قومی اردو کونسل کا یہ چوبیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ تھا، جس نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ مسلسل نو دنوں تک (18 تا 26 دسمبر 2021) چلنے والے اس میلے میں 164 پبلشرز، تاجران کتب کے اسٹالز لگائے گئے تھے اور سیکڑوں موضوعات پر عمدہ سے عمدہ اردو کتابیں دستیاب تھیں۔ مہاراشٹر کے درجنوں شہروں کے علاوہ گجرات، تلنگانہ، کرناٹک، مدھیہ پردیش، راجستھان اور دوسری ریاستوں سے لاکھوں شائقین علم و ادب نے اس میلے میں شرکت کی اور مجموعی طور پر سوا کروڑ سے بھی زائد کی کتابیں خریدی گئیں۔ اس کتاب میلے میں مردوں کے بالمقابل خواتین کی نمایندگی و شرکت حیرت انگیز حد تک زیادہ تھی، جس سے ان کی غیر معمولی علمی و ادبی بیداری کا بہ خوبی پتا چلتا ہے۔ اس نو روزہ جشن اردو میں کئی اہم علمی و ادبی موضوعات پر قیمتی مذاکرے، طلبہ و طالبات کے مابین رنگارنگ ثقافتی و علمی اور مسابقتی پروگرام بھی منعقد کیے گئے۔ کورونائی بحران کے باوجود اردو کتاب میلے کی اس بے مثال کامیابی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مہاراشٹر اور خصوصاً مالیگاؤں اردو زبان و ادب اور اردو کتابوں سے بے لوث محبت کرنے والوں کا قابل فخر مرکز ہے، جو اکیسویں صدی میں فروغ اردو کی ایک نئی، امید افزا و حوصلہ بخش تاریخ رقم کر رہا ہے۔

کتابیں قوموں کی تعمیر اور اذہان و افکار کی تربیت کا سب سے کارگر ذریعہ ہیں، کتابیں انسانی ثقافت کی تاریخ میں اپنی غیر معمولی قوت و تاثیر اور بے پناہ کشش کی وجہ سے سب سے قیمتی سرمایہ سمجھی جاتی ہیں، کتابوں نے کتنے ہی افراد کی تقدیریں پلٹی ہیں اور بہت سی قوموں نے ان کی راہنمائی میں وقار و اعتبار کی نو بہ نو منزلیں سر کی ہیں۔ کتاب کی اہمیت اول دن سے آج تک قائم ہے اور جب تک اس روئے زمین پر شعور و فکر کی روانی اور عقل و خرد کی ضوفشانی ہے، تب تک کتابوں کی اہمیت بھی برقرار رہے گی۔ والٹیر کا بڑا معنی خیز مقولہ ہے کہ "آپ کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ جب سے دنیا بنی ہے، وحشی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتابوں نے حکمرانی کی ہے"۔ عربی زبان کا عبقری ادیب و ناقد و نثر نگار ابوعثمان الجاحظ کتاب کی مدح خوانی یوں کرتا ہے: "کتاب ایک بہترین خزانہ اور قیمتی سرمایہ ہے، کتاب خوانی بہترین مصروفیت ہے اور ایک عمدہ پیشہ، کتاب ایک اچھا دوست اور قابل اعتماد ساتھی ہے، تنہائی کا بہترین ہم نشین ہے، کتاب ایک ایسا ظرف ہے جس میں معلومات بھری ہوتی ہیں، ایک ایسا برتن ہے جو بلاغت و فصاحت سے مزین ہوتا ہے، جو مزاح و حقیقت دونوں سے مملو ہوتا ہے۔ اگر تم چاہو تو وہ سحبان بن وائل سے زیادہ فصیح و بلیغ بن جائے گی اور اگر چاہو تو باقل سے زیادہ بے زبان ہو جائے گی۔ اگر چاہو تو اس کے نوادر پر ہنسو اور اگر چاہو تو اس کے عجائب و فرائد پر اظہار تعجب کرو، اگر چاہو تو اس کے لطائف سے لذت و تفریح حاصل کرو اور اگر چاہو، تو اس میں موجود مواعظ پڑھ کر تم پر رقت طاری ہو جائے۔ کتاب ایسا دوست ہے، جو آپ کی بے جا تعریف نہیں کرتا، نہ آپ کو ناپسند

کرتا ہے، ایسا رفیق ہے، جو آپ کو بور نہیں کرتا، ایسا پڑوسی ہے، جو آپ سے غافل نہیں ہوتا، چاپلوسی کر کے آپ کی جیب ہلکی نہیں کرتا، آپ کو دھوکہ نہیں دیتا، نہ آپ سے منافقانہ برتاؤ کرتا ہے۔ (المحاسن والأضداد)

آج کا دور جس میں چہار جانب جدید ٹکنالوجی کی دھوم ہے اور دیکھنے سننے کے حیرت انگیز آلات کی ایجادات نے پڑھنے لکھنے کے فارمز بھی تبدیل کر دیے ہیں اور مسلسل ان میں تغیرات کا عمل جاری وساری ہے، ایسے میں بعض حلقوں کی طرف سے محسوس شکل میں کتابوں کے وجود اور قرأت کے کلچر کے تئیں وقتاً فوقتاً اندیشوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور علمی دنیا میں باقاعدہ اس موضوع پر تقابلی ریسرچ شروع ہوگئی ہے کہ برقی عہد میں ورقی یا مطبوعہ کتابوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ ایک بڑا طبقہ یہ ماننے لگا ہے کہ ٹکنالوجی سے مربوط نئی نسل تیزی سے ڈیجیٹل کتابوں کی طرف جا رہی ہے اور چھپی ہوئی کتابوں کا مستقبل اب محفوظ نہیں، اس کے لیے بہت سی دلیلیں بھی دی جاتی ہیں، مگر ایک طبقہ اب بھی ایسا ہے جو مطبوعہ ادب اور چھپی ہوئی کتابوں کی تہذیب کا قائل ہے اور اس کے پاس بھی اپنی معقول دلیلیں ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ چھپی ہوئی تحریر جو محسوس شکل میں ہمارے پاس آتی ہے، اسے پڑھنے اور موبائل، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ، کنڈل وغیرہ پر پڑی ہوئی تحریر یا کتاب کے پڑھنے میں بہت فرق ہے۔ پڑھنے کا حقیقی لطف تبھی آتا ہے، جب کتاب ہاتھ میں ہو، اس کے صفحات پر سے نگاہیں اور انگلیاں براہِ راست گزر رہی ہوں اور کبھی ہاتھوں کے رحل پر رکھ کر، کبھی گود میں، کبھی سینے پر اور کبھی مطالعے کی میز پر رکھ کر اسے پڑھا جائے، ایسی ہی کتابوں سے بہت سی یادیں بھی وابستہ ہوتی ہیں، خوب صورت، لذت آمیز اور حسین یادیں!

اسی کتاب کلچر کے فروغ و ترویج کے لیے حکومتِ ہند کے زیر سرپرستی سرگرم مختلف ثقافتی واشاعتی اداروں کی جانب سے اور بہت سی رضا کار تعلیمی وثقافتی تنظیموں کے زیر اہتمام کتاب میلوں کے انعقاد کی روایت قائم ہے؛ چنانچہ سال کے مختلف حصوں میں کسی نہ کسی شہر میں قومی یا مقامی سطح کے کتاب میلے کروائے جاتے ہیں، عموماً ان میلوں میں ہر زبان کی کتابوں کے ناشرین اور تاجرانِ کتب شرکت کرتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جو وزارتِ تعلیم، حکومت ہند کے زیرِ سرپرستی سرگرمِ عمل ہندوستان ہی نہیں، عالمی سطح پر اردو زبان وادب کے فروغ کا سب سے وقیع، باوقار اور قابلِ فخر ادارہ ہے، وہ جہاں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کی دیگر دسیوں ملک گیر اسکیمیں چلاتا ہے، وہیں اس کا ایک اہم منصوبہ معاشرے میں اردو کتاب خوانی و مطالعے کے رجحان کی ترویج واشاعت بھی ہے۔ کونسل کا یہ عزم ہے کہ معاشرہ اپنی تمام ترقیات اور فتح مندیوں کے ساتھ کتاب کلچر سے بھی جڑا رہے، کہ اس کی تمام تر حصولیابیوں کا اصل سرچشمہ تو یہ کتابیں ہی ہیں اور اسی مقصد سے ہر سال دوسال کے دورانیے میں کونسل کے زیر اہتمام ملک کے کسی نہ کسی شہر میں قومی یا علاقائی سطح کا کتاب میلہ ضرور منعقد کیا جاتا ہے، جس سے کتاب دوست حلقہ خاطر خواہ مستفید ہوتا اور اس کے شوقِ کتب بینی کو نئی تازگی و توانائی ملتی ہے۔ اس دوران رنگا رنگ ثقافتی پروگراموں، علمی و ادبی سمیناروں اور مذاکرات کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اب تک کونسل نے ملک کے طول و عرض میں 23 اردو کتاب میلے منعقد کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کتاب میلوں نے

کونسل کا یہ عزم ہے کہ معاشرہ اپنی تمام ترقیات اور فتح مندیوں کے ساتھ کتاب کلچر سے بھی جڑا رہے، کہ اس کی تمام تر حصولیابیوں کا اصل سرچشمہ تو یہ کتابیں ہی ہیں اور اسی مقصد سے ہر سال دوسال کے دورانیے میں کونسل کے زیر اہتمام ملک کے کسی نہ کسی شہر میں قومی یا علاقائی سطح کا کتاب میلہ ضرور منعقد کیا جاتا ہے، جس سے کتاب دوست حلقہ خاطر خواہ مستفید ہوتا اور اس کے شوقِ کتب بینی کو نئی تازگی و توانائی ملتی ہے۔

خصوصاً اردو معاشرے میں کتاب بینی اور کتابیں خریدنے کے عمومی ماحول کی نشوونما میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

2014 میں کونسل نے اپنا مقامی کتاب میلہ مہاراشٹر کے ضلع ناسک میں ممبئی - آگرہ شاہراہ پر واقع شہر مالیگاؤں میں کیا تھا، جس میں پچاس سے زائد پبلشرز اور کتب فروشوں نے شرکت کی تھی، اپنے دائرۂ عمل کے اعتبار سے وہ کامیاب ترین کتاب میلہ ثابت ہوا تھا۔

دراصل مالیگاؤں ہندوستان میں اردو کے ایک خوب صورت جزیرے جیسا ہے، کم و بیش پانچ لاکھ نفوس کی آبادی اور تین لاکھ پاورلوم والا یہ شہر، جو روزانہ اس ملک کو ایک کروڑ میٹر نئے کپڑے تیار کرکے دیتا ہے، اس کا تعلیمی، ادبی و فکری شعور بھی نہایت بلند اور قابلِ ستائش ہے۔ یہاں سیکڑوں اردو میڈیم اسکول ہیں اور اردو کے قارئین ہر عمر اور ہر طبقے میں وافر تعداد میں موجود ہیں۔ مالیگاؤں ادب و زبان سے بے لوث اور بے تحاشا محبت کرنے والوں کا شہر ہے، شمالی ہندوستان اور دکن و مہاراشٹر کے مختلف خطوں سے ہجرت کا پس منظر ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کے اظہار کی زبان میں مہاراشٹرین اور مشرقی یوپی کے لہجوں کا اختلاط محسوس ہوتا ہے، مگر ان کی پڑھنے لکھنے کی زبان خالص اردو ہے۔ ذریعۂ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے نئی نسل کے مزاج و نہاد میں اردو بستی ہے اور چوک چوراہوں، دکانوں، ہوٹلوں اور دیگر اہم وغیرہ اہم مقامات پر لگے بورڈ پر بھی تمام تر نام، علامات و نشانات اردو میں لکھے نظر آتے ہیں۔ سینما ہال کے باہر اردو زبان میں فلمی اشتہارات، نئی پرانی فلموں کے شوز کی تفصیلات سے لے کر آٹو رکشا کی پشت پر اردو رسم الخط میں لکھے دلچسپ اشعار بھی جا بہ جا نظر آجاتے ہیں، گویا یہاں کے شہری اردو میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تعلیم کا گراف بھی اس شہر میں بہت اعلیٰ ہے، مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین میں بھی حصولِ علم و ادب کا غیر معمولی جذبہ پایا جاتا ہے اور وہ بھی بڑھ چڑھ کر ہر علمی، ادبی و فکری شعبے میں اپنی نمایندگی درج کروا رہی ہیں، نوے فیصد اگر یہاں کے مردوں کا لٹریسی ریٹ ہے، تو خواتین کی شرحِ خواندگی بھی چوراسی فیصد ہے، جو یقیناً لائقِ تحسین ہے اور ملک کے بہت سے شہروں اور خطوں کے لیے لائقِ تقلید بھی ہے۔ اس چھوٹے سے شہر سے درجنوں اردو اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں، جن میں روزناموں کے علاوہ شام نامے اور ہفت روزہ اخبارات بھی شامل ہیں۔ دسیوں ادبی انجمنیں ہیں جو مختلف شعری و نثری اصناف کے فروغ میں اپنا بے لوث کردار ادا کر رہی ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ پاورلوم کی شبانہ روز کی کھٹ پٹ کے بیچ رہنے والے یہاں کے لوگوں کا ادبی ذوق نہایت لطیف، شستہ و شگفتہ ہے اور اس شہر نے اردو کو کئی نامور شاعر و نثر نگار دیے ہیں۔ علم و نظر کے دوسرے شعبوں میں بھی اس شہر نے اپنی مستحسن موجودگی درج کروائی ہے اور یہاں کے کئی قابلِ فخر فرزندوں نے سائنس، طب، جدید ٹکنالوجی وغیرہ میں بھی ملکی و عالمی سطح پر اپنے امتیاز کا نقش قائم کیا ہے۔

مالیگاؤں کے انھی امتیازات کی وجہ سے قومی اردو کونسل نے جب اپنا چوبیسواں قومی اردو کتاب میلہ منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا، تو دوبارہ اس کی نظرِ انتخاب مالیگاؤں پر پڑی اور یہ انتخاب ہر اعتبار سے 'حسنِ انتخاب' ثابت ہوا۔

اکتوبر 2021 میں کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اور میلہ انچارج جناب اجمل سعید نے مالیگاؤں کا دورہ کیا، مقامی میلہ کمیٹی کے ذمے داران کے ساتھ مل کر وہاں کی ضلع انتظامیہ کو میلے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور میلے کے لیے اجازت حاصل کی، اس کے بعد پبلشر حضرات سے بک سٹال لگانے کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں؛ چنانچہ پورے ملک سے ریکارڈ 300 درخواستیں موصول ہوئیں، مگر میلہ گراؤنڈ کی جگہ کو دیکھتے ہوئے اور دیگر تکنیکی وجوہات کی بناپر 164 اسٹالوں کی ہی منظوری دی جاسکی، پہلے میلے کے انعقاد کی تاریخیں 3 تا 11 دسمبر 2021 رکھی گئی تھیں، مگر نومبر میں مقامی سطح پر حالات کچھ ناگفتہ بہ ہونے کی وجہ سے تاریخوں میں ترمیم کی گئی اور میلے کی نئی تاریخیں 18 تا 26 دسمبر رکھی گئیں، دوسری تاریخیں بھی جوں جوں قریب آرہی تھیں، کورونا کے نئے ویریئنٹ اومی کرون کے کیسز بہ تدریج بڑھنے کی وجہ سے حالات بگڑ رہے تھے اور ان تاریخوں میں بھی میلے کا انعقاد مشکل لگ رہا تھا، لیکن کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اہلِ مالیگاؤں کی اردو نوازی و کتاب دوستی کے پرجوش جذبے کو دیکھتے ہوئے میلے کے انعقاد میں غیر معمولی دلچسپی لی، وزیرِ تعلیم جناب دھرمیندر پردھان اور مالیگاؤں ضلع انتظامیہ و متعلقہ افسران سے براہِ راست رابطے میں رہے، ان سے میلے کی اجازت لینے کی کوششیں جاری رکھیں، میلہ انچارج اجمل سعید اور مقامی ذمے دار امتیاز خلیل وغیرہ نے اس سلسلے میں شب و روز ایک کردیا؛ چنانچہ کورونا پروٹوکول کی مکمل پابندی اور مجوزہ ثقافتی پروگراموں کو مختصر کرنے کی شرطوں کے ساتھ میلے کی اجازت مل گئی۔ البتہ میلہ شروع ہونے سے قبل جتنے سنگین اور غیر یقینی حالات کا سامنا تھا، شروع ہونے کے بعد اتنی

ہی زیادہ کامرانی و سرخروئی بھی حاصل ہوئی۔ اس میلے کے انعقاد میں کونسل کے ساتھ شروع سے آخر تک سرگرم معاون کا کردار جن اداروں نے نبھایا، ان میں مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن، جے اے ٹی کالج فار ویمن مالیگاؤں، سٹی کالج مالیگاؤں، انجمن ترقی تعلیم اور انجمن محبانِ اردو کتب شامل تھے، جبکہ نیو سٹی کالج وا ے ٹی ٹی ہائی اسکول مالیگاؤں نے مشترکہ طور پر اس میلے کے لیے اپنا کیمپس فراہم کیا۔

16 دسمبر کو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد پہنچے اور 17 دسمبر کو انھوں نے ہوٹل رادھیکا میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے میڈیا کے نمائندگان کا شکریہ ادا کیا اور دورانِ خطاب کہا کہ کونسل کی طرف سے منعقد ہونے والا یہ چوبیسواں کتاب میلہ ہے اور 2014 میں مقامی کتاب میلے کے انعقاد کے صرف سات سال بعد یہاں دوسرا قومی اردو کتاب میلہ اس لیے کیا جارہا ہے کہ مالیگاؤں ایسی جگہ ہے، جہاں کے لوگ اردو زبان سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ شہریانِ مالیگاؤں کی اردو سے بے پناہ محبت کا کرشمہ ہی ہے کہ اس میلے میں اسٹال بک کرنے کے لیے 300 پبلشرز اور کتب فروشوں نے اپلائی کیا تھا، مگر جگہ کی قلت کی وجہ سے ہم صرف 164 درخواستیں منظور کرسکے۔ انھوں نے میلے کے سلسلے میں تفصیلی معلومات دیتے ہوئے کہا کہ میلہ 18 دسمبر کو صبح دس بجے سے شروع ہوگا، وزیرِ مملکت برائے تعلیم آر آر سنگھ آن لائن افتتاح کریں گے۔ ان کے علاوہ افتتاحی پروگرام میں مختلف سیاسی و سماجی شخصیات شریک ہوں گی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل نے بتایا کہ ہم نے اس میلے میں بہت سے تعلیمی و ثقافتی پروگراموں کا بھی خاکہ بنایا تھا، مگر افسوس ہے کہ کورونا کی نئی قسم اومی کرون کے خطرات کی وجہ سے ہمیں کئی ایسے پروگرام ملتوی کرنا پڑے۔ انھوں نے کہا کہ اس میلے میں ہم کورونا پروٹوکول کو پوری طرح فالو کریں گے، میلے میں داخلے کے لیے

اردو کتابوں کی فروخت کا قومی ریکارڈ

قومی اردو کونسل کے کتاب میلوں کا حساب کتاب

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10 لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، دہلی	12 لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16 لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22 لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23 لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھراپردیش	24 لاکھ روپے
7	دسمبر	2005	لکھنؤ، اترپردیش	23 لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16 لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14 لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26 لاکھ روپے
11	فروری - مارچ	2010	حیدرآباد، آندھراپردیش	52 لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15 لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4 لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ، اترپردیش	25 لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31 لاکھ روپے
16	دسمبر - جنوری	2013-14	مالیگاؤں	87 لاکھ روپے
17	دسمبر - جنوری	2014-15	عام خاص میدان، اورنگ آباد	1,29,40,722 روپے
18	نومبر	2015	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	ایک کروڑ سے زائد
19	دسمبر	2015	قلی قطب شاہ اسٹیڈیم، حیدرآباد	50 لاکھ روپے
20	دسمبر	2016	رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، مہاراشٹر	ایک کروڑ 12 لاکھ روپے
21	دسمبر	2017	ایم اے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول	تقریباً 62 لاکھ روپے
22	اپریل	2018	روئی دھاسہ میدان، کشن گنج، بہار	تقریباً 20 لاکھ روپے
23	جون	2019	علامہ اقبال لائبریری گراؤنڈ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، جموں کشمیر	تقریباً 50 لاکھ روپے
24	دسمبر	2021	نیو سٹی کالج وا ے ٹی ٹی ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر	تقریباً سوا کروڑ سے زائد روپے

ماسک ضروری ہوگا، بغیر ماسک میلے میں داخلے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ممکنہ ایمرجنسی طبی ضرورت کے پیش نظر ہم نے ایک ڈاکٹر کی خدمات بھی حاصل کی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مالیگاؤں کے محبانِ اردو وبائی صورت حال کی رعایت کرتے ہوئے میلے سے استفادہ کریں گے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ اس میلے میں بچوں کا ہم نے خاص خیال رکھا ہے اور میلے کا تھیم ہی اردو کتاب اور نئی نسل ہے۔ بچوں کی کتابوں سے دوری کی وجہ سے ہم نے سوچا کہ انھیں کتاب کی طرف متوجہ کیا جائے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ بچے بڑے بوڑھے سب کتاب کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ

کتاب سے اچھا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ اپنی تخلیقی، علمی و ذہنی صلاحیت میں اضافے کے لیے بھی ہمیں کتاب پڑھنی چاہیے۔ اچھا ادیب، عالم اور تخلیق کار وہی ہو سکتا ہے، جسے کتابوں سے بہت زیادہ محبت ہو۔ لوگوں میں کتابوں سے محبت پیدا کرنے اور لائبریریوں کے احیا کے لیے ہی کونسل کتاب میلے کا انعقاد کرتی ہے، جس کی یہ چوبیسویں کڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ میلہ فروغ اردو اور کتابوں سے تعلق پیدا کرنے کے حوالے سے ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوگا۔

پہلا دن: 18 **دسمبر** 2021

صبح گیارہ بجے نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ میلے کا افتتاح مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم آر آر سنگھ (ورچوئلی) اور دیگر اہم ادبی و سماجی شخصیات کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس افتتاحی تقریب کی صدارت معروف صحافی، ادیب و نغمہ نگار جناب حسن کمال کر رہے تھے۔ وزیر موصوف نے اپنے پیغام میں تحریک آزادی اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اردو زبان کے غیر معمولی کردار پر خصوصی روشنی ڈالی اور انھوں نے مالیگاؤں کے محبانِ اردو کو مبارکباد پیش کی کہ ان کے غیر معمولی جوش و جذبے کو دیکھتے ہوئے مرکزی حکومت نے قومی اردو کونسل کے چوبیسویں میلے کو مالیگاؤں میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ میلہ نئی نسل کو کتابوں سے جوڑنے میں غیر معمولی کردار ادا کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ نئے بھارت کی تعمیر و تشکیل میں نئی نسل ہی اپنا کردار ادا کر سکتی ہے اور اس کے لیے کتابوں سے رشتہ مضبوط کرنا ضروری ہے، مجھے خوشی ہے کہ بھارت سرکار کے زیرِ سرپرستی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کام کرنے والا سب سے بڑا ادارہ قومی کونسل برائے اردو زبان نئی نسل کو کتابوں سے مربوط کرنے کی نئی نئی تدبیریں کرتا ہے، کتاب میلے کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ میں کونسل کو، اس کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد کو، معاون اداروں کو اور تمام شہریانِ مالیگاؤں کو نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے افتتاحیہ کلمات میں کہا کہ مالیگاؤں میں منعقد ہونے والا یہ میلہ یہاں کی تاریخ کا سب سے بڑا اردو کتاب میلہ ہے جو ملک بھر کے ناشران و تاجرانِ کتب کے اصرار اور یہاں کے لوگوں کے ادبی و علمی ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے سات سال بعد پھر منعقد کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مالیگاؤں ادب دوستوں اور اردو کے ایسے ادبا و شعرا کا مرکز ہے، جو پورے خلوص و محبت کے ساتھ بغیر کسی صلہ و ستائش کی پروا کے فروغ اردو میں مصروف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس میلے کے انعقاد کا مقصد یہ ہے کہ عوام میں اردو کے تئیں محبت مزید پختہ کی جائے اور نئی نسل، جو بہ تدریج کتابوں سے دور ہوتی جا رہی ہے، اسے کتابوں سے مربوط کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ موجودہ مرکزی حکومت خصوصاً وزیر اعظم جناب نریندر مودی اور وزیر تعلیم جناب دھرمیندر پردھان اردو کے فروغ کے تئیں نہایت سنجیدہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ پچھلے سات سال کے دوران کونسل کا بجٹ کئی گنا بڑھایا گیا ہے، جس کی وجہ سے ہمیں فروغ اردو کے لیے مختلف اسکیموں کو چلانے میں غیر معمولی تعاون ملا ہے اور اس وقت کونسل کی رسائی

”جب تک دنیا میں مالیگاؤں کے محبان اردو جیسے لوگ موجود ہیں اردو ختم نہیں ہوسکتی، مجھے یہاں کے لوگوں پر فخر ہے اور امید ہے کہ یہاں اردو زبان و ادب کے تئیں جوش و جذبہ روز بہ روز بڑھتا اور توانا ہوتا رہے گا“

کشمیر سے کنیا کماری تک پورے ہندوستان میں ہے، اس سے فائدہ اٹھانے والے ملک کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عقیل نے اہلیانِ مالیگاؤں کی اردو سے غیر مشروط وابستگی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب تک دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں اردو ختم نہیں ہو سکتی، مجھے باشندگانِ مالیگاؤں پر فخر ہے اور امید ہے کہ یہاں کے لوگوں کا اردو زبان و ادب کے تئیں جوش و جذبہ روز بہ روز بڑھتا اور توانا ہوتا رہے گا۔

اس تقریب کے مہمانِ خصوصی مالیگاؤں کے سینئر

ادیب و ناقد ڈاکٹر اشفاق انجم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کونسل نے مالیگاؤں میں کتاب میلے کے انعقاد کا فیصلہ کرکے بہت اچھا اور خوش آیند فیصلہ کیا ہے، میں اس کے لیے قومی اردو کونسل اور ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد کا تہہ دل سے مشکور وممنون ہوں۔ جناب حسن کمال نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ میں سب سے پہلے قومی کونسل کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ اس کے ذمے دار پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کتاب میلے کے انعقاد کے لیے ہندوستان کے مانچسٹر مالیگاؤں کا انتخاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ مالیگاؤں سے میرا قدیم رشتہ ہے اور اردو کے فروغ کے لیے جتنا کام یہاں ہوا ہے، اتنا کہیں نہیں ہوا۔ انھوں نے اردو زبان کے ساتھ اردو رسم الخط کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہوتی ہے، روح نہ ہو تو جسم بے معنی ہے، لہٰذا اردو کو اس کے اصل رسم الخط سمیت باقی رکھنا اور فروغ دینا ہماری ذمے داری ہے۔ انھوں نے کتاب میلے کی تھیم کو سراہتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو اردو زبان سے قریب کرنا ضروری ہے، ان کے منھ سے مادری زبان چھین کر دوسری زبان سکھانے کے بجائے ہمیں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو زبان بھی انھیں ہر حال میں سکھانی چاہیے۔ نئی نسل اردو سے وابستہ ہوگی تو خود بخود اردو کا مستقبل بھی محفوظ اور روشن ہوگا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل، میلے کے دیگر ذمے داران، مالیگاؤں کی تمام ادبی و تعلیمی انجمنوں اور ان شخصیات وافراد کو بھی مبارکباد پیش کی، جنھوں نے اس میلے کے انعقاد کو ممکن بنایا۔ اس تقریب میں کوہ نور اکیڈمی کے ذریعے تیار کردہ حب الوطنی پر مبنی ایک گیت سوکس ہائی اسکول کی طالبات نے پیش کیا اور اردو زبان پر ایک گیت مالیگاؤں گرلز اسکول کی طالبات نے پیش کیا۔ اس تقریب میں مختلف مقامی تنظیموں کی جانب سے پروفیسر شیخ عقیل احمد، جناب حسن کمال، ڈاکٹر اشفاق انجم، ڈاکٹر سلیم خان، جناب یٰسین درگاہی، جناب جمیل کرانتی، پروفیسر شکیب، جناب شبیر آصف، ڈاکٹر فہمیدہ، جناب سید زاہد علی، جناب مختار قاضی، جناب رفیق شیخ، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، جناب محمد احمد، جناب اجمل سعید اور دیگر مہمانانِ کرام کا شال وگلدستوں سے خصوصی استقبال کیا گیا۔ اس افتتاحی تقریب میں شائقینِ اردو زبان و ادب اور طلبہ و طالبات کی بڑی تعداد موجود رہی۔ لنچ کے بعد ایک ادبی نشست 'الاؤ' کے عنوان سے رکھی گئی جس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر شیخ عقیل احمد اور محترم حسن کمال تھے، اس میں مختلف ادبی وعلمی شخصیات نے شرکت کی۔

اردو کتاب میلہ 2021 کے افتتاحی پروگرام میں پیش کیا گیا گیت

تخلیق: ڈاکٹر شہروز خاور
کمپوزیشن: ڈاکٹر ابو اسامہ (ابن آدم)
پیش کش: طالبات مالیگاؤں گرلس ہائی اسکول

کوئی ہنگامہ سرِ بزم جہاں، اردو سے
آؤ کرتے ہیں بپا جشنِ زباں، اردو سے
ایسے اٹھا ہے بگُلِ ہند سے اردو کا خمیر
مل گئے گنگ وجمن، قوس وکلس، عطر وعبیر
ہوگئے شیر و شکر ہم سخنِ میر و کبیر
سج گئی بزم کراں تا بہ کراں، اردو سے
برہمن، پیرِ مغاں، شاہ و گدا، رند و فقیر
چشتی و نانک و میرا و قطب شاہ و نظیر
کون ہے صحنِ حرم میں جو نہیں اس کا اسیر
رونقِ دیرِ سخن حسنِ بتاں، اردو سے
پیش کرتی ہے غزل خامہ خسرو کو خراج
جن کے ہونے سے ہوئے ذوق وظفر، داغ وسراج
شہرِ غالب سے ہوا محفلِ اردو کو رواج
فیض و اقبال کا باقی ہے نشاں اردو سے
دن بناتے ہیں فسانے تو فسوں ساز ہے رات
گلیِ ماراں کا ہو منظر کہ خیابانِ نشاط
ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہیں شب و روزِ حیات
شہرِ یاراں پہ ہے دلّی کا گماں اردو سے
تتلیاں مست رہیں، غنچہ و گل شاد رہیں
بلبلیں گاتی رہیں، محفلیں آباد رہیں
باغِ اردو میں یوں ہی محو سخن زاد رہیں
سبز و شاداب رہے برگِ زباں اردو سے

***

دوسرا دن: 19 دسمبر 2021

میلے کے دوسرے دن جہاں سیکڑوں شائقین علم و ادب نے مختلف موضوعات پر مشتمل سیکڑوں کتابوں کی خریداری کی، وہیں دو مختلف نشستوں میں 'آن لائن تدریس اور اردو' اور 'انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو' کے موضوعات پر پینل ڈسکشن کی مجلسیں منعقد ہوئیں۔ ساتھ ہی دونوں مجلسوں میں دو کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔

'آن لائن تدریس اور اردو' کے عنوان سے منعقدہ مذاکرے کے شرکا نے کورونا اور لاک ڈاؤن کے دوران پیدا ہونے والی صورتِ حال میں آن لائن تدریس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے بالخصوص اردو تدریس کے حوالے سے درپیش مشکلات اور چیلنجز پر تبادلۂ خیال کیا۔ مقررین نے کہا کہ اردو زبان کی آن لائن تدریس کی سمت میں مختلف اداروں نے اہم پیش رفت کی ہے، مگر اس حوالے سے کچھ اہم پہلو ایسے ہیں، جن پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ادارہ جاتی سطح پر منظم کوشش کرنی ہوگی۔ مقررین نے اس بات پر اطمینان کا بھی اظہار کیا کہ اردو کے اساتذہ اور نئی نسل سے تعلق رکھنے والے ٹکنالوجی کے ماہرین اردو کی آن لائن تدریس کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس مذاکرے میں جناب راشد اختر فیض احمد کی کتاب 'فریکوئنٹلی یوزڈ انگلش سینٹینسز' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جناب امین ساغر نے کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف پیش کیا، جبکہ مذاکرے میں بال بھارتی کے رکن جناب ظفر عابد، جناب اشفاق لعل، جناب عارف انجم، جناب اعجاز صدیقی، جناب آصف فیضی، جناب مشتاق احمد مشتاق نے شرکت کی۔ مجلس کی صدارت مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کے صدر ٹیلین درگاہی نے کی۔

دوسرے مذاکرے کا عنوان 'انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو' تھا، اس موقعے پر ڈاکٹر خلیل الدین کیماندار کی تصنیف 'نقوشِ حرم' کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سعید فارانی اور مولانا عمرین محفوظ رحمانی نے کتاب اور صاحب کتاب پر گفتگو کی۔ مذاکرے میں پروفیسر رضوان امان اللہ خان، جناب رفیق مومن، جناب طاہر انجم صدیقی، جناب شکیل جمیل حسن، جناب فرید فارانی، پروفیسر عبدالقدیر، جناب وسیم احمد، جناب شمویل ویگا وغیرہ نے حصہ لیا۔ جناب امتیاز رفیق نے اس مذاکرے کی نظامت کی۔ مذاکرے کے شرکا نے اردو زبان کو ٹکنالوجی سے مربوط کرنے کے سلسلے میں نئے امکانات کی جستجو اور اس سلسلے میں درپیش مسائل سے کما حقہ نمٹنے کے طریقوں پر تبادلۂ خیالات کیا۔ انھوں نے ملک کی مختلف لائبریریوں میں موجود اہم اور نایاب اردو کتابوں کے ڈیجیٹلائزڈ کیے جانے اور اردو مواد کو انٹرنیٹ پر زیادہ سے زیادہ دستیاب کرانے کی وکالت کی۔ انھوں نے زور دیا کہ اردو زبان و مواد کو یونی کوڈ ورژن میں قابلِ رسائی بنانا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ اس مجلس کی صدارت معروف صحافی اور ممبئی اردو نیوز کے ایڈیٹر جناب شکیل رشید نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ جدید ٹکنالوجی نے اردو کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کی ہیں، مگر ساتھ ہی کئی سطحوں پر مشکلات بھی درپیش ہیں، جنھیں دور کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے

آئی ٹی ماہرین سے اپیل کی کہ وہ بطور خاص انٹرنیٹ پر اردو ترجمے اور تحریر میں پائی جانے والی زبان و بیان کی خامیوں کو دور کرنے کے طریقوں پر غور کریں اور جو تکنیکی مسائل ہیں، ان کے حل کی سمت میں ضروری اقدام کیا جائے۔

تیسرا دن: 20 دسمبر 2021

میلے کے تیسرے دن ہزاروں شائقینِ کتب کی آمد و شرکت کے علاوہ 'ذرائع ابلاغ کے بدلتے وسائل اور اردو صحافت' کے عنوان سے مذاکرے کا انعقاد ہوا۔ اس پروگرام کی صدارت مالیگاؤں کے بزرگ صحافی جناب عبداللطیف جعفری کر رہے تھے۔ اپنے خصوصی خطاب کے دوران سینئر صحافی اور ممبئی اردو نیوز کے ایڈیٹر جناب شکیل رشید نے کہا کہ بے پناہ ٹکنالوجیکل انقلاب کے موجودہ دور میں دیگر زبانوں کی صحافت کے ساتھ اردو صحافت بھی بہت سی ترقیات و تغیرات سے گزر رہی ہے، جو یقیناً اس کے لیے مفید بھی ہیں اور ان کی وجہ سے اردو صحافت کا ظاہری معیار اور شکل و صورت پہلے سے کافی بہتر ہوگئی ہے، مگر ایک اہم مسئلہ جس کا اردو ہی نہیں، ہر زبان کے مطبوعہ و الیکٹرانک میڈیا کو سامنا ہے، اس کا تعلق صحافت کے اصولوں سے ہے، ضرورت ہے کہ ہم ظاہری ترقیات کے ساتھ بنیادی صحافتی اصولوں کے بھی پابند رہیں۔ قبل ازاں مالیگاؤں شہر کے پہلے بلاگر شکیل حنیف نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے مطبوعہ صحافت کے ساتھ آن لائن صحافت کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور انھوں نے اس حوالے سے سوشل میڈیا اور بلاگ وغیرہ کے استعمال کو ضروری قرار دیا۔ ممبئی اردو نیوز سے وابستہ صحافی فرحان حنیف وارثی نے کہا کہ بدلتے حالات میں جہاں صحافت نے الیکٹرانک میڈیم کو اختیار کرتے ہوئے ترقی حاصل کی ہے، وہیں اس کے کچھ نقصانات بھی ہوئے ہیں، سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ مطبوعہ اخبارات کا سرکولیشن کم ہوگیا ہے، جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شام نامہ،

مالیگاؤں کے صحافی جناب خلیل عباس نے بھی موجودہ اردو صحافت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے اجتماعی غور وخوض کی دعوت دی۔ نیوز18 ناندیڑ کے ضمیر احمد خان نے اپنے تجربات شیئر کرتے ہوئے کہا کہ نئے دور کی تکنیکی و ابلاغی ترقیات سے اپنے کو ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ نیوز18 ممبئی کے محی الدین عبداللطیف نے کہا کہ عصری تقاضوں کو بروقت سمجھنا اور ان کے مطابق عمل کرنا ہماری صحافت کی بقا کے لیے ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بڑے بڑے نیشنل و انٹرنیشنل اخبارات اپنے پرنٹ ایڈیشنز کے ساتھ ساتھ ای ایڈیشنز بھی نکالتے ہیں اور اپنی ویب سائٹس، سوشل سائٹس بھی اپڈیٹ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مالی بحران سے نکلنے کے لیے اردو میڈیا کو کارپوریٹ سیکٹر سے بھی جوڑنے کی وکالت کی۔ مالیگاؤں کے سرگرم صحافی منصور اکبر نے کہا کہ الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت اپنی جگہ، مگر پرنٹ میڈیا کی معنویت اب بھی برقرار ہے، البتہ نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ ترجمانِ اردو کے مدیر جناب یوسف ترجمان نے بھی صحافت کی بدلتی شکلوں پر روشنی ڈالی، ساتھ ہی انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ صحافی کو پروفیشنل اقدار کے ساتھ صحافت کرنی چاہیے، خبروں میں سسپنس پیدا کرنا اور معلومات کی صحت پر توجہ نہ دینا آج کے ابلاغی انقلاب کے دور کا بڑا المیہ ہے، جسے دور کرنا چاہیے۔

پروگرام کی نظامت کا فریضہ روزنامہ انقلاب کے نمائندے جناب مختار عدیل نے بحسن وخوبی انجام دیا اور میلے کے تیسرے دن جناب شکیل انصاری کی تالیف کردہ کتاب 'تذکرہ اولیائے خاندیس' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

چوتھا دن: 21 دسمبر 2021

متواتر چوتھے دن بھی شائقین کتب میں غیر معمولی ذوق وشوق دیکھنے کو ملا اور شہر و بیرون شہر کے علم و ادب دوست بڑی تعداد میں کتابوں کی خریداری کرتے نظر آئے۔ اس دن بھی دو پروگراموں کا انعقاد ہوا، جن میں سے ایک پروگرام اسکولی طلبہ و طالبات کا تھا، جس میں انھوں نے حب الوطنی کا گیت پیش کیا، جبکہ دوسرا پروگرام سول سروسز ایگزام کی رہنمائی کے حوالے سے قومی اردو کونسل اور مراٹھا اسکول کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ اس کی صدارت اسکول کے وائس پرنسپل ڈاکٹر عارف انجم نے کی اور اس موقعے سے یوپی ایس سی، سول سروسز ایگزام کی تیاری کے سلسلے میں متعدد ماہرین تعلیم نے اظہار خیال کیا۔ افتتاحی کلمات جناب امتیاز خلیل نے پیش کیے اور رضوان ربانی نے مقررین کا تعارف کروایا۔

پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے سول سروسز امتحانات کی تیاری کے موضوع پر متعدد کتابوں کے مصنف جناب اشفاق عمر نے بتایا کہ آرٹس، سائنس، کامرس کسی بھی سبجیکٹ سے تعلق رکھنے والے طلبہ و طالبات توجہ اور ارتکاز کے ساتھ محنت کرکے کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی مقابلہ جاتی امتحان میں سب سے اہم سوال کو سمجھنا ہوتا ہے اور اس کے لیے کئی زبانوں مثلاً مادری زبان، انگریزی، ہندی اور اپنی ریاستی زبان میں مہارت، نصابی کتابوں کے علاوہ موجودہ قومی و عالمی حالات سے بھرپور آگاہی اور پچھلے امتحانات کے پرچوں کو دیکھنا ضروری ہے۔ جے اے ٹی سینئر کالج کے لیکچرار عطاء الرحمن نوری نے سول سروس ایگزام کے تمام مراحل پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے اہم تکنیکی گوشوں سے آگاہی بخشی۔ انھوں نے خاص طور پر اس حوالے سے رہنمائی کی کہ اردو میڈیم کے طلبہ وطالبات کیسے اس ایگزام میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ جناب عمران امین نے سول سروسز امتحان کی اہمیت اور اسے پاس کرنے میں درپیش مشکلات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ایسے امتحانات میں کامیابی کے لیے بچپن سے ہی ذہن بنانے اور تیاری کرنے کی ضرورت ہے۔ مراٹھا اسکول کے وائس پرنسپل ڈاکٹر عارف انجم نے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہم جہاں سول سروسز کے امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں طلبہ کی ذہن سازی کرتے ہیں، وہیں ہمیں اس پر بھی بات کرنی چاہیے کہ ان امتحانات میں ناکام ہونے والے لاکھوں بچوں کو کیا کرنا چاہیے، اسی طرح طلبہ پر کتابیں رٹنے اور یاد کرنے کا دباؤ بنانے کے بجائے شروع سے ہی ان کی صلاحیت سازی پر توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے اس پروگرام کے انعقاد میں تعاون کے لیے قومی اردو کونسل اور تمام شرکائے مجلس کا شکریہ بھی ادا کیا۔ نظامت جناب فرنود رومی نے کی۔ اس پروگرام

میں مراٹھا اسکول کے طلبہ و طالبات اور دیگر مہمانوں نے بھی شرکت کی۔ چوتھے دن مالیگاؤں سینٹرل کے ممبر اسمبلی اور دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ مفتی اسماعیل قاسمی نے بھی میلے میں شرکت اور کتابوں کی خریداری کی۔ کونسل کے نمایندگان اور کتاب میلہ کمیٹی کے ذمے داران نے ان کا استقبال کیا۔

پانچواں دن: 22 **دسمبر** 2021

میلے کا پانچواں دن بھی نہایت کامیاب رہا اور اس دن خصوصاً طلبہ و طالبات اور خواتین میں کتابوں کے تئیں غیر معمولی دلچسپی دیکھنے کو ملی۔ اس دن ایک پروگرام 'اردو خطاطی کا احیا' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں اس فن کے ماہرین اور اساتذہ نے شرکت کی اور انھوں نے فن خطاطی کی خوبیوں اور موجودہ صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے فروغ کے امکانات اور طریقوں پر تبادلۂ خیال کیا۔ مقررین نے کہا کہ خطاطی سیکھنے کے حوالے سے جو شوق و جذبہ ماضی میں تھا آج بھی وہی جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی شروعات ہمیں اپنے گھروں سے کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ کمپیوٹر کے رواج نے کتابت کے فن کو نقصان پہنچایا ہے، مگر اب بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں، جو دوسری سرگرمیوں سے وابستہ ہونے کے باوجود خطاطی اور کتابت کے فن کو تحفظ فراہم کرنے میں مصروف ہیں اور یہ فن اب بھی ترقی کر رہا ہے۔ اس پروگرام میں ماہرین نے خطاطی کے مختلف فنی پہلوؤں، کتابت کی مختلف شکلوں، لکھنے کے طریقوں اور مختلف ملکوں کے خطاطی کے قلم کی خصوصیات پر بھی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے زور دیا کہ خطاطی میں فنی لوازم کا استعمال بہت ضروری ہے، تبھی ہم خوش خط لکھ سکتے ہیں۔ جتنا زیادہ فنی اصول وضوابط کو پیش نظر رکھ کر خطاطی کی جائیگی اسی قدر ہماری تحریر میں جاذبیت اور خوب صورتی پیدا ہوگی۔ انھوں نے ڈیجیٹل خطاطی اور گرافک ڈزائننگ کے فوائد پر بھی روشنی ڈالی۔

اس پروگرام کی صدارت جناب سراج احمد دلار نے کی، جبکہ جناب آصف اقبال مرزا، امتیاز انصاری، جمال احمد، آصف ایوبی، احمد شفیق، صفوان سبحانی اور گل ایوبی نے اظہار خیال کیا۔

دوسرے سیشن میں بیت بازی کا پروگرام منعقد ہوا جس میں مالیگاؤں گرلس ہائی سکول، اے ٹی ٹی ہائی اسکول، مالیگاؤں ہائی اسکول، مہاتما گاندھی ودیا مندر، جے اے ٹی گرلس ہائی اسکول اور حضرت بی بی فاطمہ گرلس ہائی اسکول کے طلبہ و طالبات نے چھ مختلف گروپوں میں حصہ لیا اور بی بی فاطمہ ہائی اسکول کی طالبات کے گروپ نے اول، مالیگاؤں گرلس ہائی اسکول کے گروپ نے دوم اور مالیگاؤں ہائی سکول کے گروپ نے سوم پوزیشن حاصل کی۔ بیت بازی کے پروگرام کی صدارت شہر کی مشہور تعلیمی و سماجی شخصیت ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے کی، افتتاحی کلمات منصور اکبر نے پیش کیے، نظامت مشترکہ طور پر ارشاد انجم اور عمران راشد نے کی، جبکہ حکم کے فرائض مشہور شاعر مشتاق احمد مشتاق، نوجوان شاعر ڈاکٹر شہروز خاور اور راشٹریہ سہارا ممبئی سے وابستہ صحافی و ادیب حفظ الرحمن نے انجام دیے۔

پانچویں دن ہزاروں شائقین علم و کتب کے علاوہ مالیگاؤں کے ایس ڈی ایم جناب وجیہ نند شرما، مالیگاؤں کارپوریشن کی میئر محترمہ طاہرہ شیخ رشید اور مالیگاؤں شہر پولیس سٹیشن کے انچارج سریش کمار گھسر نے بطور خاص میلے کا معائنہ کیا۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اور میلہ انچارج جناب اجمل سعید، کونسل کے سپرنٹنڈنٹ جناب منیر انجم اور مالیگاؤں اردو کتاب میلہ کے ذمے داران نے ان کا گلدستہ، شال اور نشانِ تشکر کے ذریعے پرتپاک استقبال کیا اور میلے کے انعقاد میں تعاون کے لیے ان کا خصوصی شکریہ بھی ادا کیا۔

چھٹا دن: 23 **دسمبر** 2021

میلے کے چھٹے دن بھی مالیگاؤں سمیت دوسرے شہروں کے ہزاروں لوگ کتابوں کی خریداری کرتے نظر آئے۔ اس دن بھی دو اہم پروگراموں کا انعقاد ہوا جن میں سے ایک 'اردو کی آبیاری میں مالیگاؤں کی ادبی انجمنوں کا کردار' کے عنوان سے تھا۔ اس میں شہر مالیگاؤں کی مختلف ادبی تنظیموں کے ذمے داران و سربراہان اور مصنفین نے حصہ لیا۔ اس پروگرام کی صدارت مالیگاؤں کے سینئر شاعر و ناقد ڈاکٹر اشفاق انجم نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے مالیگاؤں میں اردو نثر نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہاں کے ابتدائی نثر نگاروں کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہمیں اپنے اسلاف کی خدمات کو یاد رکھتے ہوئے اردو زبان و ادب کی خدمت میں اپنی بھرپور توانائی صرف کرنی چاہیے۔ ان سے قبل جناب ظہیر قدسی نے اپنے تجربات شیئر کرتے ہوئے مالیگاؤں کی ادبی انجمنوں اور اداروں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مالیگاؤں میں انیسویں صدی میں ہی تحریر و تصنیف کے نمونے ملتے ہیں البتہ یہاں شاعری زیادہ ہوئی ہے، اب بھی یہاں شعرا زیادہ ہیں، مگر پچھلی دو تین دہائیوں میں نثر نگاری کی طرف بھی رجحان بڑھا ہے اور کئی انجمنیں نثر نگاری کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نثری اصناف میں بھی بہت عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ محبان ادب کے صدر ہارون اختر نے کہا کہ علم و ادب کے

رپورٹ

حوالے سے مالیگاؤں کی مٹی بہت زرخیز ہے اسی وجہ سے یہاں شاعر و ادیب بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ جناب سلیم جہانگیر نے کہا کہ مالیگاؤں اردو کے فروغ کے حوالے سے نہایت موزوں شہر ہے اور یہاں کونسل اپنا مقامی دفتر قائم کرکے اس شہر کی اردو نوازی کا دائرہ قومی سطح تک بڑھا سکتی ہے۔ جناب رفیق مومن نے کہا کہ چھوٹی چھوٹی انجمنوں اور ادبی نشستوں سے ہی ادب کا فروغ ہوتا ہے، اس لیے ان کی اہمیت کو ذہن میں رکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ جناب لئیق انور نے مالیگاؤں کی ادبی سرگرمیوں کے تاریخی مراحل پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مالیگاؤں کی ادبی تنظیموں خصوصاً انجمن ترقی پسند مصنّفین، بزمِ اربابِ ذوق، زندہ دلانِ ادب، اربابِ قلم، محبانِ ادب، جواز رائٹر گروپ، ادارۂ نثری ادب اور قلم دان وغیرہ کی کارکردگی اور خدمات کا خصوصی تذکرہ کیا۔

اسکس لائبریری کے عثمان غنی اسکس نے بھی شہر کی ادبی سرگرمیوں خصوصاً اسکس لائبریری کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انجمن ترقی اردو مالیگاؤں کے سربراہ خیال انصاری نے اردو کے فروغ میں انجمن کی کاوشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے فروغ اردو کے ساتھ اردو فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور ان کی خدمات کے اعتراف کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے، جو اب بھی جاری ہے۔ جناب عبدالمجید صدیقی نے کہا کہ اردو دنیا میں مالیگاؤں کا نام احترام سے لیا جاتا ہے؛ کیونکہ بزرگوں نے یہاں زبان و ادب کا جو چراغ جلایا تھا اس کی روشنی اب بہت تیز اور ہمہ گیر ہوگئی ہے، ضرورت ہے کہ ہم اس روشنی کو یونہی قائم رکھیں۔ اس پروگرام کی نظامت جناب طاہر انجم صدیقی نے کی۔

دوسرا مسابقہ 'غزل سرائی' کا پروگرام گیارہ اسکولوں کی طالبات کے مابین منعقد ہوا۔ اس کی نظامت ڈاکٹر آصف فیضی نے کی، جج جناب شاہد اختر تھے۔ صدارت شکیل جمیل حسن نے کی، جبکہ فیروز دلاور مہمان خصوصی تھے۔ اس کمپیٹیشن میں گیارہ اسکولوں کی طالبات نے حصہ لیا اور مالیگاؤں گرلس ہائی اسکول کی طالبہ نے اول، جے اے ٹی ہائی اسکول کی طالبہ نے دوم اور مالیگاؤں ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج کی طالبہ نے سوم پوزیشن حاصل کی۔ حوصلہ افزائی کے لیے کامیاب ہونے والی طالبات کو نقد انعامات سے نوازا گیا۔

چھٹے دن بھی میلے میں شہر و بیرون شہر کی مختلف موقر شخصیات کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، جن میں سول جج جناب اعجاز سید، مالیگاؤں جمعیت علماء کے جناب محمد مصطفیٰ ملی اور جمعیت اہلحدیث مالیگاؤں کے امیر ڈاکٹر سعید احمد فیضی اور اورنگ آباد سے مشہور ادیب اور فکشن نگار نورالحسنین کی سربراہی میں آنے والا اہل علم و دانش کا وفد خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ میلے کے ذمے داران نے ان مہمانوں کا استقبال کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

ساتواں دن: 24 دسمبر 2021

میلے کا ساتواں دن یعنی 24 دسمبر خواتین کے لیے مخصوص رہا۔ عام دنوں میں بھی میلے میں شریک ہونے والوں میں خواتین کی شرح زیادہ ہی تھی، مگر 24 تاریخ کو تو میلہ گاہ میں ان کا فقید المثال مجمع دیکھتے بنتا تھا اور بھیڑ بھی محض تماشائیوں کی نہیں تھی؛ بلکہ کتابیں خریدنے والی خواتین اور طالبات کی تھی؛ چنانچہ صرف اس ایک دن میں مجموعی طور پر اکیس لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ صبح دس بجے کے بعد سے جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا، خواتین کی بھیڑ بڑھتی جارہی تھی اور شام ہوتے ہوتے میلہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی؛ چنانچہ انتظامیہ کو میلے کا وقت ختم ہونے سے دو گھنٹے قبل ہی انٹری بند کرنا پڑی۔ خواتین میں کتابوں کے تئیں ایسا جوش و خروش شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملے، جو مالیگاؤں میں نظر آرہا تھا۔ اس دن خاص طور پر میلے میں آنے والی خواتین کے تحفظ اور انھیں درپیش کسی بھی پریشانی کو فوری طور پر دور کرنے کے لیے مالیگاؤں کی مشہور سماجی تنظیم الخدمت خواتین گروپ نے اپنی خدمات پیش کیں اور اپنی کارکنان کے ذریعے انھوں نے پوری تندہی سے اس بھیڑ کو قابو کیا اور میلے کا نظم و نسق برقرار رکھنے میں گراں قدر تعاون پیش کیا۔ جس کے لیے کونسل اور میلہ کمیٹی کے ذمے داران نے ان کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا۔

آٹھواں دن: 25 دسمبر 2021

کتاب میلے کا آٹھواں دن بھی بہت کامیاب رہا اور مالیگاؤں و اطراف اور دور دراز کے شہروں سے آنے والے شائقینِ کتب نے لاکھوں کی خریداری کی۔ اس دن

مالیگاؤں کے اسکولی طلبہ و طالبات کے مابین سائنس ایگزیبیشن کمپٹیشن کا بھی انعقاد عمل میں آیا، جس میں طلبہ و طالبات کے متعدد گروپوں نے حصہ لیا اور انھوں نے غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہترین سائنسی ماڈلز پیش کیے جن کا قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جناب کمل سنگھ، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر و میلہ انچارج جناب اجمل سعید اور سپرنٹنڈنٹ جناب منیر انجم اور میلہ کمیٹی کے مقامی ذمے داران نے خصوصی طور پر معائنہ کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس دن بھی میلے میں عام شائقین کتب کے علاوہ مختلف علمی، ادبی و سماجی شخصیات نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی جن کا قومی اردو کونسل اور اردو کتاب میلہ کمیٹی کے ذمے داران و اراکین نے استقبال کیا اور میلے میں ان کی شرکت پر ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ کونسل کے ذمے داران نے مالیگاؤں کے ایس پی، ڈپٹی ایس پی اور پولیس انچارج کا بھی ان کے تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا اور نشانِ تشکر پیش کیا۔ آٹھویں دن شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر قمر صدیقی، معروف شاعر عبید اعظم اعظمی، سہیل اختر وارثی، ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر و دیگر اہم شخصیات نے بھی میلے میں شرکت کی۔

آخری دن : 26 دسمبر 2021

26 دسمبر میلے کا آخری دن تھا۔ اس دن عظیم الشان اختتامی تقریب کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ میں مالیگاؤں کے لوگوں کی اردو زبان اور کتابوں سے بے پناہ محبت دیکھ کر حیرت زدہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میلے کے انعقاد سے پہلے حالات کچھ ناگفتہ بہ تھے، مگر ہم نے طے کرلیا تھا کہ میلہ کرنا ہے، اس لیے ہر ممکن کوشش کی گئی اور کونسل کے اسٹاف کے علاوہ مقامی ذمے داروں نے بھی پوری توانائی صرف کی؛ چنانچہ یہ میلہ نہ صرف منعقد ہوا؛ بلکہ تاریخ ساز کامیابی سے ہم کنار بھی ہوا ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ خواتین نے خصوصاً اس میلے میں غیر معمولی دلچسپی لی؛ چنانچہ ان کے لیے پورا ایک دن خاص کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کتاب میلے کے تئیں یہاں کے لوگوں نے جیسا پرجوش رسپانس دیا ہے، اسے دیکھ کر میں چاہتا ہوں کہ آیندہ ایک دو سال کے اندر پھر مالیگاؤں میں ہی کتاب میلے کا انعقاد کیا جائے۔ انھوں نے مالیگاؤں کے محبانِ اردو کو خوشخبری سناتے ہوئے کہا کہ ہم نے مالیگاؤں والوں کے لیے کونسل کے دروازے کھول دیے ہیں اور زبان و ادب کے تعلق سے پیش کیا گیا آپ کا کوئی بھی پروجیکٹ نامنظور نہیں ہوگا۔ انھوں نے یہاں کے مزدور پیشہ شاعروں اور ادیبوں کے تئیں خصوصاً قدر شناسی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس شہر کے ادبی اداروں سے میری درخواست ہے کہ ایسے لوگوں کی فہرست بنائیں، ہم ان کی خدمات کے اعتراف میں سمینار کریں گے اور انھیں قومی سطح پر منظر عام پر لایا جائے گا۔ شیخ عقیل نے مالیگاؤں میں خواتین کی تعلیم کے تئیں غیر معمولی بیداری کی خصوصاً ستائش کی اور کہا کہ جس شہر میں بچیوں کی تعلیم پر اس قدر توجہ دی جاتی ہے، اس شہر کا مستقبل یقیناً روشن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی بچیوں کے تئیں میرے دل میں بہت عزت و احترام ہے اور مستقبل قریب میں ہم مالیگاؤں میں ایک ایسا سمینار کروانا چاہیں گے، جس میں خصوصاً خواتین کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ شیخ عقیل نے اس میلے کے انعقاد میں تعاون کرنے والے تمام اداروں، افراد، اہالیانِ مالیگاؤں، میلے کے رضاکار، کونسل کے اسٹاف اور مقامی انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی اردو اور کونسل کے تئیں یہاں کے لوگوں کی محبت و اعتماد برقرار رہے گا اور ہم آپ کے تعاون سے فروغِ اردو کے کاز کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔

اس سے قبل قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر و میلہ انچارج اجمل سعید نے پروگرام کے مقاصد و اہداف پر روشنی ڈالتے ہوئے کونسل کی اسکیموں کا تعارف کرایا اور میلے کے انعقاد میں معاون تمام اداروں خصوصاً

مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن، انجمن محبانِ اردو کتب، اے ٹی ٹی ہائی اسکول، مراٹھا ہائی اسکول، جے اے ٹی کالج فار ویمن، انجمن ترقی تعلیم اور ان تمام افراد اور اداروں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس میلے کے انعقاد میں اپنا غیر معمولی تعاون پیش کیا۔

کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کمل سنگھ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر کے لوگ اردو اور کتابوں سے دلی محبت کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہاراشٹر اردو کا ایک بڑا مرکز ہے۔ انھوں نے بھی مقامی انتظامیہ، افسران اور معاون اداروں اور میڈیا کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے میلے کے انعقاد میں ہر طرح کی معاونت کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ میلہ کونسل کے اب تک کے کتاب میلوں میں نمبر ون ہے۔

جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا کے نائب مہتمم مولانا حذیفہ وستانوی نے کہا کہ موجودہ دور میں نئی نسل کو کتابوں سے جوڑنا ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے، کونسل نے اس میلے کا انعقاد کر کے نئی نسل کو موبائل کے بجائے کتابوں سے قریب لانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ انھوں نے کونسل اور ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کے اس اقدام کی ستائش کی اور میلے کے تمام منتظمین کو مبارکباد پیش کی۔

انجمن ترقی تعلیم کے نائب صدر جمیل کرانتی نے اپنے بیان میں کہا کہ مالیگاؤں والے نہ صرف اردو بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں؛ بلکہ وہ اردو میں ہی کھاتے پیتے اور سانس بھی لیتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں اردو کے تئیں غیر معمولی جوش ہے۔ انھوں نے میلے کے انعقاد کے لیے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر، اسٹاف اور میلہ کمیٹی کے مقامی ذمے داران کی دلچسپی و حوصلہ مندی کی تعریف کی اور سبھوں کا شکریہ ادا کیا۔

تقریب کے شروع میں کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد، اسسٹنٹ ڈائرکٹر کمل سنگھ، مولانا حذیفہ وستانوی اور دیگر مہمانوں کا گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر میلے کے انعقاد میں معاون اداروں کو نشانِ اعتراف پیش کیا گیا، جن میں اے ٹی ٹی کالج کے نائب صدر جمیل کرانتی، ایم جی ودیا مندر سٹی کالج مالیگاؤں کے وائس پرنسپل ڈاکٹر عارف انجم، انجمن محبان اردو کتب، جے اے ٹی گرلس کالج اور پیس (پونے) شامل تھے۔ ان کے علاوہ تدریس، ادب و ثقافت، صحافت، مصوری، ڈراما اور موسیقی کے شعبوں میں خدمت انجام دینے والی مالیگاؤں کی اہم شخصیات کو افتخارِ شہر مالیگاؤں ایوارڈ پیش کیا گیا، جن میں فیروز حسین بادشاہ، ڈاکٹر سلیم شہزاد، رمضان عبدالشکور، رشید آرٹسٹ، عبداللطیف جعفری اور سراج احمد دلار شامل تھے۔ بیت بازی، حب الوطنی گیت، اردو گیت، پوئٹری کمپٹیشن اور سائنس کمپٹیشن میں اول، دوم و سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو ٹرافی سے نوازا گیا۔ معاون اداروں اور افراد کو بھی نشانِ تشکر پیش کیا گیا۔ میلے کے دوران ہونے والے ثقافتی پروگراموں، خصوصاً حب الوطنی اور اردو زبان کے گیتوں میں خصوصی فنی رہنمائی کرنے والے کوہ نور میوزک اکیڈمی کے سربراہ جناب ابوالفیصل جاوید کو بھی نشانِ تشکر پیش کیا گیا۔ اسی طرح میلے کے بہ حسن وخوبی انعقاد کو ممکن بنانے اور شروع سے آخر تک میلے کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے میں اہم تعاون پیش کرنے والے جناب ریاض انصاری کی بھی کونسل اور مقامی میلہ کمیٹی کی جانب سے پذیرائی کی گئی اور انھیں نشانِ تشکر پیش کیا گیا۔

کتابوں کے بیسٹ کلکشن کا ایوارڈ الحسنات پبلی کیشنز، دہلی اور بہترین انداز میں کتابوں کی پیش کش کا ایوارڈ ہدایت پبلی کیشنز، دہلی کو دیا گیا۔ پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے نمایندگان و ایڈیٹران کی خدمات کا بھی خصوصی طور پر اعتراف کیا گیا اور دونوں شعبوں کے نمایندہ صحافیوں کو نشانِ تشکر سے نوازا گیا۔ اس اختتامی تقریب کا آغاز مشاہد حسین رضوی کی تلاوت سے ہوا، جب کہ نظامت کے فرائض مالیگاؤں اردو کتاب میلہ کمیٹی کے ذمے دار جناب امتیاز خلیل نے بحسن وخوبی انجام دیے اور اس طرح قومی اردو کونسل کا چوبیسواں قومی اردو کتاب میلہ ریکارڈ ساز کامیابیوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

قابلِ ذکر ہے کہ اس میلے میں مجموعی طور پر سوا کروڑ روپے سے بھی زیادہ کی کتابیں فروخت ہوئیں، ملک بھر کے اردو اخبارات کے علاوہ مقامی مراٹھی، ہندی و انگریزی اخبارات اور انٹرنیشنل میڈیا میں بھی اس میلے کی گونج سنی گئی اور ان علاقوں کے لوگ، جو اردو زبان اور اردو کتابوں کے حوالے سے رات دن مایوس کن خبریں سننے کے عادی ہیں، وہ یہ جان کر اب تک خوشگوار حیرت سے دوچار ہیں کہ ہندوستان میں ایک شہر ایسا بھی ہے، جہاں کے لوگ نو دن کے عرصے میں سوا کروڑ سے بھی زیادہ کی اردو کتابیں خریدتے ہیں اور جہاں اردو نہ صرف یہ کہ زندہ ہے؛ بلکہ اپنی تمام تر رعنائی و زیبائی اور قوت و شوکت کے ساتھ زندہ ہے، جہاں اردو کسی مجبوری میں نہیں؛ بلکہ پہلی پسند کے طور پر پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، جہاں کے لوگوں نے فی الحقیقت اردو زبان کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے اور اردو میڈیم تعلیم گاہوں میں پڑھ کر وہ بڑا سے بڑا تعلیمی و عملی معرکہ سر کر رہے ہیں۔

■

Nayab Hasan
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

مخدوم کی شاعری میں تصورِ عشق کی حقیقت

اسلم آزاد

مخدوم محی الدین نے اپنا نصب العین یہ تیار کیا کہ ہم اپنی شاعری کے ذریعے وطنیت کے دھارے کو وسیع بنیادوں پر استوار کریں گے۔ اسے مذہب وملت کی بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندیوں سے یکسر آزاد کر کے عوام کا رشتہ محنت کش طبقے سے جوڑیں گے لیکن آپ کہیں گے کہ یہ نصب العین تو دیگر ترقی پسند شاعروں کا بھی تھا۔ ہاں ضرور تھا لیکن اس نصب العین میں عشق اور رومان کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا اس نے مخدوم کی شاعری میں جان ڈال دی۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اردو کے جن چند شعرا نے اپنی نمایاں شناخت قائم کی ان میں ایک نام مخدوم محی الدین کا بھی ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ مخدوم عشق ورومان کے شاعر ہیں اور انقلابی شاعر بھی۔ ان کی شاعری صحت مند رومانیت کی عمدہ مثال کہی جاسکتی ہے۔ گرچہ بعض ناقدین نے مخدوم کی شاعری کو فنی اعتبار سے کوئی آئیڈیل تصور نہیں کیا ہے لیکن باوجود اس کے مخدوم کی شاعری آج بھی ہم میں اتنی ہی مقبول ہے جتنی کل تھی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

اس نکتے کی طرف سب سے پہلے عابد علی خاں اور سبط حسن نے اشارہ کیا تھا لیکن وہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے کہ:

’’بڑے شاعر کا نصب العین بلند ہوتا ہے اور طرز اظہار مقبول‘‘

(دیباچہ: بساط رقص، استقبالیہ کمیٹی جشن مخدوم)

لیکن انھوں نے ’نصب العین‘ اور ’طرز اظہار‘ کی وضاحت نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی ’نصب العین‘ اور ’طرز اظہار‘ کی توضیح جب ہم مخدوم کی شاعری میں تلاش کرتے ہیں تو ان کی شاعری کی مقبولیت کا راز بلا چون و چرا واضح ہوجاتا ہے۔ مخدوم محی الدین نے اپنا نصب العین یہ تیار کیا کہ ہم اپنی شاعری کے ذریعے وطنیت کے دھارے کو وسیع بنیادوں پر استوار کریں گے۔ اسے مذہب وملت کی بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندیوں سے یکسر آزاد کر کے عوام کا رشتہ محنت کش طبقے سے جوڑیں گے لیکن آپ کہیں گے کہ یہ نصب العین تو دیگر ترقی پسند شاعروں کا بھی تھا۔ ہاں ضرور تھا لیکن اس نصب العین میں عشق اور رومان کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا اس نے مخدوم کی شاعری میں جان ڈال دی۔ دیگر شعرا مثلاً فیض اور مجاز نے بھی اس پیرائے کو اختیار کیا لیکن فیض چند مسافت کے بعد دامن جھٹکنے لگے اور یہاں تک کہہ گئے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجاز لکھنوی نے بس دور سے یہ تمنا کی کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

لیکن مخدوم نے اپنی شاعری میں عشق، زندگی کا تصور اور سماجی کشاکش کے شعور کو ہم آمیز کر کے اسے صحت مند سمت عطا کی۔ لہٰذا ان ہی حقائق کے پیش نظر سبط حسن نے ’بساط رقص‘ کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

’’مجھے اکثر نوجوان شاعروں سے یہ شکایت ہے کہ وہ محبت کے عجیب وغریب معیار قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں اس انقلابی دور میں ہمارے لیے مناسب نہیں کہ عورتوں کی محبت کے خیال میں پھنسیں، یہ عمل کا وقت ہے۔ ہاں انقلاب کرنے کے بعد جب فرصت ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ اس لیے بعض شاعر اپنی محبوبۂ دلنواز کو بڑے پندار اور پدرانہ شفقت سے نصیحت کرتے ہیں کہ تم گھر لوٹ جاؤ، کیونکہ تم میں مجھ جیسے انقلابی کے پہلو بہ پہلو چلنے کی طاقت نہیں ہے۔‘‘

شاعروں کے ایسے خیالات کو پختگی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اس کائنات کی اشرف المخلوقات میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورت بھی ہے جنھیں عقل وخرد اور طاقت وہمت سے نوازا گیا ہے۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر کسی ایک جزو کو نظر انداز کر کے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جاسکتا۔ نہ کوئی لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا اور نہ ہی ترقی کی منزل پائی جاسکتی ہے۔ تبھی تو مخدوم نے یہ کہا

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مخدوم نے اپنی شاعری کے بیشتر حصے میں اس حقیقت کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن انھوں نے جہاں کہیں اس نکتے کو فراموش کیا ہے فنی سطح پر ٹھوکر کھائی ہے۔ مخدوم کا مزاج بنیادی طور پر رومان پسند تھا۔ ان کا دل عشق اور تصور عشق سے لبریز تھا۔ ان کا عشق ہنگامہ خیز یا برانگیختہ قسم کا نہیں تھا بلکہ ان میں ایک منضبط طریقے کی سنجیدگی تھی جو چھن کر ان کی شاعری میں پیوست ہوتی رہی۔ مخدوم نے اس حقیقت کا اعتراف ’گل تر‘ کے مقدمے میں کیا ہے:

’’شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشن اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب واضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا ہے اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل میں تضادات تحلیل ہوکر تسکین وطمانیت کے مرکب میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

شاعر بحیثیت ایک فرد معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر ہوتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ رومانی کرب واضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے۔ شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔''

مخدوم کا مزاج رومان پرور تھا لیکن چھیڑ چھاڑ، تکلیف دہ فقرہ بازی ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اقبال نے جس طرح 'دین و سیاست' کا تصور دیا ٹھیک اسی طرح مخدوم نے 'محبت اور سیاست' کا پیغام اپنی شاعری کے ذریعہ عوام تک پہنچایا۔ چنانچہ جب ان کا پہلا مجموعہ کلام 'سرخ سویرا' 1944 میں منظر عام پر آیا تو اس کا انتساب ہی 'محبت اور محنت' کے نام کیا۔ اس کی پہلی نظم 'طور' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

دلوں میں ازدحام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

جس پیار میں ذرہ برابر بھی کھوٹ اور لوچ ہو کیا خدا کے سامنے ایسی جرأت کر سکتا ہے اور کیا خدا اس کے پیار پر اپنی مسکراہٹ بکھیر سکتا ہے؟ اس حوالے سے خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی کتاب 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' میں قاضی عبدالغفار کا یہ فقرہ نقل کیا ہے:

''خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجکتی اور جس کا خدا بھی اتنا مشفق و مہربان ہے کہ محبت کے اس مظاہرے پر خوش ہوتا ہے۔''

مخدوم کی شاعری میں تصور عشق کی حقیقت کا انکشاف ان کے مزاج اور فکری و عملی اور ذاتی زندگی کے مطالعے اور مشاہدے سے کیا جا سکتا ہے۔ مخدوم کی ذاتی زندگی کی ناقدین و محققین نے بڑی حد تک وضاحت کی ہے اور سبھوں نے بالاتفاق رائے دی ہے کہ مخدوم گرچہ رومان پسند مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے لیکن اس رومان پسندی نے اپنے پاس کبھی بھی پھوہڑ پن کو پھٹکنے نہیں دیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مخدوم کا گھرانہ ''حضرت کا گھر'' کہلاتا تھا جس کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ ابوسعید خدریؓ جو حضور پاکؐ کے ایک صحابی تھے، سے جا ملتا ہے۔ دینی ماحول میں پرورش پانے کے سبب بچپن سے ہی مزاج میں بزرگانہ باؤ بھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اور گھر کے بزرگ انھیں 'بابا' کی عرفیت سے پکارتے تھے۔ (بحوالہ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے۔ شاذ تمکنت) گرچہ بچپن میں ہی مخدوم کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے انھیں بے سہارا چھوڑ کر دوسری شادی کر لی لیکن باوجود اس کے، ان کی طبیعت میں قناعت اور آسودگی دیدنی ہے۔ شاذ تمکنت لکھتے ہیں:

''وہ (مخدوم) لمحہ نقد کو خوشی کے ٹکسال میں بھنانے کے فن سے واقف تھے۔ وہ زندگی سے آخر تک کبھی شاکی نہیں رہے۔ ان کی نجی پریشانیاں کچھ کم نہ تھیں لیکن وہ ان سے رنجیدہ نہیں تھے بلکہ خوش اس بات پر رہتے تھے کہ خلقی طور پر انھیں خوش رہنے کی توفیق عطا ہوئی تھی۔''

(مخدوم محی الدین: حیات اور کارنامے، ص 23)

''جمعہ کا دن تھا کوئی دن کے ایک بجے گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں بستر پر لیٹے لیٹے مجھ سے کہا کھانا کھا لینا چاہیے۔ بہت بھوک لگی ہے، یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ جب کمرہ کو تالا لگا چکے تو امتیاز کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہے؟ میں نے کہا وہ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد حضرت بل گیا ہے وہ آ کر کھانا کھا لے گا۔ مخدوم نے جیب سے چابی نکالی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے لاکھ کہا کہ وہاں شیخ عبداللہ کا وعظ بھی ہوگا، اس طرح دیر ہو جائے گی، چلیے کھا لیں۔ مخدوم پھر بستر پر دراز ہوئے اور اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ عبادت گزاروں کا انتظار بھی عبادت ہے۔''

(مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے)

مخدوم کا عشق کسی ایک نکتے پر ساکت نہیں بلکہ حرکی تھا جو کائنات کی حقیقت اور فطرت کا مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔ وہ مذہب کو مسجد، مندر، گرودوارہ اور گرجا سے ماورا دیکھنے کے قائل تھے۔ دراصل انھیں سچائی، نیکی، انسانیت اور مساوات کی تلاش تھی۔ یہ اوصاف ہر مذہب کے عناصر ترکیبی ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ اہل وطن جب ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کریں اور ایک دوسرے کی تہذیب سے پیار کریں تب ہی ہر ایک کو ترقی کے مواقع مل سکتے ہیں۔ یہی ہماری مشترکہ تہذیب کی پہچان ہے اور اس میں ترقی، خوشحالی اور خیر سگالی کا راز پنہاں ہے۔ بقول شاعر

جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے
رام و لچھمن کی زمیں کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمدؐ کی زمیں وہ ابن مریم کی زمیں

مخدوم بچپن سے ہی موزوں طبع اور شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولوی محمد نظام الدین کے مطابق ان کی پہلی نظم 'بچے' ہے جو دستیاب نہیں لیکن بہتوں نے 'پیلا دوشالہ' کو ان کی پہلی نظم تصور کیا ہے جسے مخدوم نے بنٹی میں 1933 میں لکھی تھی۔ داؤد اشرف نے اس کا سنہ اشاعت 1929 بتایا ہے۔

مخدوم چونکہ ابتدا سے ہی رومان پسند مزاج رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے عشق کے ساتھ انقلاب اور آزادی کی طرف قدم بڑھایا تو عام سچے شاعر کی طرح جب دیوار دبستان پر لام الف لکھنا شروع کیا تو ان کے بطن سے مفہوم عشق ہی برآمد ہوا۔ مخدوم نے کھیتوں میں پانی کے کنارے سے محبت کے سبق کی ابتدا کی تھی۔ ان کی رومانی نظموں کے حسن و قبح پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیش رو دو نہایت اہم شاعر جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی سے تحریک حاصل کی۔ جوش سے انقلاب اور اختر شیرانی سے والہانہ پن قبول کیا۔

مخدوم کوئی بہت حسین آدمی نہ تھے لیکن ان میں ایسی دلکشی تھی کہ جو مخدوم سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ خاص طور پر خواتین کا بڑا طبقہ ان کا مداح تھا۔ 1940 کے آس پاس کا واقعہ ہے کہ محبوبیہ گرلز اسکول کی طالبات نے ایک 'مخدوم کارنر' بنا رکھا تھا جہاں وہ مخدوم کی نظمیں 'طور'، 'وہ'، 'چارہ گر' اور 'انتظار' گاتی تھیں۔ مخدوم کے مزاج میں بذلہ سنجی اور حاضر جوابی خوب تھی۔ فقرہ ایسا کہ محفل زعفران زار بن جائے۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا:

وہاب حیدر ایک صحافی اور کارٹونسٹ تھے۔ انھیں مخدوم سے بے حد عقیدت و محبت تھی۔ جس طرح 'دیوان حافظ' سے فال نکالی جاتی رہی ہے اور نام رکھے جاتے رہے ہیں۔ اسی طرح وہاب حیدر نے اپنے بچے کے لیے 'سرخ سویرا' سے فال نکالی اور اس کا نام 'حیات نو' رکھ دیا۔ سلیمان اریب نے کہا یہ کیا نام ہوا فال دوبارہ دیکھیے۔ مخدوم نے فوراً کہا: 'بس بس یہی نام بہتر ہے۔ نظموں میں 'ماروکژدم'، 'گدھ'، 'سوسمار'، 'اثغازیر'، 'موذی' اور 'عزازیل'

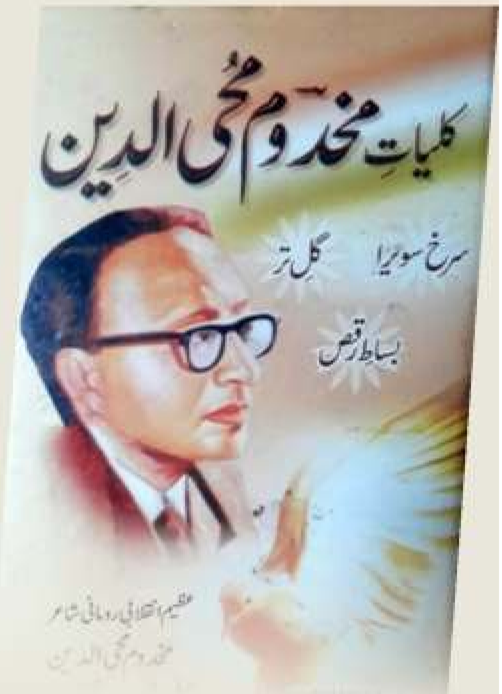

جیسے خطرناک الفاظ بھی ہیں۔ یہی بذلہ سنجی اور خوش مزاجی جیسی اداؤں پر شاردا نامی طوائف مخدوم پر مرمٹی تھی۔ مخدوم بھی وہاں رقص وسرود سے لطف لینے جایا کرتے تھے لیکن کوئی غیر معقول حرکت احباب نے نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی۔ محلہ محبوب کی مہندی میں کوچۂ نشاط تھا جہاں مخدوم نہایت مقبول تھے۔ ایسے میں پطرس بخاری کا وہ فقرہ کہ لڑکی کتنی ہی آوارہ مزاج کیوں نہ ہو پارسائی پر جان دے دیتی ہے'' کو تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہوسکتا۔

مخدوم نے اپنی زندگی میں واقعی اگر کسی لڑکی کو ٹوٹ کر چاہا تو وہ بانو نام کی خاتون تھیں۔ مخدوم ان کے یہاں جاتے تو ان کی خوب عزت ہوتی اور مے وجام سے خاطر تواضع کے بعد ان کی غزلیں سناتی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ اگر یہ خاتون نہ ہوتیں تو مخدوم غزل کی طرف کبھی نہ آتے۔ 'گل تر' کی عشقیہ شاعری کے کم وبیش تمام ترسہرے کا سہرا انہی کے سرجاتا۔ مخدوم کی حیات معاشقہ جس حد تک میرا اندازہ ہے اور جس کے گواہ مخدوم کے قریبی احباب بھی رہے ہیں وہ صرف 'جمال ہم نشیں' کے ذوق سے عبارت ہے۔ اس میں 'وصال ہم نشیں' کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ یقیناً انھیں عورتوں کی قربت حاصل تھی۔ مثلاً انھوں نے شکیلہ بانو بھوپالی کی فرمائش پر غزلیں کہیں جو بربنائے دوستی تھیں بنام عشق نہیں۔ جسم ولمس سے زیادہ دید ونظارہ ان کا شیوہ تھا۔ وہ Beauty is to see but not to touch قائل تھے۔ وہ اوباش نہیں تھے۔ حسن پرست تھے، گریباں چاک نہیں تھے، دل چاک ہے۔

دو بدن

اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو، تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرف ماتم ہوئی...
یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج ومداوائے الفت بھی ہے؟

(چارہ گر)

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

(انتظار)

ان کا مزاج فطرتاً شوخ اور بے باک ہے، لیکن ان کے عہد طفلی کے حالات نے ان سے ان کا بچپن ہی چھین لیا ہے اور ان کی زندگی مایوسی اور نامرادی، ناکامی اور ناامیدی کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ ان حالات میں حساس طبع انسان اکثر اپنی محدود دنیا خلق کرلیتا ہے اور خارجی کی بجائے داخلی دنیا کو پناہ گاہ بنالیتا ہے۔ مخدوم نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے رومانی اور عشقیہ طرز اظہار کو اپنی شاعری کا وسیلہ بنالیا ہے، لیکن ان کی رومانی اور عشقیہ شاعری میں سطحیت اور لذتیت نہیں ہے۔ پاکیزگی، سادگی اور معصومیت ہے، قنوطیت نہیں رجائیت ہے، حزنیت اور غنائیت ہے، Rythm اور موسیقیت ہے اور یہی ان کی شاعری کی ناگزیر شناخت ہے۔

مخدوم کی عاشقانہ شاعری میں جو لہک اور فتح مندی ہے وہاں واسوخت کا تصور بھی مشکل سے بار پاتا ہے۔ محبوب سے بیزاری کا اظہار اور شکوہ وشکایت کے عنوانات سے مخدوم کی شاعری کا کوئی علاقہ نہیں رہا ہے۔ تیکھا اور چبھتا ہوا لہجہ مخدوم کا مخصوص رنگ سخن نہیں ہے۔ 'چہرہ ٹوٹا ہوا آئینہ جی تری باتوں سے کیا بات ہے گھبرانے لگا'' اور دل کے تہہ خانوں میں بارود کا بچھنا، شاعر کے مزاج کی کھلی تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ آج کی رات نہ جا، سے لے کر 'جز تری آنکھوں کے' تک سے شاعر کے اعتماد وفا اور اعتبار محبت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

'' وہ انقلاب کا انتظار بھی اسی طرح کرتا ہے جیسے کوئی کسی خوش جمال محبوب کا انتظار کرتا ہے۔''

دراصل یہی مخدوم کی شاعری کا بنیادی اسلوب ہے جس کے سبب عوام وخواص میں اس کی شاعری مقبول رہی ہے اور رہے گی۔

مخدوم محی الدین شاعر مشرق علامہ اقبال سے بھی متاثر رہے ہیں۔ اقبال کے سلسلے میں لکھی گئی مخدوم کی دونوں نظمیں اس بات کی شاہد ہیں۔ ان کی انقلابی اور سیاسی شاعری پر اقبال اور جوش کے اثرات نمایاں ہیں۔ آزادی وطن، 'حبشہ پر مسولینی کا حملہ' اور 'جنگ' اس کی مثال ہیں۔

ان نظموں کی بلند آہنگی، گھن گرج اور شعلہ افشانی جوش کی یاد دلاتی ہے۔ مخدوم نے ذہنی اور فکری سطح پر اقبال کے اثرات قبول کیے ہیں۔ لیکن ان کا انداز فکر ونظر بالکل مختلف ہے۔ بلکہ ان کی شاعری میں اقبال کی شاعری کی توسیع کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نکتہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ اقبال کے یہاں اشتراکیت کا صرف عکس ملتا ہے جب کہ مخدوم نظریاتی طور پر بالکل اشتراکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جابہ جا شعلگی کی آنچ بے حد تیز ہوجاتی ہے۔ 'مشرق'، آزادی وطن، جہان نو، اور 'موت کا گیت' میں وہ صرف ایک اشتراکی شاعر نظر آتے ہیں۔ یہی اشتراکی شدت ان کے فن شاعری کو مجروح کردیتی ہے۔ ان نظموں میں جذباتیت ہی نہیں سطحیت بھی ہے۔ وقتی طور پر ان کی نظمیں متاثر کرتی ہیں لیکن یہ مخدوم کی شاعری کا اختصاص نہیں۔

لطف الرحمان اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''فیض اور مخدوم دونوں ہی درمیانی لب ولہجے کے شاعر ہیں جنھوں نے اقبال کی روایات فکر وفن کو نئی سمت وجہت دی ہے اور ترقی پسند شعری روایت کو اعتبار واحترام سے ہم کنار کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال کے بعد فیض اردو کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ ترقی پسند بڑی روایت میں فیض کے بعد مخدوم ہی کو امتیاز وانفرادیت حاصل ہے۔''

(تعبیر وتقدیر: لطف الرحمان، ص 61)

ترقی پسند ہونے کے باوجود مخدوم روایات اور اقدار سے یکسر بغاوت نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں روایت اور جدت کا امتزاج اور کلاسیکی لوازمات اور نئے میلانات کا دوآتشہ ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں جمال اور جلال ورومان وانقلاب کا آمیزہ تو ملتا ہے لیکن ان کا لب ولہجہ بلند بانگ ہوتا تو ہے لیکن ان کے آہنگ وانداز میں حلاوت بھی ہوتی ہے اور دھیما پن بھی۔ رومان سے انقلاب تک کا سفر انھوں نے ایک جست میں طے نہیں کیا۔ ان کے یہاں داخلی اور خارجی عناصر بھی ملتے ہیں اور ان کا امتزاج بھی۔ ترقی پسند نظریات اور تصورات کے باوجود وہ روایت کے پاسدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر ترقی پسند شعرا مثلاً فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی، سردار جعفری اور پرویز شاہدی سے مختلف ہیں۔

پھر تڑپنے لگا دل مضطر　　　پھر بدلنے لگا ہے دیدۂ تر
یاد آئیں وہ چاندنی راتیں　　　وہ ہنسی چھیڑ، دل لگی باتیں

تیرے دیوانے تری چشم ونظر سے پہلے
دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے
سناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا
اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں
چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

مخدوم نے کبھی بھی دل پر دماغ کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا محبوب کوئی تخیلی اور تصوراتی نہیں بلکہ ان کے گرد وپیش کا انسان ہے جو ان کی زندگی کا بھی حصہ ہے اور شاعری کا بھی۔

■

Prof. Aslam Azaad
Emeritus Fellow
2, Professor's Bungalow
Patna-800006
M.09431063199

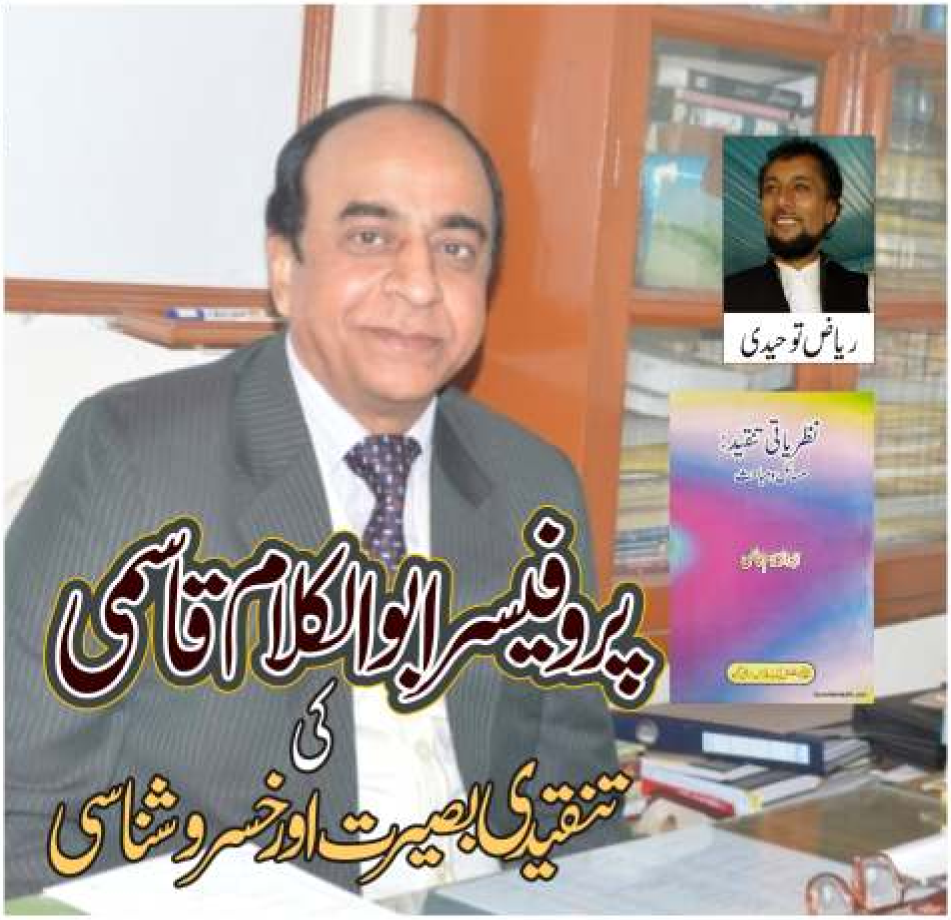

ریاض توحیدی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تنقیدی بصیرت اور خسرو شناسی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی (1950-2021) ایک استاد ہونے کے علاوہ ادب میں تنقید نگار کی حیثیت سے بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں کئی رسائل کے ساتھ عملی طور پر منسلک رہے، جن میں 'تہذیب الاخلاق' خصوصی طور پر شامل ہے اور اپنا ایک رسالہ 'امروز' بھی نکالتے تھے جس نے کم وقت میں سنجیدہ قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔ ان کی اہم کتابوں میں کثرت تعبیر، شاعری کی تنقید، تخلیقی تجربہ، مونوگراف مرزا غالب... شخصیت اور شاعری، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت اور 'معاصر تنقیدی رویے' وغیرہ شامل ہیں۔ ساہتیہ اکادمی سے کتاب 'معاصر تنقیدی رویے' کو 2009 میں ایوارڈ بھی ملا تھا۔ ان کی ترتیب وترجمہ کردہ کتابوں میں آزادی کے بعد اردو فکشن، آزادی کے بعد اردو طنز ومزاح، انتخاب کلام فراق گورکھپوری'، کلیات رشید احمد صدیقی، مشرق کی بازیافت، ناول کا فن اور 'ڈاکٹر ذاکر حسین' شامل ہیں۔

مجموعی طور پر اردو تنقید کا احاطہ کریں تو اردو تنقید کا معتد بہ حصہ تبصراتی، تشریحی، توصیفی یا تنقیصی نوعیت کا خاکہ معلوم ہوتا ہے، اور بہت کم ناقدین ہیں جن کی تحریرات میں تفکیری اور تجزیاتی فکر و پرکھ کا تکنیکی مکالمہ نظر آتا ہے، ان میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی بھی شامل ہیں، کیونکہ موصوف کسی بھی شعری متن پر گفتگو کرنے کے دوران تنقیدی اسالیب کے پیش نظر تجزیے وتحلیل کے ماہرانہ عمل کا ثبوت جگہ جگہ فراہم کرتے ہیں جو ان کی تصنیفات خصوصاً 'شاعری کی تنقید' اور 'معاصر تنقیدی رویے' کے بیشتر مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ اردو تنقید کے رسمی اور مکتبی انداز کا احساس خود ابوالکلام قاسمی کو بھی تھا کیونکہ ان کی نظر اردو کے علاوہ کئی اور زبانوں کے ادب پر بھی تھی، چونکہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران عربی اور فارسی سے شناسائی اور پھر عصری تعلیم کے میدان میں آکر اردو، انگریزی اور چند دیگر زبانوں کے شعر وادب سے بھی انھیں استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا، اس لیے اپنی عدم اطمینانیت کا اظہار کرتے ہوئے کتاب 'معاصر تنقیدی رویے' میں فرماتے ہیں:

''اردو تنقید کی عام فضا ہنوز تاثراتی اور عمومی نوعیت کی تحریروں کو ادبی تنقید کا نام دینے میں مصر نظر آتی ہے۔ اس ماحول میں ادبی تنقید کی منطقی زبان اور معروضی طرز بیان پر کوئی مفاہمت نہ کرنا ہماری سب سے بڑی ناقدانہ ذمے داری بن گئی ہے۔ ناچیز نے شاعری اور نثر دونوں طرح کے ادب پاروں میں تنقیدی مضامین لکھے ہیں لیکن بالعموم کوشش رہی ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کو مرکز میں رکھنے کے بجائے ان کی تخلیقات کو بنیادی محور بنایا جائے اور متن پر سارا ارتکاز رکھنے کے نتیجے میں تحریک پانے والے ناقدانہ عمل کو استدلال کی مدد سے سامنے لایا جائے۔'' (ص 6)

مذکورہ اقتباس میں جو اہم بات کہی گئی ہے وہ بنیادی متن پر ارتکاز کرکے ناقدانہ تجزیہ پیش کرنا ہے اور یہی ادبی تنقید کا بنیادی کام ہے۔ اگرچہ ابوالکلام قاسمی کی تحریر میں یہ طریقہ کار جگہ جگہ نظر آتا ہے تاہم ان کے علاوہ اردو کے کئی اور ناقدین بھی نہ صرف اس قسم کے تنقیدی اپروچ پر زور دیتے آئے ہیں بلکہ عملی طور پر ان کی تنقیدی نگارشات میں یہ چیزیں نظر بھی آتی ہیں، جس سے اردو تنقید کی معیار بندی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی جانب موصوف بھی اشارہ کرتے ہوئے اپنے تنقیدی طریقہ کار کے مقصد سے متعلق لکھتے ہیں:

''مجھے اس بات کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کہ معاصر تنقیدی منظر نامے میں سنجیدہ اور قابل اعتنا کاوشیں بہت کم دکھائی دیتی ہیں اس لیے اردو میں تنقید کے نام پر لکھی جانے والی عام تحریروں سے بے اطمینانی کا اظہار کیے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ میں اگر تنقید لکھتا ہوں تو اس کا سبب اس بے اطمینانی کے ازالے کی بساط بھر کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

ادبی تنقید کے اصول وضوابط کو پیش نظر رکھیں تو کسی بھی تخلیقی متن کے تجزیاتی عمل کے دوران تخلیق کار کے زمانی ماحول کے برعکس تخلیق کے متنی ماحول پر ارتکاز کرنا تنقیدی بصیرت کہلاتا ہے تاہم دوران تجزیہ اگر کہیں کہیں متن، تخلیق کار کے زمانی یا ثقافتی ماحول کی بھی عکاسی کرتا ہے اور یہ معاملہ اکثر شعر وفکشن میں سامنے آتا رہتا ہے تو بھی تنقیدی نقطہ نگاہ سے متن(Text) اور بین المتن (Inter text) میں پوشیدہ لسانی، صوتی، ہیئتی، موضوعی، اسلوبیاتی، ساختیاتی اور جمالیاتی وغیرہ جیسے فنی اور تکنیکی عوامل کے زیر نظر ہی توضیحی امکانات کا سلسلہ چلتا رہے گا اور اس دوران حسب ضرورت تخلیق کار کی شخصیت اور اس کی تخلیق میں عصری اثرات کو پیش نظر رکھ کر بھی بات کی جاسکتی ہے، کیونکہ متن میں الفاظ کے ذریعے ہی معنیاتی فضا بندی قائم ہوتی ہے جو بقول سوسیر 'صوتی طور پر' معنی نما (Signifier) اور تصور یا مفہوم کے طور پر 'معنی' (Signified) کے ساختیاتی نظام پر استوار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی ادبی تنقید کے اطلاقی طریقہ کار کی اہمیت اور ضرورت پر نظریاتی انداز سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادبی تنقید کا نام لیا جائے تو بالعموم اس سے اطلاقی تنقید مراد لی جاتی ہے۔ یعنی کوئی ایسی تحریر جو ادبی متن کے مطالعے، تفہیم، تجزیے، تقابل، اور تعبیر جیسے وسیلوں کو استعمال کرنے کے بعد ادب پارے کی جانچ پرکھ کرے یا زیادہ واضح انداز میں کہا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تنقید تو دراصل وہ ہے جس کے وسیلے سے ادبی متن کے سمجھنے اور اس کی قدر وقیمت کو متعین کرنے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ اس عمل میں تحسین کے ساتھ تنقیص کے مراحل بھی آتے ہیں۔ مگر نہ تحسین بلا دلیل ہونی چاہیے اور نہ تنقیص

بغیر کسی نقص کی نشاندہی کے۔یعنی ہر مرحلے اور ہر فیصلے میں غیر جانبداری اور معروضی، بنیادی شرط قرار پائے گی۔''

(معاصر تنقیدی رویے، ص 11)

محولہ اقتباس میں ادبی تنقید کے اطلاقی پہلوؤں کا عمدہ احاطہ کیا گیا ہے کیونکہ ایک ناقد کا صاحب بصیرت ہونا ضروری ہے تب ہی وہ کسی معیاری متن کا ناقدانہ تجزیہ کرسکتا ہے نہیں تو پھر تنقید کے نام پر تبصرہ نگاری یا سطحی قسم کی خیال آرائی ہی سامنے آتی رہے گی۔

اب پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کی خسرو شناسی پر توجہ دیں تو اس تعلق سے ان کی تنقیدی کتاب 'شاعری کی تنقید' میں شامل مضمون 'خسرو کی غزلیہ شاعری کی حرکیات' پر ارتکاز کرنا مفید رہے گا۔اس کتاب کے تنقیدی مباحثہ پر غور کریں تو اس میں قدیم وجدید تخلیقی متون کا تجزیہ ...لسانی، ہیئتی، صوتی، ساختیاتی، نفسیاتی، جمالیاتی، معنیاتی اور ماحولیاتی نظام کے اندر معنی خیز انداز سے کیا گیا ہے۔ ان میں روایتی انداز کی معنیاتی تشریح کے برعکس تخلیق کی توضیح میں اپنا خیال بھی شامل کیا گیا ہے جو کہ تجزیاتی عمل کی دلچسپ غمازی کرتا ہے۔جس کا اندازہ شامل کتاب مضامین کے عنوانات خسرو کی غزلیہ شاعری کی حرکیات، ولی دکنی کا شعری طریقِ کار، خواجہ میر درد ماورائے تصوف، غالب کا شعری لہجہ، ذوق کی غزل گوئی :ایک بازیافت، اردو غزل کی روایت میں اقبال کی انفرادیت، فراق کی غزل کے امتیازات، جدید تر غزل کی صورت حال سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ان مضامین کے مباحث اتنے اہم ہیں کہ ہر مضمون کا الگ الگ جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

ابتدا میں 'میرا تنقیدی موقف' میں اپنی تنقیدی کارگزاری کے اسلوب کی صراحت کرتے ہوئے قاسمی صاحب فرماتے ہیں:

''...کوئی تنقیدی رویہ میرے لیے اس وقت تک قابل قبول نہیں بن پایا جب تک شعری متن کے براہ راست مطالعے نے اس کی توثیق نہ کردی ہو۔ چناچہ میرے لیے تنقید نگار کا منصب بنیادی طور پر ایک ایسے باذوق قاری کا منصب ہے جو شاعرانہ تدبیر کاری سے باخبر ہونے کے باوجود شاعری کی بھرپور تفہیم، تحسین اور جمالیاتی قدر کے تعین کے عمل سے، سب سے پہلے گزرنا چاہتا ہے۔ اس موقعے پر مجھے اس تنقیدی طریق کار سے بے اطمینانی ظاہر میں کرنے کوئی تکلف نہیں، جس کا تعلق محض تنقیدی نظریات کے انطباق سے ہوتا ہے یا جس میں شعری متن سے حاصل ہونے والی توثیق سے ماورا ہوکر صرف تنقیدی پیمانوں کی کھتونی سے سروکار رکھا جاتا ہے۔''(ص: Viii)

ان تنقیدی تصریحات کے پیش نظر کتاب میں شامل مضمون 'خسرو کی غزلیہ شاعری کی حرکیات' پر نظر ڈالیں تو اس مضمون میں امیر خسرو کے غزلیہ کلام کی شعریات کے لسانی، صوتی اور استعاراتی نظام کے حرکیاتی رنگ و آہنگ کا معنی خیز اور دلچسپ تجزیہ پیش ہوا ہے۔ مضمون کی شروعات میں خسرو شناسی کے مطالعے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''...تاہم یہ مطالعے بھی خسرو کے فکری رویّے کی طرف بعض اشاروں سے آگے نہیں بڑھتے، اور خسرو کے پیرایۂ بیان اور شعری طریقِ کار کی تفہیم میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔''(ص 3)

اور اس کے بعد خسرو کی غزلیات کے تنقیدی عمل اور اپنی ترجیحات کا احاطہ یوں کیا گیا ہے:

''اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی شاعری کے بارے میں خسرو کے بیانات اور تنقیدی آرا کو درمیان میں حائل کیے بغیر ان کی غزلوں کے متن کا براہ راست سامنا کیا جائے اور اس متن کے وسیلے سے خسرو کے شعری طریقِ کار کو سمجھا جائے۔'' (ص 4)

خسرو کی غزل کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ''ان کی غزل اپنے پیرایۂ اظہار کے اعتبار سے فعالیت' حرکت اور محرک قوتوں کی کشمکش کا ایسا تاثر قائم کرتی ہے جس کی تشکیل میں استعارہ سازی' پیکر تراشی اور قول محال (Paradox) کی موجودگی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔''(ص 5)

خسرو کی غزل میں مستعمل استعارے کا روایتی استعمال معنوی یا تکرار کے طور پر کلیشہ نہیں بلکہ متحرک بن کر معنی آفرینی کے کئی در وا کرتا ہے تو خسرو کی استعارہ سازی کے حرکیاتی عمل کا مدلل احاطہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''خسرو کی شاعری میں جب استعارہ سازی کا عمل، معنی آفرینی کے ذریعے پیدا کیے گئے تنوع سے دوچار ہوتا ہے تو لغوی معنی' استعاراتی معنی اور مستعار منہ اور مستعار لہ کے مابین جو محرک قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں، دراصل وہی، خسرو کے استعاروں کی حرکیات کا تعین کرتی ہیں۔'' جیسے منتخبہ اشعار میں پہلے شعر کا تجزیہ دیکھیں:

همہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ امید آں کہ روزی بہ شکار خواہی آمد

''(یہ) شعر ظاہری معنی کے اعتبار سے شکار ہونے کی خواہش اور شکار کرنے کے عمل پر مبنی معلوم ہوتا ہے مگر غور کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ اشتیاق ملاقات کی شدید کیفیت، اس شعر میں خود سپردگی ہی نہیں بلکہ شوقِ شہادت کی حدوں کو پہنچی ہوئی ہے۔چنانچہ اس شعر کی محرک قوت شوقِ ملاقات بن جاتی ہے۔''(ص 7)

اس طرح کا تجزیہ نہ صرف شعر کی معنوی جہت کا ایک نیا پہلو سامنے لاتا ہے بلکہ قرات کو بھی نئی لطافت سے نوازتا ہے۔

خسرو کی شعری کائنات میں اسلوب شعر کے متنوع پہلو نظر آتے ہیں جو فکری و فنی بنیاد پر سوچ و فکر کے کئی در وا کرتے رہتے ہیں۔ان میں قولِ محال (Paradox) کی اصطلاح خاص طور پر شاعرانہ تدبیر کاری (Poetic Devices) میں اہم رول ادا کرتی ہے۔خسرو کے غزلیہ کلام پر ارتکاز کرتے ہوئے ان کی غزل میں قول محال کے فنی استعمال کو 'اجتماع النقیضین' یا 'تضاد کی حرکیات' قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ''خسروؔ قول محال کی تخلیق کرنے اور تضادات کو ابھارنے کی غرض سے ایک سے زیادہ شاعرانہ تدبیر کاری (Poetic Devices) کو روبہ عمل لاتے ہیں۔کبھی وہ لفظی تضاد کو ابھارتے ہیں' کبھی لغوی اور استعاراتی معنی کے تضاد کو نمایاں کرتے ہیں۔کبھی صورت حال کے تضاد سے قول محال کا تناؤ پیدا کرتے ہیں اور کبھی ایک سے زیادہ پیکروں کے درمیان پائے جانے والے تناقض کو آمنے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ اس قسم کے قول محال یا (Paradox) کی تمام صورتوں میں جو چیزیں ہمیں مشترک دکھائی دیتی ہیں، اس کو 'تضاد کی حرکیات' کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔''

مجموعی طور پر دیکھیں تو اس مقالے میں امیر خسرو کی غزل کی حرکیات کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے خسرو کی شاعرانہ تدبیر کاری، ڈکشن، امیج سازی، پیکر تراشی، استعارہ سازی وغیرہ پر فکرانگیز مکالمہ باندھا گیا ہے' جو نہ صرف خسرو شناسی کے باب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ خسرو کے کلام کی فکری اور معنوی جہات کی تفہیم و تعبیر کے نئے اکتشافات کے لیے دعوت فکر بھی دیتا ہے، کیونکہ بقول قاسمی صاحب:

''خسرو کی غزل کی یہی حرکیات (Dynamics) فارسی شاعروں کی بھیڑ میں ان کے امتیاز کی ضمانت ہے' اور خسرو کی یہی افتادِ طبع صوفی ہونے کے باوجود انھیں وحدۃ الوجودی انفعالیت سے دور رکھتی ہے اور اپنے ہم مشرب صوفیوں سے اس نوع کے تخاطب کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

اے صوفیانِ مست یکے رقص عاشقاں
تا ایں کبودِ کہنہ بساط شما کنیم''

(ص 12)

■

Dr. Reyaz Tawheedi
Wadipora Handwara
Kupwara - 193221 (Kashmir)
Mob.: 7006544358
Email.: drreyaztawheedi777@yahoo.com

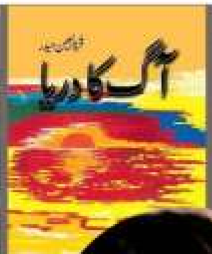

سیدہ نسیم سلطانہ

آزادی کے بعد نمائندہ خواتین ناول نگاروں کا تنقیدی جائزہ

آزادی سے قبل ہی خواتین ادب اور سماج میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی تھیں، ترقی پسند تحریک نے بھی خواتین کے قلم کو مزید استحکام بخشا۔ 1947 کا یہ وہ دور تھا جب ایک طرف جنگ آزادی کی فتح یابی و کامرانی کا جشن تھا تو دوسری طرف تقسیم ہند کے اندوہناک المیے کے نالوں کا شور بپا تھا۔ ان حالات نے خواتین ادیبوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا پھر تانیثیت کی کوکھ سے ایک نئے موضوع، ایک نئے مضمون اور ایک نئے اسلوب نے جنم لیا جس کے سبب نہ صرف ان کی تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھیں بلکہ ان کے لیے ادبی فن پارے و اسلوب نگارش کی جدید اور انفرادی راہیں بھی ہموار ہوئیں۔ تقسیم ہند کا المیہ ایک ایسا دردناک کرب تھا جس سے ہر فرد نفسیاتی الجھن کا شکار ہو چکا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کے سبب صدیوں سے ہندستانیوں کی روح میں رچی بسی گوتم و نانک اور چشتی کی تعلیمات کی چولیں ہل چکی تھیں گویا تقسیم ہند کا المیہ ایک تہذیب کے زوال کی داستان ہے جس میں امن و آشتی، اتحاد و اتفاق، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کے پرخچے اڑ چکے تھے، سرزمین ہند کشت و خون کی ہولی سے رنگین ہو چکی تھی، انسانیت شرم سار تھی، لوگ بے سروسامان ہو چکے تھے ان کی املاک تباہ و برباد ہو چکی تھی، بٹوارے میں خونی رشتوں کے بھی بٹوارے ہو چکے تھے، امرا و رؤسا کی اولادیں بھی نان شبینہ کے لیے محتاج تھیں، ایسے میں ادیبوں اور شاعروں نے اپنے دلی جذبات و احساسات کو تخلیق کے سینے میں اس طرح پیوست کر دیا کہ پڑھنے والوں کو ایسا لگے گا کہ یہ ابھی کی بات ہے گویا خود ان کی اپنی داستان الم ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کا ادیب رومانیت کی بھول بھلیوں سے نکل کر حقیقت نگاری کا اسیر بن چکا تھا۔ اس المیے نے حساس خواتین ادیبوں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ آزادی کے بعد کی خواتین ناول نگار نہ صرف مرد ناول نگاروں کی ہم پلہ ثابت ہوئیں بلکہ کچھ تو مرد ادیبوں سے بھی آگے نکل گئیں۔ انھوں نے تقسیم ہند کے درد و کرب کو اپنے ناولوں میں سمیٹ لیا۔

سرفہرست خواتین ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کا نام اولین اہمیت کا حامل ہے جو ترقی پسند تحریک سے کوسوں دور آزاد روش اختیار کیے ہوئے تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے میرے بھی صنم خانے، آگ کا دریا، سفینۂ غم دل، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم جیسے ناول لکھے۔ انھوں نے اپنے تقریباً ناولوں کے عنوان مقبول اشعار کے نصف مصرعے پر رکھے ہیں جس سے ان کی شعر فہمی اور شاعرانہ زبان و بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' اقبال کے اس شعر کے مصرعے کا ٹکڑا ہے۔

میرے بھی صنم خانے تیرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

یہ ناول صرف انیس سال کی عمر میں لکھا گیا جو 1949 میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع تقسیم ہند ہے۔ اس ناول میں شرفا اور اعلی طبقے کی بدحالی اور ان کے زوال کی روداد، فرقہ واری تعصب کے سبب بے گناہوں کے قتل عام کو موثر انداز میں پیش کیا ہے گویا مصنفہ نے ایک تہذیب کی دردناک موت کا المیہ بیان کیا ہے۔ قرۃ العین نے جاگیردارانہ، شرفا اور اعلی طبقے کو خود اپنی تباہی و بربادی کا ذمے دار ٹھہرایا، ان کا یہی نکتہ اس ناول کا نقطۂ عروج ہے۔ سفینۂ غم دل ان کا دوسرا ناول ہے جو 1952 میں شائع ہوا۔ اس ناول کے عنوان کو فیض احمد فیض کی نظم صبح آزادی کے اس شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غم دل

اس ناول میں تقسیم ہند کے بعد نامساعد حالات، تغیرات، امن و آشتی اور پرسکون زندگی گزارنے والوں کا نامعلوم سمت بکھر جانا، صراط مستقیم سے گمراہی اور مذہبی عدم رواداری کا شکار ہونے والوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کا تیسرا ناول 'آگ کا دریا' ہے جو 1959 میں شائع ہوا۔ اس ناول کا عنوان جگر مرادآبادی کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

'آگ کا دریا' قرۃ العین حیدر کا شاہ کار ناول ہے۔ اس ناول کے موضوع اور فنی محاسن کا اعتراف مختلف ناقدین نے کیا ہے۔ اس ناول کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ گویا لگتا ہے کہ اس ناول میں ہندوستانی تہذیب و تاریخ کے ڈھائی ہزار سال سمیٹ دیے گئے ہیں۔ اس ناول کا خاص نکتہ انسانی وجود ہے جس کا تعلق ہندوستانی کلچر اور تہذیب سے ہے، وہ ہندوستانی کلچر جو ڈھائی ہزار برسوں کا سفر طے کرنے کے بعد تقسیم ہند کے سبب تہذیبی بربادی اور انتشار کا شکار بنا۔ ان کا چوتھا ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' ہے جو 1979 میں شائع ہوا۔ اس ناول کا عنوان فیض احمد

فیض کے اس شعر کا ایک ٹکڑا ہے۔

آخرِ شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

اس ناول کا موضوع وقت کی بالادستی اور انسان کے خوابوں کی شکست ہے۔ قرۃ العین کا ناول 'کارِ جہاں دراز ہے' ان کا سوانحی ناول ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 1977 دوسرا حصہ 1979 میں شائع ہوا جب کہ جلد سوم 2003 میں 'شاہراہ حریر' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس ناول کے پیش لفظ میں قرۃ العین نے لکھا ہے۔

'کارِ جہاں دراز ہے' جلد سوئم کے ابواب 1993 سے 2000 تک مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے۔ یہ طویل کہانی 2000 تک پہنچی اور اب اسے بعنوان 'شاہراہ حریر' (کارِ جہاں دراز ہے، جلد سوئم) کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ 'حریر' کے معنی 'ریشم' کے ہیں اور شاہراہ یعنی کشادہ اور بڑی سڑک جو چار راستوں کو جوڑتی ہے۔ شاہراہ حریر دراصل چین کو مغرب سے منسلک کرنے والی شاہراہ ہے جس کے ذریعے تجارتی سرگرمیاں عمل میں لائی جاتی تھیں۔

اس ناول کا عنوان اقبال کے اس شعر کا حصہ ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

'گردشِ رنگ چمن' کی اشاعت 1988 میں عمل میں آئی۔ اس ناول کا عنوان غالب کے اس شعر کا مصرعہ ثانی ہے۔

عمر میری ہوگئی صرفِ بہارِ حسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

قرۃ العین حیدر کا یہ ناول 48 ابواب، ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ جس میں دو عنوانات حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کی کرامت 'اڑھائی دن کا جھونپڑا' بھی ہے۔ یہ ناول علمی، ادبی، سماجی اور مذہبی رواداری کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس ناول کا موضوع مسلم معاشرے کی عیش وعشرت کے سبب مسلم اقتدار کا زوال قدیم اور جدید روایات کی کشمکش سے متاثرہ زندگی ہے۔

'چاندنی بیگم' کی اشاعت 1990 میں عمل میں آئی۔ عنوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول چاندنی بیگم میں کسی چاندنی بیگم کی داستان بیان کی گئی ہوگی لیکن ایسا نہیں کہ چاندنی بیگم صرف کچھ دیر نمودار ہوکر موت کی آغوش میں گم ہوجاتی ہے۔ قرۃ العین نے چاندنی بیگم کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے جو گھور اندھیاروں میں اجالے بکھیرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں زبان سادہ، سلیس اور شاعرانہ معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں زبان دقیق بھی لگتی ہے تو کبھی کبھی مسلسل یکسانیت سے بوریت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس میں قصور ناول نگار کا نہیں کیونکہ وقت، حالات اور حادثات نے انھیں جو کچھ دیا تھا وہی واپس لوٹایا ہے۔ ان کے ناول پڑھ کر لگتا ہے کہ وقت اور حالات کی ستم ظریفی نے عام زندگیوں سے رومانی فضا اور حسن کاری چھین لی ہے۔

عصمت چغتائی: عصمت نے دس ناول لکھے ہیں۔ ان کا ناول 'معصومہ' آزادی کے بعد 1961 میں شائع ہوا۔ معصومہ مرکزی کردار ہے۔ اس ناول میں فلمی دنیا کے حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ ناول 'سودائی' 1964 میں شائع ہوا۔ ناول لکھنے سے قبل یہ کہانی 'بزدل' کے نام سے فلمائی جاچکی تھی، اس فلم کا موضوع بھی فلمی دنیا ہے۔ ناول 'عجیب آدمی' ان کی وفات کے بعد 1992 میں منظر عام پر آیا اس ناول کا موضوع بھی فلمی دنیا ہے، جس میں فلمی دنیا سے وابستہ افراد کی فلمی و نجی زندگی کے نشیب و فراز کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ ناول 'ایک قطرۂ خون' کی اشاعت 1976 میں عمل میں آئی۔ عصمت نے اس ناول کو میر انیس کے نام معنون کیا ہے۔ یہ ناول حضرت امام حسین سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔ 'دل کی دنیا' عصمت کا یہ ناول نسائی حسیت کا نمائندہ کہلایا جاسکتا ہے۔ اس ناول پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ اس ناول کا موضوع سماج کی فرسودہ روایات کی بھینٹ چڑھی ایک مظلوم عورت کی کہانی ہے جو اپنے بلند حوصلوں سے حالات کا رخ موڑ دیتی ہے۔ خواتین ناول نگاروں میں عصمت کو جنسیات اور نفسیات کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام اپنی تصنیف 'عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول' میں لکھتے ہیں:

''یوں تو اہم کرداروں کی نفسیات کی جانب اشارے ہر اچھے ناول میں نظر آتے ہیں، مگر عصمت چغتائی نے سارا زور کردار کی نفسیات ہی پر دیا ہے۔''

انسانی نفسیات کی کشمکش عصمت کے تقریباً بیشتر ناولوں میں نظر آتی ہے۔ ایک بات جو عصمت چغتائی کو منفرد بناتی ہے وہ ہے ان کا اسلوب نگارش خواہ کہانی کا پلاٹ کردار کوئی بھی ہو، نقطۂ عروج اور انجام کچھ بھی ہو لیکن زبان و بیان کی سلاست و فصاحت، روانی اور واقعات و حالات کو پیش کشی کا ہنر کوئی عصمت سے سیکھے۔

جیلانی بانو: بنیادی طور پر جیلانی بانو افسانہ نگار ہیں لیکن بحیثیت ناول نگار انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ انھوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں تب بھی آزادی کے بعد کی نمائندہ خواتین ناول نگاروں کی صف میں ان کا نام شمار کیا جانا چاہیے۔ جیلانی بانو کا پہلا ناول 'ایوانِ غزل' 1976 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد، سیاسی، سماجی اور تہذیبی وثقافتی حالات کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کا دوسرا ناول 'بارش سنگ' 1984 میں کراچی اور 1985 میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع ریاست تلنگانہ کی کسان تحریک ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ جیلانی بانو ایک مقبول ادیبہ ہیں لیکن جب ہم ان کے ناول اور افسانوں کو بغور پڑھتے ہیں تو کہیں کہیں خلا محسوس ہوتا ہے۔ ایک نامعلوم سی تشنگی پائی جاتی ہے۔

خدیجہ مستور: خدیجہ مستور کے دو ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا ناول 1962 میں شائع ہوا۔ اس شاہکار ناول کا موضوع تقسیم ہند ہے۔ یہ ناول گھر آنگن کے مسائل سے ہند وپاک کے آنگن کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرا ناول 'زمین' ان کی وفات کے بعد 1983 میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع زمین ہے جس کے لیے جھگڑے، فسادات، قتل وغارت گری عام بات ہوتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کے دونوں ناول کامیاب قرار دیے جاسکتے ہیں اور ناول کی فنی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

رفیعہ منظور الامین: رفیعہ منظور الامین حیدرآباد دکن کی مایہ ناز ادیبہ ہیں۔ ان کے تین ناول شائع ہوچکے ہیں۔ بنیادی طور پر رفیعہ بھی افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے ناول بھی بے حد مقبول رہے۔ رفیعہ منظور الامین کا شاہکار ناول 'عالم پناہ' ہے جس میں حیدرآبادی تہذیب کو دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر رفیعہ منظور الامین نے 'عالم پناہ' کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھا ہوتا تب بھی ان کی بقائے دوام کے لیے ناول 'عالم پناہ' ہی کافی ہے۔ یہ ناول حیدرآبادی تہذیب و ثقافت کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ جب میں نے رفیعہ منظور الامین کے شوہر نامدار منظور الامین صاحب سے ایک انٹرویو میں سوال کیا کہ رفیعہ نے 'عالم پناہ' میں جس تہذیب کی عکاسی کی ہے کیا وہ ان کے ذہن کی اختراع ہے؟ یا انھوں نے کتابوں سے اس تہذیب کا مرقع کھینچا؟ یا حقیقت میں وہ اسی تہذیب کی پروردہ ہیں یعنی جس وقت ناول 'عالم پناہ' لکھا جارہا تھا اس وقت پیش کی گئی تہذیب اسی طرح زندہ و تابندہ تھی؟ موصوف نے جواب دیا کہ رفیعہ جس تہذیب میں پلی بڑھی تھی اسی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ 1994 میں ڈی ڈی نیشنل پر اس ناول پر مبنی ٹی وی سیریل 'فرمان' پیش کیا گیا تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس وقت شہر حیدرآباد کے محلے سنسان ہوجاتے اور سارا کنبہ بیٹھ کر پورے انہماک کے ساتھ دیکھتا اور اگلے ایپی سوڈ کے لیے بے چین رہتا۔ رفیعہ منظور الامین کے تین ناول ہیں۔ پہلا ناول 'سارے

جہاں کا درد' 1974 میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول 'عالم پناہ' کی اشاعت 1983 میں عمل میں آئی اور تیسرا ناول 'یہ راستے' 1995 میں منظر عام پر آیا۔

صالحہ عابد حسین: صالحہ عابد حسین نے 9 ناول لکھے، جن میں عذرا 1947، آتش خاموش 1953، راہ عمل 1963، قطرہ سے گہر ہونے تک 1957، یادوں کے چراغ 1966، اپنی اپنی صلیب 1972، الجھی ڈور 1972، گوری سوئے سیج پر 1978 اور ساتواں آنگن 1984 شامل ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے ناول مقصدیت، معاشرت، عورت اور تقسیم ہند کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر صالحہ عابد حسین ایک ایسی ناول نگار ہیں جنھوں نے مخصوص تجربات و رجحانات کی ترجمانی کی ہے۔ زندگی کے ایسے بہت سے تجربات جو ان کی ذاتی زندگی کا حصہ ہیں ان کے ناولوں میں تواتر کے ساتھ پیش ہوتے ہیں وہیں غیر ضروری طوالت کے سبب ان کے ناولوں سے بوریت کا احساس بھی ہوتا ہے اور قاری کی توجہ برقرار نہیں رہتی۔ ان میں ایسی کوئی بات نہیں کہ ایک بار ناول ہاتھ میں لیا جائے تو اختتام تک قاری محور ہے۔

آمنہ ابوالحسن: آمنہ ابوالحسن حیدر آباد دکن کا ایک معتبر نام ہے جنھیں اپنے عہد میں بہت پڑھا جاتا رہا۔ بالترتیب ان کے ناولوں کی اشاعت 'سیاہ سرخ سفید' (1968)، 'تم کون ہو' (1974)، 'واپسی' (1981)، 'آواز' (1985)، 'پلس مائی نس' (1987) اور 'یادش بخیر' (1994) میں عمل میں آئی۔ آمنہ ابوالحسن کے ناولوں کا خاصہ رومانیت اور معاشرت ہے۔ کہیں کہیں قدیم اور جدید تہذیبوں کا تصادم بھی نظر آتا ہے، زبان سلیس، رواں اور الفاظ اچھوتے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان کی ناولوں کے چند ہی پنے پڑھے ہیں جس کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمام ناول دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں۔ صد افسوس کہ ان کے فن کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ آمنہ ابوالحسن پر مجھے چند ہی مضامین نظر آتے ہیں وہ بھی تحقیقی اور تنقیدی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان پر مزید تحقیقی اور تنقیدی کام ہونا باقی ہے۔

شہر حیدر آباد دکن کی ایک اور مشہور خاتون ناول نگار عفت موہانی (سیدہ خورشید سلطانہ) بھی ہیں جو مقبول عام شاعر حسرت موہانی کی پوتی ہیں۔ ان کے ناول 'کرنوں کی مہک' (1990)، فاصلے اور منزلیں (1990)، لبنیٰ (1990)، ملن کے سپنے، خواب تمنا، ہار جیت وغیرہ ہیں۔ حقانی القاسمی اپنے مضمون 'اناؤ کا تخلیقی الاؤ' میں لکھتے ہیں:

''اردو فکشن کے منظر نامے میں عفت موہانی کا نام بہت نمایاں ہے۔ بالخصوص خواتین ناول نگاروں میں ان کا مقام بلند ہے۔ خطہ یونان (موہان) سے ان کا وطنی رشتہ تھا مگر ساری عمر حیدر آباد میں گزری۔ عثمانیہ سے ایم اے کیا۔ ان کے زیادہ تر ناول نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ ان کے مشہور ناولوں میں اگنی برہا، چبھن، ہار جیت، خواب تمنا، ملن کے سپنے، نغمہ سنگ، رستہ پھولوں کا، تشنہ کام ہیں۔ ان کے بیشتر ناول معاشرتی اور رومانی ہیں۔ سماجی نفسیات پر عفت موہانی کی نظر گہری تھی اسی لیے سماجی رویوں اور رشتوں کے حوالے سے انھوں نے ناول لکھے۔ عفت موہانی 1925 میں پیدا ہوئی تھیں اور 16/نومبر 2005 کو ان کا انتقال ہوگیا۔''

عفت موہانی اور آمنہ ابوالحسن کا عہد میری کمسنی کا دور تھا۔ مجھے یاد آتا ہے اس وقت بچوں کو ناول پڑھنے سے باز رکھا جاتا تھا اسی لیے 'یادش بخیر' اور 'ہار جیت' وغیرہ کو گھر کے بڑے، بزرگ گدے کے نیچے چھپا کر جایا کرتے تھے لیکن میں چھپ کر دیکھ لیتی اور دوپہر میں

> آمنہ ابوالحسن کے ناولوں کا خاصہ رومانیت اور معاشرت ہے۔ کہیں کہیں قدیم اور جدید تہذیبوں کا تصادم بھی نظر آتا ہے۔ زبان سلیس، رواں اور الفاظ اچھوتے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان کی ناولوں کے چند ہی پنے پڑھے ہیں جس کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمام ناول دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں۔

جب سب قیلولہ فرماتے چھپ کر ان ناولوں کے کچھ صفحات پڑھ لیتی۔ ریختہ پر عفت کی تمام تصانیف مل جائیں گی لیکن تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے عفت موہانی پر بھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ نمائندہ خواتین ناول نگاروں کا سفر یہیں ختم نہیں ہوتا ان کی تخلیقات پر مدلل اور مفصل تجزیہ ضروری ہے۔ جب میں نے تحقیقی اور تنقیدی حوالہ جات کے لیے مختلف کتابوں اور نامور تحقیقی رسالوں میں شائع مضامین کا مطالعہ کیا تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ اکثر نے ناولوں کی تاریخ اور کرداروں کے حوالے سے بات کی ہے۔ ممتاز اسکالز کے برائے نام تحقیقی مضامین بھی پڑھے جس میں بظاہر عنوان کچھ اور ہوتا ہے اور پیش کیا جانے والا مواد کچھ اور تقریباً ہر لکھنے والے کی تحریر میں یہی پایا کہ موضوع سے پرے دو تین صفحات پر مصنفہ کے سوانحی حالات ہی رقم کیے گئے ہیں اور کچھ نے تو بس چربہ اتارا ہے تنقید و تحقیق تو درکنار الفاظ اور جملوں کی ساخت تک نہیں بدلی گئی۔

ماخذ

رفیعہ منظور الامین: عالم پناہ، 1983
عصمت چغتائی: ایک قطرۂ خون، 1976
عصمت چغتائی کی ناول نگاری: شبنم رضوی، 1992
عصمت چغتائی: سودائی، 1992
عصمت چغتائی: عجیب آدمی، 1992
خدیجہ مستور: آنگن، 1984
خدیجہ مستور: زمین، 1995
ڈاکٹر اشتیاق عالم اعظمی: خدیجہ مستور کی ناول نگاری پر ایک نظر، 2012
قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید فن: پروفیسر عبدالسلام، 1983
ہندوپاک کی خواتین ناول نگار: ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک، 2008
آزادی کے بعد اردو ناول ڈاکٹر ممتاز احمد خاں 1997، انجمن ترقی اردو پاکستان
اردو کی خواتین ناول نگار: ڈاکٹر سلطانہ خوشنود جبیں، 2009، ارم پرنٹرس پٹنہ
اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار: نیلم فرزانہ 1992
قرۃ العین حیدر تحریروں کے آئینے میں: ڈاکٹر اختر سلطانہ، 2005
قرۃ العین حیدر: میرے بھی صنم خانے، 2004
قرۃ العین حیدر: سفینۂ غم دل، 1969
قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا: پہلا ہندوستانی قانونی ایڈیشن، 1989
قرۃ العین حیدر: آخر شب کے ہمسفر، 1979
قرۃ العین حیدر: کار جہاں دراز ہے، 1977
قرۃ العین حیدر: گردش رنگ چمن، 1988
چاندنی بیگم: قرۃ العین حیدر 1990
قرۃ العین حیدر: شاہ راہ حریر 2008
عصمت چغتائی: کلیات عصمت چغتائی، 2002
پروفیسر عبدالسلام: عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول، 1989
جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ: مشرف علی 2003
جیلانی بانو: ایوان غزل، 1976
جیلانی بانو: بارش سنگ، 1985
ڈاکٹر کہکشاں پروین: صالحہ عابد حسین بحیثیت ناول نگار، 1991
ماہنامہ کتاب نما خصوصی شمارہ: صالحہ عابد حسین نمبر 2012
آمنہ ابوالحسن: تم کون ہو، 1974
آمنہ ابوالحسن: یادش بخیر، 1994
آمنہ ابوالحسن: واپسی، 1981
آمنہ ابوالحسن: سیاہ سرخ سفید، 1968

■

Dr. Syeda Naseem Sultana
Asst Prof. Dept of Urdu
Usmania University
Hyderabad - 500007 (Telangana)
Mob.: 8466807997

شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن کی تصنیف 'مرآۃ الشعر' کا معروضی مطالعہ

جسیم الدین

جدید ادب میں قدیم مشرقی تنقید کے اصول کی اہمیت تسلیم شدہ ہے، کیونکہ جدید ادبیات کے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں، مشرقی تنقید سے مراد وہ پیمانے ہیں جو عربی وفارسی ادب کے ناقدین نے شعر کے حسن وقبح کو پرکھنے کے لیے وضع کیے تھے۔

عربی وفارسی شعریات کی تنقید میں حالی، شبلی اور حسین ازاد کے بعد ایک بڑا نام شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن کا ہے، جنھوں نے 'مرآۃ الشعر' نامی کتاب میں عربی شعریات پر تنقیدی بحث کی ہے۔ تنقیدی مباحث کو مولانا عبدالرحمٰن نے مدلل طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مسائل کو بیان کرتے وقت اپنے نظریات بھی سامنے رکھے ہیں، جس سے مولانا کے تنقیدی شعور پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ 'مرآۃ الشعر' دراصل اس قدیم سرمایے کی ایک اہم کڑی ہے، جس میں مشرقی شعریات کے پیش نظر مباحث ومسائل بیان کیے گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں جب اردو کے زیادہ تر نقاد مغربی تنقید کی جانب متوجہ نظر آتے ہیں، مولانا عبدالرحمٰن نے ادب میں خالص مشرقی تنقید کے اصولوں کو برتنے کا مشورہ دیا۔ مصنف نے تنقیدی مسائل کی وضاحت کے لیے متنفن کاروں کی آرا کو مدنظر رکھا ہے، نیز عربی، فارسی اور اردو اشعار کو استدلال کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس زمانے میں اس طرح کی کاوش اور کوشش مشرقی تنقید کے مطالعے کے لیے اولین کوشش ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد جعفر احراری ''شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن نے 1923 میں عربی شعریات پر کچھ ایڈیشنل یونیورسٹی لکچرز دیے، جو 1925 میں اصل اضافہ کے ساتھ 'مرآۃ الشعر' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ کتاب کے اندر صرف مشرقی شعریات سے متعلق مباحث ومسائل کو ہی نہیں بیان کیا گیا ہے، بلکہ مصنف نے خود اس پر اپنا تنقیدی محاکمہ بھی پیش کیا ہے۔''

(مشرقی معیار نقد اور مرآۃ الشعر، ڈاکٹر محمد جعفر احراری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 2، ص 16)

'مرآۃ الشعر' کے بارے میں مصنف نے خود ہی اس کی تصریح کی ہے کہ محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی کی تنقیدی کتابوں کے بعد لکھی گئی، ملاحظہ فرمائیں:

''اردو زبان میں یہ پہلی کتاب نہیں، بعض اکابر وحضرات سبقت فرما چکے ہیں، جن میں سے بعض نے اگر مجتہدانہ تحقیق وتنقید کو نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے تو بعض نے بہ اضافہ وتصرف بعض انگریزی تصانیف کا ترجمہ کیا، یا تقلید کے لیے، ان سے چربہ لیا ہے۔''

(مرآۃ الشعر، عبدالرحمٰن، اتر پردیش اردو اکادمی، 1978، ص 4)

مولوی عبدالرحمٰن نے 'مرآۃ الشعر' میں عربی کی تنقید کی روایت کے اہم مسائل شعر، الفاظ، مجاز، معانی، جدت، خیال، تخیل، جدت ادا، فکر، وصف اور حسن ادا کے عنوان کے تحت بیان کیے ہیں۔ شعر کے متعلق ایک طویل بحث چھیڑی ہے اور اسے مشرقی انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، کتاب میں افادیت کا پہلو غالب ہے، لیکن وہ کسی مسئلے کی وضاحت کے لیے ایسا پیرایۂ اظہار استعمال کرتے ہیں جو طبیعت پر گراں گزرتا ہے، جا بجا منطقی اصطلاحات کی وجہ سے عبارت میں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے، مثلاً کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے حد، رسم جنس، فصل، معرف، قیاس شعری، نوع عالی، نوع سافل، جسم نامی، عکس مستوی اور عکس نقیض جیسی اصطلاحات استعمال کیے ہیں۔

مولوی عبدالرحمٰن شاعری کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ 'وان من الشعر لحکمۃ' کی توضیح اس طرح کرتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ ہر شعر حکمت نہیں، اکثر حکایت اور بیشتر غوایت ہے، مگر بیان بیان میں بھی فرق ہے، ہزار باتوں میں ایک بات ہوتی ہے، باقی سب ہوتی خرافات۔'' (ایضاً)

شعر اگرچہ پست ہو، پھر بھی وہ مولانا عبدالرحمٰن کے نزدیک نثر سے بالاتر ہے، شعر ان کے نزدیک موتیوں کا ہار اور نثر کنکروں کا انبار ہے۔ شعر کی تاثیر شمشیر وسناں سے بھی زیادہ ہے۔ عبدالرحمان نے شعر کی پانچ تعریفیں کی ہیں، ہم آگے چل کر ان کا جائزہ لیں گے کہ کون سی تعریف ان کے نزدیک سب سے زیادہ موزوں ہے، لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ وہ شعر جس میں وزن نہ ہو، مصنف کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ کتاب میں وزن کے متعلق ایک بحث کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شعر میں وزن ہر دور میں ضروری رہا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی مغرب سے متاثر ہوکر کچھ ایسا ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں:

''شعر کے لیے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیے بول، جس طرح راگ فی حد ذاتہ الفاظ کا محتاج نہیں، اسی طرح نفس شعر وزن کا محتاج نہیں، اس موقع پر جیسے انگریزی میں دو لفظ مستعمل ہیں، ایک پوئٹری اور دوسرا ورس، اسی طرح ہمارے یہاں بھی دو لفظ استعمال میں آتے ہیں، ایک شعر اور دوسرا نظم اور جس طرح ان کے یہاں وزن کی شرط پوئٹری کے لیے نہیں، بلکہ ورس کے لیے ہے، اسی طرح ہمارے یہاں بھی یہ شرط شعر میں نہیں، بلکہ نظم میں معتبر ہونی چاہیے۔''

(مقدمہ شعروشاعری، الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، 1980، ص 43)

اس نظریے کی تردید میں مولوی عبدالرحمٰن نے مختلف اقوال وآرا کو استدلال کے طور پر بیان کیا ہے۔ نیز اپنا خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جو حضرات عربی، فارسی، اردو کی قدیم شاعری کو مغربی پوئٹری کے پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں، وہ نہیں سوچتے کہ جب تک مشرق ومغرب ایک نہ ہو جائیں، ان کی اصطلاحات اور مصداق اصطلاحات کو بھی ایک ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔''

(مرآۃ الشعر، عبدالرحمٰن، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1978، ص 14)

مولوی عبدالرحمٰن نے مولانا حالی کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آدمی نے اول بولنا سیکھا، پہلے لفظ اس کی زبان پر آیا اور پھر گانا گایا، اس حیثیت سے راگ بول کا محتاج ہے، جو بول نہیں سکتا، وہ گا بھی نہیں سکتا، ہاں بغیر ترنم اور گانے کے بول سکتا ہے۔ اس حالت میں یہ مقدمہ ہی غلط اور بالکل غلط ہے کہ راگ فی حد ذاتہ بول کا محتاج نہیں ہے، دوسری ترتیب ہے اصطلاح اور فن کی۔ وہی یہاں زیر بحث ہے، اس میں لے اور ترنم مقدم ہے اور لفظ مؤخر، اس حیثیت سے راگ بول کا محتاج نہیں ہے، اس لیے کہ وزن اور بول دونوں کو الگ الگ قائم بالذات فرض کر لیا گیا ہے، حالانکہ بول، لفظ اور وزن کے مجموعے کا نام ہے، یعنی دو مجموعہ ہوتا ہے، ایسے الفاظ کا جن کی ترتیب میں لے ہوتا کہ راگ میں آسکیں، اسی خصوصیت کو اصطلاح میں وزن کہتے ہیں، جب بول موزوں ٹھہرا خواہ کسی حیثیت سے ہو، تو اب وہ نظم ہے، یعنی صورت کی نوع عالی ہے اور راگ نوع سافل ہے اور نوع سافل کا نوع عالی کے تحت پایا جانا لازمی ہوتا ہے ولا عکس۔''

(ایضاً، ص 16)

مولانا عبدالرحمٰن قافیے کو شعر کی لفظی خصوصیت سمجھتے ہیں۔ لیکن شعر میں اسے اتنا ضروری نہیں قرار دیتے کیوں کہ قدما کی کتابوں میں شعر بلا قافیے کی مثالیں ملتی ہیں، حتیٰ کہ اہل عروض بھی شعر بلا قافیے کی صحت سے متفق ہیں۔ عربی شاعری میں شعر بلا قافیے کی مثال مولوی عبدالرحمٰن نے ابونواس کے اشعار سے دی ہے، لیکن اپنا خیال بھی پیش کیا ہے کہ عربی شاعری میں شعر بلا قافیہ نہ تھا اور نہ ہی عربی شاعر ابونواس نے شعر بلا قافیہ کہا، بلکہ اس نے امین بن ہارون رشید کے حکم کی بجا آوری کے لیے فی البدیہہ اشعار کہے تھے۔

ڈاکٹر محمد جعفر احراری کے بقول اردو شاعری میں نظم بلا قافیہ کے متعلق مولوی عبدالرحمٰن کا خیال ہے کہ بہت دنوں سے اردو شاعری میں بلینک ورس (نظم بلا قافیہ) کی روایت چلی آ رہی ہے، لیکن اس طرح کی تخلیقات تقریباً نہیں کے برابر ہیں۔ تھوڑی مدت میں ہی نظم بلا قافیے کی وقعت نظروں سے گر گئی۔ مولوی عبدالرحمٰن کے یہاں جن لوگوں نے اس صنف کو اپنا میدان بنایا، ان میں یا تو شاعری کی اہلیت نہیں تھی یا وہ کلام میں دلکشی اور جاذبیت نہ پیدا کر سکے اور اگر اہل کمال تھے تو جب انھوں نے اپنے مقفّیٰ اور غیر مقفّیٰ کلام کا موازنہ کیا تو غیر مقفّیٰ کلام کو ہلکا پایا، چنانچہ دوبارہ کبھی شعر غیر مقفّیٰ کہنے کا نام نہ لیا۔ گویا مصنف شعر میں قافیہ کے التزام کو ضروری تو نہیں قرار دیتے لیکن شعر میں قافیے کی برتری کے بہر حال قائل ہیں۔

(مشرقی معیار نقد اور مرآۃ الشعر، ڈاکٹر محمد جعفر احراری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 2، ص 59)

مولوی عبدالرحمٰن کے نزدیک شعر لفظاً شعور سے مشتق ہے، اور معناً بھی شعور کا نتیجہ ہے، اور شعور کا تعلق قلب سے ہے، اسی لیے شاعری میں واردات قلبی کا ذکر ہوتا ہے، یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شعر ہمیشہ شعور کے تابع ہو کر آتا ہے، شعر اسی وقت شعر ہے، جب اس پر شعور کا رنگ واثر غالب رہے، اسے اپنی اصل اور حقیقت سے دور نہیں ہونا چاہیے، جو کلام لفظی ومعنوی خوبیوں سے مرکب ہو، خود کمال شعور سے پیدا ہوا ہو، نیز سامعین میں شعور واحساس اور جذبات کو جنم دے، وہ شعر ہے اور اس لیے شعر کی اصل شعور ہے، مصنف نے شعر کا تعلق قلب سے جوڑ کر ایک نئی بات پیدا کی ہے، جو رجحان غالباً اس وقت کے مشرقی ناقدین کے یہاں نہیں ملتا، جہاں تک شعر میں الفاظ ومعانی کی ترجیح کا سوال ہے تو مولانا عبدالرحمٰن نے دونوں طرح کے لوگوں کے نظریات کا ذکر کیا ہے، متنبّی اور ابن الرومی کا ذکر کرتے ہوئے ان کا نظریہ پیش کیا ہے کہ وہ معانی کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن مولانا عبدالرحمٰن خود اس نظریے سے متفق نہیں، بلکہ وہ الفاظ کو معانی پر ترجیح دینے کے قائل ہیں، اپنے خیال کی تائید میں دوسرے فن کاروں کے نظریات کو استدلال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ خاص طور سے ترجیح الفاظ ومعانی کے باب میں ابن رشیق کے خیال کو بیان کرتے ہیں، جن کے نزدیک الفاظ معانی پر اس لیے مقدم ہیں کہ خیال سب کے پاس ہوتا ہے اور معانی کے اعتبار سے چاہے وہ عالم ہو یا عامی سب برابر ہیں۔ البتہ جو چیز معانی اور خیال کو شعریت میں تبدیل کرتی ہے وہ الفاظ کی شان وشوکت، ندرت، جودت اور بیان کی سلاست ومتانت ہے۔ شعر کی تنقید ہمیشہ الفاظ کے متعلق ہوتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کے نزدیک فن کاروں نے معنی آفرینی کی تین قسمیں کی ہیں، ابداع، اختراع، اور تولید۔ تولید کا معنی ہے پیدا کرنا، اختراع عام طور پر کلام میں عمدہ استعارہ یا نئی تشبیہ لانے کو کہتے ہیں۔ اور ابداع کلام میں نئی بات اور اچھوتے معنی پیدا کرنے کو کہتے ہیں، اسی طرح کلام میں کسی باندھے ہوئے مضمون کو نئے انداز سے باندھنا، یا فرسودہ اور پامال راستے کو چھوڑ کر نیا راستہ نکالنے کو جدت ادا کہتے ہیں۔ جمہور کے یہاں جدت ادا اور معنی آفرینی دونوں میں تھوڑا سا فرق بتایا ہے، مولوی صاحب کے یہاں معنی آفرینی ابداعی معنی کی قبیل سے ہے اور جدت ادا کا تعلق جس میں استعارے کی کارفرمائیاں بھی ہوتی ہیں اختراعی معنی سے ہے۔

شعر مولانا عبدالرحمٰن کی نظر میں:

''مولانا عبدالرحمٰن نے شعر کو بیان کی قسموں میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ بیان کی دو قسمیں ہیں: نثر اور نظم۔ نظم، نثر کے مقابلے میں اعلیٰ وافضل ہوتی اور شعر کہلاتی ہے۔ مولانا کے نزدیک تعریف میں اکثر اختلاف ہوتا ہے، کیونکہ ایک کسی عارض کو اہم خیال کرتا ہے، اور دوسرا کسی کو، چنانچہ مختلف زبانوں اور زمانوں میں شعر کی تعریف میں اختلاف ضروری تھا اگر نہ ہوتا تو حیرت کی بات تھی، اس کے باوجود مولانا کے یہاں عربی، فارسی اور اردو شعر کی تعریف میں مشابہت ہے، کیوں کہ عربی شاعری اصل ہے اور فارسی شاعری عربی شاعری کا دودھ پی کر پلی اور پروان چڑھی ہے اور اردو شعر زیادہ تر فارسی شاعری سے ماخوذ ہے اس طرح تینوں زبانوں کی شاعری میں بہت حد تک مشابہت ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ اگر صرف عربی شعر کی تعریف کر دی جائے اور بقیہ دونوں زبانوں کے شعر کو عربی پر قیاس کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نے شعر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں:

پہلی قسم: موزوں ومقفّیٰ کلام جو عکس جذبات ہونے کے ساتھ ساتھ حسن زبان وبیان کا مجموعہ ہو۔ دوسری قسم: جس میں ایجاد معانی اور اختراع خیالی ہو، تیسری قسم: وہ کلام موزوں ومقفّیٰ جو مقدمات موہوم پر مشتمل ہو اور ان کی ترتیب سے نتائج غیر واقعی پیدا ہو، اس طور پر کہ وہم کو حقیقت، حقیقت کو وہم کر دکھائے، چوتھی قسم: محض خیالی یا اختراعی معانی ہی شعر ہے، اس میں وزن اور قافیہ کی شرط ضروری نہیں۔ پانچویں قسم: شعر وہ موزوں کلام ہے جو عرب کی متداول بحور میں واقع ہو اور ارادۃً کہا گیا ہو۔

مولانا عبدالرحمٰن نے شعر کی مختلف تعریفات کے زمانوں کو بھی بیان کیا ہے۔ پہلی تعریف سب سے قدیم ہے اور جمہور کے مسلک کے مطابق ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن بھی شعر کی اسی تعریف سے متفق ہیں۔ دوسری تعریف تقریباً دوسری صدی ہجری کے نصف آخر کی پیداوار ہے، جب کہ عرب متمدن ہو چکے تھے۔ تیسری تعریف کا آغاز تو تیسری صدی ہجری کی ابتدا سے پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن چوتھی صدی تک اس میں باقاعدگی آئی۔ چوتھی تعریف جدید زمانے کی اور پانچویں تعریف عروضیوں کی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن شعر کی دوسری اور تیسری تعریف کو ناقص

بتاتے ہیں۔

شعر کی تیسری تعریف غالباً ارسطو کے نظریے کے مطابق ہے اور منطقی کتابوں میں مذکور ہے، جہاں تک شعر کی چوتھی تعریف کا سوال ہے وہ مسلک جدید ہے، جس میں مصنف کو اتفاق نہیں۔ پانچویں تعریف عروضیوں کی ہے، اگر مصنف نے اس تعریف کو ترجیح نہیں دی ہے تو تردید بھی نہیں کی ہے۔ مصنف نے شعر کے نئے مسلک کی تحقیق میں ایک طویل بحث چھیڑی ہے، مخالفین کی جانب سے شعر میں وزن اور قافیہ ضروری نہ ہونے پر دلیلیں پیش کی ہیں، مثلاً: 'الشعر شیء تجیش به صدورنا فتقذفه علی ألسنتنا' (شعر وہ ہے جو ہمارے سینوں سے جوش مار کر اٹھتا ہے اور زبانوں پر جاری ہوتا ہے) اس مثال میں یقیناً وزن اور قافیے کا ذکر نہیں ہے، لیکن کیا ان سے شعر میں وزن اور قافیے کے عدم اشتراط کا ثبوت بھی ملتا ہے؟ ایسا نہیں ہے کیوں کہ یہ مثال شعر کی تعریف کے متعلق نہیں ہے، بلکہ اچھے شعر کی خوبی کے بارے میں ہے، اس لیے وزن وقافیے کے باب میں اس کا ذکر بے معنی سا لگتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نے شعر میں وزن اور قافیے کے التزام میں مختلف اقوال اور نظریات پیش کیے ہیں اور انھوں نے جاہلی شاعر امرؤالقیس کے ایک شعر سے قافیے کو شعر سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے یہ بھی کہا ہے کہ: ''ایک امرؤالقیس ہی پر کیا منحصر ہے سلف سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی عربی کا شاعر ہوا ہوگا جس نے شعر کو قافیے سے تعبیر نہ کیا ہو''۔ مصنف شعر میں قافیہ کو وزن کا جزو متمم سمجھتے ، اسی لیے کہتے ہیں: 'الشعر کلام عقد بالقوافی' شعر وہ کلام ہے جو قوافی کے ساتھ ہو، یا 'بنیة الشعر أربعة آ شیاء': اللفظ، والوزن، المعنی، القافیة فھذا ھو الحد' شعر کی بنیاد چار چیزوں پر ہے: لفظ، وزن، معنی اور قافیہ۔ یہی شعر کی مکمل تعریف ہے۔ قدامہ بن جعفر، ابوہلال عسکری اور ابن رشیق قیروانی نے شعر کی یہی تعریف کی ہے۔ 'لا یسمی شعراً حتی یکون له وزن وقافیة' کلام شعر ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس میں وزن اور قافیہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں شعر میں وزن اور قافیے کو ضروری نہ سمجھنا اور اسے بعض عروضیوں کی شرط قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔

میرے نزدیک وزن اور قافیہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، جب کہ مولانا عبدالرحمٰن کی دلیلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہیں یا لازم ملزوم۔ جہاں تک شعر کو قافیے سے تعبیر کرنے کا مسئلہ ہے، اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قافیہ ہی شعر ہے، یا شعر میں قافیہ کے ذکر سے وزن خود آ گیا۔ مولانا عبدالرحمٰن کی دلیلوں کے جواب میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ سلف سے لے کر آج تک جس عربی شاعر نے شعر کو قافیے سے تعبیر کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شعر جزوی طور پر قافیہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، کیوں کہ اس سے شعر میں موزونیت پیدا ہوتی ہے۔ 'الشعر کلام عقد بالقوافی' سے شعر کی تعریف کرنا ناقص ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن کی دلیل اس وقت اور بھی کمزور معلوم ہوتی ہے جب وہ ابن رشیق کے حوالے سے شعر کی مکمل تعریف کرتے ہیں اور اس میں قافیہ اور وزن کو الگ الگ بیان کرتے ہیں:

'بنیة الشعر أربعة آ شیاء': اللفظ، والوزن، المعنی، القافیة فھذا ھو الحد' یا 'لا یسمی شعراً حتی یکون له وزن وقافیة'۔ پھر کیسے وزن اور قافیہ کو ایک ہی سمجھا جائے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ جہاں قافیہ مذکور ہے وزن بھی ہوتا ہے، لیکن دونوں کے لازم ملزوم ہونے کا کلی حکم لگانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ پھر مولانا عبدالرحمٰن نے آگے کی بحثوں میں وزن اور قافیہ کو الگ گردانا ہے اور قافیہ کے عدم اشتراط کو بھی تسلیم کر لیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''وزن کی نفی کا میں قائل نہیں، جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، البتہ قافیہ کو اتنا ضروری نہیں سمجھتا۔ قدما کی تصانیف سے بھی اس کا سراغ ملتا ہے، نیز شروط قوافی کے باب میں جو اہمال واغماض سلف سے لے کر خلف تک ہوتا چلا آیا ہے وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے، حتی کہ عروض کی مستند کتابیں بھی اس سے اتفاق رکھتی ہیں۔'' (ایضاً، ص 66)

اس اقتباس کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن کی باتوں میں تضاد نظر آتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ شعر میں قافیہ اور وزن کی ہم آہنگی سے ہی شعر میں موزونیت آتی ہے، لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب 'مرآۃ الشعر' میں 'وزن وقافیہ اور معانی کا مرتبہ' کے عنوان کے تحت جمہور اہل فن کی بات نقل کرتے ہوئے اظہار خیال کیا ہے کہ وزن اور قافیے کو کبھی کسی نے شعر کی شعریت کے لیے کافی نہیں سمجھا، بلکہ معانی، طرز ادائے معانی، حسن زبان وبیان کو شعر کی جان جانتے اور سمجھتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا عبدالرحمٰن نے ابن رشیق کے بیان کو بطور استدلال پیش کیا ہے، جس نے اپنی کتاب میں شعر کی تعریف کرنے کے بعد اس کی وضاحت کی ہے۔

ابن رشیق کی بات نقل کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ابن رشیق ایک طرف وزن کو رکن شعر قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف معنی کے مقابلے میں اس کے مرتبے کو پست کر دیتے ہیں۔

مولانا عبد الرحمن نے اپنی کتاب 'مرآۃ الشعر' میں 'وزن وقافیه اور معانی کا مرتبه' کے عنوان کے تحت جمهور اهل فن کی بات نقل کرتے هوئے اظهار خیال کیاهے که وزن او رقافیے کو کبهی کسی نے شعر کی شعریت کے لیے کافی نهیں سمجها بلکه معانی، طرز ادائے معانی، حسن زبان وبیان کو شعر کی جان جانتے اور سمجهتے رهے هیں۔اس ضمن میں مولانا عبد الرحمن نے ابن رشیق کے بیان کو بطور استدلال پیش کیاهے ، جس نے اپنی کتاب میں شعر کی تعریف کرنے کے بعد اس کی وضاحت کی هے۔

ڈاکٹر محمد جعفر احراری کے نزدیک مولانا عبدالرحمٰن کی باتوں میں تضاد ہے، کیوں کہ اوپر اہل مغرب کے یہاں وزن کو ورس کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، پوئٹری کے لیے نہیں اور نیچے جو اقتباس نقل کیا گیا ہے، وہاں پوئٹری اور ورس دونوں کے لیے وزن کی شرط سے انکار کیا گیا ہے، پھر توضیح میں شعر میں وزن کو ضروری قرار نہ دے کر نظم میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جعفر احراری کے نزدیک اس میں دو احتمال ہیں، یا تو بعد کی عبارت میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے سہو ہوا ہے، یا پھر کاتب کی غلطی سے کہیں کچھ چھوٹ گیا ہے۔ اگر مجھے (ڈاکٹر جعفر احراری) اختیار دیا جائے تو میں اس عبارت کو یوں کر سکتا ہوں: 'اہل مغرب وزن ورس کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، نہ 'کہ' پوئٹری کے لیے، لفظ 'کہ' کا اگر اضافہ کر دیا جائے تو مولانا عبدالرحمٰن کی عبارت کا تضاد ختم ہو سکتا ہے۔ (مشرقی معیار نقد اور مرآۃ الشعر، ڈاکٹر محمد جعفر احراری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ص 59)

شعر میں الفاظ ومعانی کا مرتبہ:

مولانا عبدالرحمٰن نے شعر میں الفاظ ومعانی کے

حسن کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ کی دو حیثیتیں بیان کی ہیں، ایک الفاظ بحیثیت صوت۔ صوت الفاظ کی اصل ہے، اسی کے وجود پر الفاظ کا وجود منحصر ہے، صوت میں اگر روانی وہمواری ہوتو وہ اس کا حسن ہے، حتی کہ یہی روانی اور ہمواری الفاظ میں موزونیت وغنائیت پیدا کرتی ہے۔ دوسری الفاظ بحیثیت معنی کے۔ مولانا عبدالرحمٰن نے الفاظ کو معنی کی تصویر کہا ہے، چناں چہ تصویروں کو جتنا بھی سلیقہ اور ڈھنگ سے سجایا جائے گا، وہ اتنی ہی دلکش اور خوبصورت نظر آئیں گی۔ طبع موزوں اور الفاظ موزوں جب ہم آہنگ ہوتے ہیں تو اس سلیقہ مندی سے کلام موزوں کا وجود ہوتا ہے، جسے نظم کہا جاتا ہے۔ اگر نظم میں شعور کے زیر اثر جذبات وخیالات اور خیال شعری ہوں، جسے معانی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو اسے شعر کہہ سکتے ہیں۔ (ایضا، ص 79)

الفاظ کی حیثیت:

مولانا عبدالرحمٰن نے الفاظ کو معانی کے اجسام سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے جب قالب اور جسم ہی نہ ہو تو اس صورت میں روح مجردہ کا تصور عبث ہے، اسی لیے مصنف لفظ کو معنی پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ جو لوگ صرف حسن الفاظ کے دلدادہ ہیں اور حسن معنی کی جانب توجہ نہیں دیتے یا صرف حسن معنی کے قائل ہیں اور الفاظ کو نظر انداز کر جاتے ہیں وہ لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں اعتدال کا راستہ تو یہ ہے کہ الفاظ کی ترکیب میں معانی کی روح بھی رہے اور ادائے معنی میں حسن الفاظ کا جادو بھی موجود ہو۔

فصاحت وسلاست الفاظ:

مولانا عبد الرحمٰن نے مذکورہ عنوان کے تحت فصاحت کی تعریف کرتے ہوئے سلاست کے ادنیٰ معیار پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک فصاحت کے معنی سلاست وظہور کے ہیں۔ فصاحت میں مانوس الفاظ اور رواں ترکیب کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس غیر سلیس الفاظ غیر فصیح ہوتے ہیں۔ اور اگر الفاظ کی ترکیب میں ناہمواری ہوتو اسے ثقالت اور تنافر سے تعبیر کرتے ہیں۔ سلاست کا ادنیٰ معیار یہ ہے کہ الفاظ کو بولنے میں دشواری نہ ہواور سننے میں گراں نہ گزرے، گویا مانوس کلام کا استعمال کیا جائے، جس کو سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔ کلام نظم ہو یا نثر مانوس الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے، عربی میں یہ اصول اس وقت بنایا گیا، جب عربی ایک مکمل زبان تھی اور اس میں مانوس وغیر مانوس دونوں طرح کے الفاظ موجود تھے، چنانچہ شعر یا خطبہ کا کمال یہ تھا کہ اس میں مانوس الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ غیر مانوس اور وحشی الفاظ کا استعمال عجز پر دلالت کرتا تھا۔

مولانا عبدالرحمٰن نے 'فصاحت اور الفاظ غیر مانوس' کے عنوان کے تحت بھی عمدہ بحث کی ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی زبان ڈھلے ڈھلائے اصولوں کے تحت نہیں بنی، بلکہ جب کوئی زبان اصول طبعی سے ترقی کے مراحل طے کرتی ہوئی درجۂ کمال کو پہنچتی ہے اور ذوق سلیم تقریر وتحریر میں الفاظ کے استعمال کے حسن کو محسوس کرنے لگتا ہے تو اس وقت فصاحت وبلاغت کے اصول مقرر ہوتے ہیں۔ فارسی زبان عربی کے ہر قسم کے الفاظ کو جگہ دیتی رہی، یہاں تک کہ عربی الفاظ فارسی کے جزو لاینفک بن گئے۔

علامہ جاحظ کے یہاں مانوس الفاظ کا معیار یہ ہے کہ وہ نہ تو بالکل عامیانہ ہوں اور نہ ہی بالکل غریب، بلکہ ایسے الفاظ ہوں کہ لوگ بہ آسانی سمجھ سکیں۔ مولانا عبدالرحمٰن کے یہاں کلام میں غریب اور غیر متداول الفاظ کا آنا اس شرط کے ساتھ صحیح ہوسکتا ہے کہ وہ سماعت پر گراں نہ گزریں، اس کی مثال انھوں نے اردو میں غالب کے شعر سے دی ہے۔

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

'کاو کاوْ اردو میں غریب ہے، اور فارسی میں بھی اس کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے، لیکن غرابت کے باوجود سامع پر گراں بار نہیں ہے، اس لیے اگرچہ 'کاوکاوْ کی ترکیب رائج نہیں ہو پائی، پھر بھی جواز کی حد تک اس ترکیب کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ (ایضا، ص 84)

فصاحت وبلاغت میں فرق:

فصاحت، کلام کا لفظی عیوب سے پاک ہونا ہے خواہ کلام مفرد ہو یا مرکب، جب کہ بلاغت، سامع کے قلب میں بات اتارنے کو کہتے ہیں۔ بلاغت سے مراد بلاغۃ المعنی، یعنی معنی کو جوں کا توں ادا کرنا کہ دل کی بات مکمل طور پر سامع کے دل تک پہنچ جائے، تا کہ کلام کا جو اثر ہونا چاہیے وہ پورا پورا ہو۔ بلاغت کا درجہ فصاحت سے بلند ہے، بلکہ مولانا عبدالرحمٰن کے الفاظ میں 'فصاحت کو بلاغت کا ایک جزو سمجھنا چاہیے، غیر بلیغ کلام فصیح ہوسکتا ہے، لیکن غیر فصیح بلیغ نہیں ہوسکتا۔'' (مرآۃ الشعر، ص 78)

مولانا عبد الرحمٰن نے 'شعر وصناعت لفظی' کے عنوان سے ہارون رشید اور ابونواس کے درمیان وقوع پذیر ایک واقعہ نقل کر کے عرب میں لفظی صناعی کی مثال پیش کی ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک روز ہارون رشید خالصہ حبشیہ کے ساتھ محو گفتگو تھا کہ ابونواس آیا اور اس نے ایک قصیدہ پڑھا، لیکن جب خلیفہ نے توجہ نہیں دی تو ابونواس نے واپس لوٹتے ہوئے اس کے دروازے پر یہ شعر لکھ دیا۔

لقد ضاع شعری علی بابکم
کما ضاع عقد علی خالصة

(میرے اشعار تمھارے دروازے پر اس طرح ضائع ہوگئے جیسے خالصہ حبشیہ پر زر وجواہر کے ہار ضائع ہوگئے)

جب خلیفہ کو ہوش آیا اور اس نے دروازے پر یہ شعر لکھا دیکھا تو حکم دیا کہ فوراً ابونواس کو پکڑ کر لاؤ۔ ابونواس سمجھ گیا کہ اس کو کیوں بلایا گیا ہے، چنانچہ آتے آتے اس نے دونوں مصرعوں سے 'ضاع' کے 'ع' کے دائرے کو مٹا دیا، اب وہ عین ہمزہ کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ ہارون رشید نے ابونواس سے غصہ ہوکر کہا کہ دروازے پر کیا لکھا ہے؟ ابونواس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

لقد ضاء شعری علی بابکم
کما ضاء عقد علی خالصة

(میرے اشعار نے آپ کے یہاں وہ عزت پائی جیسا کہ زر وجواہر کے ہاروں نے خالصہ حبشیہ کے گلے میں عزت پائی)

یہ سن کر ہارون رشید کا غصہ کافور ہوگیا اور ابونواس کو انعام واکرام سے نوازا۔

(مشرقی معیار نقد اور مرآۃ الشعر، ڈاکٹر محمد جعفر احراری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ص 85)

مرآۃ الشعر میں شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن نے جس انداز میں مشرقی شعریات کے معیار نقد کو اجاگر کیا ہے، وہ مشرقی شعریات کے موضوع پر بلاشبہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی آرا کو جس انداز میں انھوں نے مدلل کیا ہے، وہ ان کے تحقیقی وتنقیدی ذوق کا غماز ہے۔ اردو میں جب مشرقی شعریات کی بات ہوتی ہے تو اس سے مراد عربی وفارسی کی روایت نقد ہوتی ہے، کیونکہ انہی دونوں زبانوں کے تصور ادب اور نظریۂ شعر کی اساس پر اردو شعریات کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ مشرقی شعریات پر 'مرآۃ الشعر' کے بعد معروف نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت جیسی اہم کتاب لکھی ہے، اس میں بھی عربی شعریات کی روایت کے ضمن میں مشرقی شعریات پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ تاہم 'مرآۃ الشعر' کو 'الفضل للمتقدم' کے تحت اولیت حاصل ہے۔

■

Dr. Jasimuddin
Guest Faculty, Dept of Arabic
University of Delhi - 110007
Mob.: 9711484126
Email.: jasimqasmi@gmail.com

بہار میں اردو فکشن کی تنقید روایت اور صورتِ حال

مسرت جہاں

اردو تنقید، تذکروں کے ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے مکمل فن کی صورت 'کاشف الحقائق' میں رونما ہوئی۔ اس کی شہرت ومقبولیت علمی اور تاریخی لحاظ سے کسی قدر حالی کی مقدمہ شعر و شاعری سے کم نہیں ہے۔ اردو تنقید کے آغاز وارتقا کے بعد اردو تنقید کی باضابطہ روایت نے فن کی صورت اختیار کرلی۔ جیسے جیسے اردو تنقید نے ترقی کے مراحل طے کیے ویسے ویسے اس کی مختلف جہتیں رونما ہونے لگیں۔ تنقید کے وسیع اور پھیلتے دائرہ کار کو انتشار کی زد سے بچانے کی غرض سے مختلف اصناف کے طور پر اردو نظم کی تنقید، اردو غزل کی تنقید، اردو مثنوی، مرثیہ، قصیدے کی تنقید اور ڈرامے کی تنقید، اردو افسانے اور ناول کی تنقید وغیرہ کے عنوانات دیے جانے لگے۔

بہار کے ابتدائی تنقید نگاروں میں امداد امام اثر، عبدالغفور شہباز، شاد عظیم آبادی، فضل حق آزاد اور نصیر الدین خیال کے نام اہم ہیں۔ دوسرے دور کے ادب نوازوں میں جمیل مظہری، سید سلیمان ندوی، معین الدین دردائی، کلیم الدین احمد اور اختر اورینوی وغیرہ جیسی معروف شخصیتوں نے اردو ادب کی تنقید کو مستحکم کیا اور وقار بخشا۔

بہار میں اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے اختر اورینوی اور کلیم الدین احمد کا نام سر فہرست ہے۔ ان دونوں شخصیات کا تعلق پٹنہ یونیورسٹی سے رہا ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی کی شخصیت اپنی ذات میں انجمن ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار اور محقق کے ساتھ شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی سرپرستی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ان کے افسانوی مجموعے کینچلیاں اور بال جبریل، سیمنٹ اور ڈائنامائٹ، منظر وپس منظر، کلیاں اور کانٹے، سپنوں کے دیس میں وغیرہ نیز ناول 'حسرت تعمیر' خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے تنقید کے سرمائے میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی نگارشات میں شامل اردو شعر وشاعری یا نثری تصنیف، اس کے اصول و ضوابط اور ان کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ 'تحقیق وتنقید، مطالعہ ومحاسبہ، مطالعہ اقبال، مطالعہ نظیر اور مجلس اردو ادب' وغیرہ ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔

'تحقیق وتنقید' (جدید) ترمیم واضافے کے ساتھ 1962 میں کتابستان الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل مضامین افسانوی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ افسانہ فنی نقطۂ نظر سے، افسانے میں مقصد، افسانے میں حقیقت طرازی کے علاوہ فن ناول نگاری اور نذیر احمد دہلوی، بہار میں اردو ناول نگاری کے موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ 'مطالعہ ومحاسبہ' پروفیسر اختر اورینوی کے دس مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں علی عباس حسینی کے دو افسانوی مجموعے 'میلہ گھومنی' اور 'آئی سی ایس (چند افسانے)' کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے خوبیوں کے ساتھ ان کے فنی عیوب کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کی ذی وقار شخصیتوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا شمار ہوتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی شعر وادب کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب خصوصاً اردو تنقید پر ان کی خاص نگاہ رہی ہے۔ اردو تنقید پر ان کی مختلف کتابیں ہیں۔ اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، سخنہائے گفتنی، عملی تنقید، اقبال ایک مطالعہ، میری تنقید ایک بازدید اور ادبی تنقید کے اصول۔ ان میں ایک کتاب 'اردو زبان اور فن داستان' بھی ہے۔ یہ کلیم الدین احمد کے عمدہ تنقیدی تجربات ومشاہدات کا نمونہ ہے جس میں ان کے تنقیدی افکار بخوبی ابھرتے ہیں۔

پروفیسر آصفہ واسع کا تحقیقی مقالہ گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ 'بہار میں اردو ناول نگاری' کے موضوع پر ان کا پرمغز مقالہ 'الف، ب اور ج' کے تین ضمنی حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ 'الف' میں پس منظر کے طور پر 'ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات' (1857 سے 1947 تک) کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور حصہ 'ج' میں شائق احمد عثمانی اور امداد امام اثر کو ضمیمے کے طور پر شامل کیا ہے۔ حصہ 'ب' موصوفہ کا اصل تحقیقی حصہ ہے۔ ان کے احاطۂ تحقیق میں ابتدا سے 1947 تک کے ان بھی ناول نگاروں کا ذکر بہ تفصیل ناول موجود ہے، جن کا تعلق سرزمین بہار سے ہے۔ آخر میں ناول کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ معروف ناول نگاروں میں عظیم آباد اور دوسرے مراکز کے ناول نویسوں کی تصنیفات کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ شاد عظیم آبادی، محمد اعظم، افضل الدین، صفیر بلگرامی، رشیدۃ النسا، سجاد عظیم آبادی، عرش گیاوی، اسلم عظیم آبادی، محمد حنیف فائز عظیم آبادی، رام انوج سہائے، آل حسن معصومی، شمس گیاوی، جمیل مظہری اور اختر اورینوی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے اور تحقیقی رویے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ محترمہ نے دیدہ ریزی اور عمیق رویے سے کام لیا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں وہ وثوق کے ساتھ کہتی ہیں:

''یہ مقالہ 1965 میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت تحقیق کی راہ میں دشواریاں بہت تھیں۔ نئے مواد کی فراہمی کا کام بہت مشکل تھا۔ میں نے اگلے ہوئے نوالے نہیں چبائے ہیں۔ بلکہ اچھوتا اور بالکل نیا کام ادب میں پیش کیا ہے، جس کی روشنی سے اہل قلم فائدہ اٹھاتے ہیں۔''

(بہار میں اردو ناول نگاری: پروفیسر آصفہ واسع، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1997، ص 9)

انگریزی زبان وادب سے گہرا شغف رکھنے والے پروفیسر عبدالمغنی کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبان پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی کتابوں کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی کی متعدد اردو کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی تنقیدی کتابوں

کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر اردو کے ناقد ہیں۔ نقطۂ نظر (1965)، جادۂ اعتدال (1972)، برنارڈ شا (1976)، تشکیل جدید (1976)، معیار و اقدار (1981)، اقبال اور عالمی ادب (1982)، مولانا ابوالکلام آزاد: ذہن و کردار (1989)، اسلوب نقد (1989)، تنویر اقبال (1990)، عظمت غالب (1990)، اقبال کا نظریہ خودی (1990)، قرۃ العین حیدر کا فن (1991)، تنقیدی زاویے (1993) اور فروغ تنقید وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ عبدالمغنی کی ان کتابوں میں سے ان کا ذکر ضروری ہے جن میں فکشن کے تعلق سے ان کے مقالات سامنے آئے ہیں۔ 'جادۂ اعتدال' (1972) موصوف کے دوسرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اکیس تنقیدی مقالات میں سے تین مقالے فکشن پر ہیں۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری، علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری اور شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری۔ یہ سبھی مضامین اپنی نوعیت کی منفرد تحریریں ہیں۔ 248 صفحات پر مشتمل متفرق مضامین مختلف اصناف ادب سے تعلق رکھنے والی عبدالمغنی کی کتاب 'تنقیدی زاویے' کے نام سے سنہ 1993 میں آصف پبلی کیشنز علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ کتاب میں شامل سات مضامین اردو فکشن کے بڑے فنکاروں کے فن پر ان کی گہری نگاہ اور تیز مشاہدے کو پیش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر: ایک منفرد فنکار، چاندنی بیگم، قاضی عبدالغفار بحیثیت ادیب، لہو کے پھول: ایک تنقیدی مطالعہ، غلام عباس کی فنکاری، کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری اور آدھے چاند کی رات جیسے مضامین فکشن کی تنقید میں اضافہ ہیں۔

'قرۃ العین حیدر کا فن' (1991) عبدالمغنی کی عمدہ تنقیدی کتابوں میں سے ایک ہے۔ انھوں نے یہ پوری کتاب قرۃ العین حیدر کے فکر و فن اور ان کی شخصیت کے لیے مختص کر دیا ہے۔ 'اختر اورینوی کے افسانے' کے نام سے پروفیسر عبدالمغنی نے اختر اورینوی کے عمدہ افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ اختر اورینوی کے بہترین اور عمدہ افسانوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی سعی کارِ خیر کے مترادف ہے اور ہم جیسے ادب کے طالب علموں کے لیے زادِ راہ بھی۔ عبدالمغنی نے کتاب کے شروع میں اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مقدمہ اختر اورینوی کی کم و بیش پوری زندگی اور ان کے فن کا احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون کے معتبر اور مستند ہونے کی مثال اس طور پر دی جا سکتی ہے کہ خود عبدالمغنی کے ذریعے 25 جولائی 1976 کو انٹرویو کے درمیان جو بحثیں تنقیدی اور ادبی تناظر میں ہوئی تھیں اس کا بھی ذکر انھوں نے کیا ہے۔ اختر اورینوی کی اشاریت (Symbolism) اور سریت (Mystification) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے بعض افسانوں میں اشاریت تو پائی جاتی ہے مگر وہ سریت سے مبرا ہیں۔

صوبہ بہار کی عبقری شخصیت پروفیسر وہاب اشرفی کو بیک وقت عہد ساز نقاد، محقق، افسانہ نگار، صحافی، استاد اور دانشور جیسی مختلف حیثیتوں سے اعتبار حاصل ہے۔ ان کی تعلیمی اور علمی لیاقت کی واضح مثال 'تاریخ ادبیات عالم' کی سات جلدیں اور 'تاریخ ادب اردو' کی تین جلدیں ہیں۔ ویسے تو وہاب اشرفی کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد بہت ہے۔ مگر اردو فکشن کی تنقیدی نگارشات میں ان کی کتاب 'معنی کی تلاش' اہم ہے۔ اس کا ایک مضمون 'افسانے کا منصب' ہے۔ جو موضوع سے پوری طرح انصاف کرتا ہے۔ 'سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے' میں سہیل کے نمائندہ افسانوں مثلاً الاؤ، جینے کے لیے، سادھو اور بیسوا، اور بدصورت لڑکی وغیرہ کا خوبصورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ 'معنی سے مصافحہ' کے مشمولات میں ایک طرف شعری اصناف سے تعلق رکھنے والے سودا اور غالب کی شاعری پر مضامین ہیں تو دوسری طرف معاصر فکشن کے نمائندہ لکھنے والوں مثلاً جیلانی بانو، احمد یوسف، عبدالصمد، شوکت حیات، شموئل احمد، جابر حسین اور محمود واجد وغیرہ کے فن کا بھی بے باکی سے احاطہ کرتے ہیں۔ 'اردو فکشن اور تیسری آنکھ' میں شامل مضامین فکشن سے متعلق وہاب اشرفی کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہیں۔ انھوں نے فکشن کے بنیاد گزاروں کے ساتھ معاصر فنکاروں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ خاص طور سے تقابلی نگاہ ڈالتے ہوئے معاصر فکشن کے امتیازات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی اس کتاب میں بڑے خوبصورت نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''ادب مماثلتوں کی تلاش کا فن ہے۔ یہ فن اسی وقت بالیدہ ہوتا اور نکھرتا ہے، جب کوئی تخلیق جمالیاتی احساس سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ موضوعات کی کثرت میں، کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا ادب بذات خود کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بات تب خاص ہو جاتی ہے جب فنکار کا احساس جمال اسے جلا بخشتا ہے، ورنہ موضوع اپنے آپ میں محترم نہیں، نہ ہی چھوٹے اور بڑے موضوع کی تفریق کسی ادب پارے کے چھوٹے یا بڑے ہونے کی شہادت ہے۔''

(اردو فکشن اور تیسری آنکھ: پروفیسر وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، ص 5)

اردو فکشن کی تنقید میں قدوس جاوید کا نام نیا نہیں ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی قدوس جاوید معتبر اور موقر رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی، سری نگر میں لکچرر ہوئے اور وہیں مقیم ہیں۔ 'جدید اردو افسانہ' کے موضوع پر ان کا تحقیقی مقالہ اپنے آپ میں گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ 'تقسیم ملک، فسادات اور افسانہ' اور 'آخر شب کے ہم سفر اور سماجی شعور' بھی ان کی اہم کتابیں ہیں۔ انھیں اردو ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ بنگالی زبان و ادب کے معروف و مقبول فکشن رائٹر شرت چندر چٹرجی اور ٹیگور کی کہانیوں کا جائزہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں لیا ہے۔

'متن، معنی اور تھیوری' کے نام سے پروفیسر موصوف کی کتاب 2015 میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس میں شامل ایک مضمون 'افسانے کی شعریات' ہے جس میں اردو افسانہ کی ابتدا سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک کے اسرار و رموز اور افسانے کی شعریات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

پروفیسر اسلم آزاد کا براہ راست واسطہ فکشن کی تنقید سے ہے۔ 1974 میں پروفیسر اختر اورینوی کی نگرانی میں 'اردو ناول 1947 سے 1967 تک' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'اردو ناول آزادی کے بعد' (1981) کے نام سے شائع ہوا۔ پیش نظر کتاب میں پروفیسر موصوف نے 'ناول کا فن'، 'ناول کا ارتقا' اور اس کے رجحانات پر خاص توجہ دی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے پندرہ فکشن رائٹر (عزیز احمد سے قاضی عبدالستار تک) کے ناول پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ خدیجہ مستور کا مشہور و معروف ناول 'آنگن' کا تنقیدی جائزہ 1978 میں شائع ہوا۔ 'عزیز احمد بحیثیت ناول نگار' کے نام سے بھی پروفیسر اسلم آزاد کی کتاب موضوع گفتگو رہی ہے۔ انھوں نے عزیز احمد کے اہم ناولوں مثلاً ہوس (1932)، مرمر اور خون (1936)، گریز (1943)، آگ (1946)، ایسی بلندی ایسی پستی (1947) اور شبنم (1949) کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔

صوبۂ بہار کے اہم اور خاص ادبا اور شعرا میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی مختلف صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے کے علاوہ ان کا خاص میدان ظرافت نگاری اور شاعری ہے۔ ان کی دو کتابیں 'کرسی اور کرنسی' اور 'دعوت اور عداوت' طنز و ظرافت پر ہیں۔ 'نشاط غم اور دھوپ کا مسافر' شعری مجموعے ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں سید عاشور کاظمی: فنکار اور فن، منشورات جمیل مظہری (ترتیب مع مقدمہ) اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'اسلوب و معنی،

بہار میں اردو تنقید اور بہار کی بہار (دو جلدیں)' ہیں علاوہ ازیں اردو فکشن کی تنقید کے زمرے میں ان کی خدمات اردو ادب کے سرمائے میں بہت بڑا اضافہ ہیں۔ جن میں توبۃ النصوح: ایک جائزہ، نذیر احمد کی ناول نگاری، کرشن چندر کی ناول نگاری، ہم عصر اردو فکشن: چند زاویے وغیرہ اہم ہیں۔

'اسلوب و معنیٰ' (1989) پروفیسر اعجاز علی ارشد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے دیگر مضامین سے قطع نظر ان کے افسانوی مضامین 'اردو افسانہ اور علامت'، 'گدی کا افسانہ تج دو: تحلیل و تجزیہ'، 'سہیل عظیم آبادی اور ان کی تحریریں: ایک تحقیقی جائزہ' ہیں۔ یہ تینوں مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب 'کرشن چندر کی ناول نگاری' ہے۔ پیش نظر کتاب موصوف کی تنقیدی بصیرت اور علم و آگہی کی شناخت کراتی ہے۔ ان سے قبل کم و بیش سبھی فکشن ناقدوں نے کرشن چندر کا ناول 'شکست' کو موضوع بحث بنایا ہے جبکہ پروفیسر موصوف نے کرشن چندر کے تقریباً سبھی ناولوں کا فرداً فرداً مطالعہ و محاسبہ کیا ہے۔ یہ پوری کتاب کرشن چندر کی شخصیت کی تعمیر، ان کی ذہنی تشکیل اور اسلوب نگارش کے مطالعے پر مبنی ہے۔ 'نذیر احمد کی ناول نگاری' پروفیسر اعجاز علی ارشد کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے سبھی ناولوں کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ناول کے فن، پلاٹ، تکنیک، کردار نگاری اور ان کے طرز نگارش کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب 'توبۃ النصوح ایک تلخیص ایک جائزہ' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ 'ہم عصر اردو فکشن چند زاویے' (2010 کتابی دنیا، دہلی) میں بارہ مضامین شریک اشاعت ہیں جو خالص فکشن پر مبنی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناولٹ سیتاہرن، شکیلہ اختر کی ناول نگاری، عبد الصمد کی ناول نگاری اور عہد حاضر میں لکھے جارہے ناولوں کا سیر حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو افسانے کے تعلق سے مغرب کے اہم رجحانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

عصری تنقیدی منظرنامے کا ایک مسلم الثبوت نام ابو الکلام قاسمی کا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ تقابلی مطالعے کی طرف راغب رہے۔ 1978 میں ای ایم فورسٹر کی کتاب Aspects of the Novel(1927) کا اردو ترجمہ 'ناول کا فن' کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب ناول کی تنقید اور اس کی فنی خصوصیات پر مبنی ہے۔ ای ایم فورسٹر نے دو نئی اصطلاح آہنگ اور پیٹرن کا اضافہ کیا۔ اس کی مثال میں مختلف ناولوں کے پلاٹ اور نثری آہنگ کو پیش کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پروفیسر موصوف نے Aspects of the Novel کا اردو ترجمہ کیا اور اردو ناول کے فن کو دو نئی اصطلاح سے متعارف کرایا ہے۔ ان کی دوسری کتاب 'تخلیقی تجربہ' میں اردو فکشن اور اردو فکشن نگار کے متعلق وسیع اور مبسوط مقالات زیر بحث آئے ہیں۔ موصوف نے قدیم و جدید تخلیقی متون کا تجزیہ پیش کر کے نئے اور پرانے متون کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ 'اردو فکشن آزادی کے بعد... مسائل اور مباحث' میں سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں اردو افسانے اور ناول کے مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی ہے۔

اردو فکشن کے معروف ناقدوں میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا نام لیا جاتا ہے۔ وہ بیک وقت اردو ادب کی مختلف جہتوں پر گامزن ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 'آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب (1986)' سے کیا، مگر ان کی توجہ فکشن کی تنقید پر رہی ہے۔ 'عجائب القصص کا تنقیدی مطالعہ' (1987) کے ساتھ 18 ویں صدی کے دوسرے نثر نگاروں کا جائزہ لیتے ہوئے شاہ عالم ثانی کے معاصر ادیبوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ 'جوگندر پال... ذکر، فکر اور فن' مختلف ادیبوں کے مقالات اور خود جوگندر پال کے مضامین سے مزین ہے۔ 'قرۃ العین حیدر... ایک مطالعہ' اور 'انتظار حسین... ایک دبستان' معیار و اقدار کے اعتبار سے نمائندہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ 'مابعد جدیدیت اور پریم چند' میں ارتضیٰ کریم نے مابعد جدیدیت کے تناظر میں پریم چند کے فن پاروں کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو جلدوں میں ترتیب دی گئی کتاب 'آزادی کے بعد اردو افسانہ' کی فہرست سازی میں گوپی چند نارنگ اور اسلم جمشید پوری جیسی قد آور شخصیات کی شمولیت عمدہ ترتیب سازی کی ضمانت ہے۔ 'اردو فکشن کی تنقید' فکشن کی تنقیدی روایت اور پس منظر پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ فکشن کے ضمن میں صرف ناول اور افسانوں کو ہی نہیں بلکہ ڈرامے، تمثیل اور داستان کو اپنے مطالعے کا حصہ بنا کر اس پر مبسوط اور مدلل طریقہ کار سے بحث کی ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو فکشن کا اشاریہ بھی شامل کیا ہے۔ یہ کتاب اردو فکشن کی تنقید پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی کتاب ثابت ہوئی ہے۔

خواتین فکشن تنقید نگاروں میں پروفیسر اشرف جہاں کا مقام بلند و بالا ہے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'اکیسویں صدی کی نرملا' اور 'اگر میں نا ہوتی' ان کے بہترین افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ہم اردو کے ٹیچر ہوئے' انشائیہ کے طرز پر لکھی گئی ہے، جبکہ ان کی تین تنقیدی کتابیں جن کا تعلق براہ راست فکشن کی تنقید سے ہے۔ فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد، اردو ناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ اور اردو افسانے کا بدلتا مزاج۔ 'فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد' پر ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ 'اردو افسانے کا بدلتا مزاج' میں انھوں نے مختلف عہد میں افسانوی بنت، اس کے موضوعات اور بیان کے قاعدے کو احاطۂ تحریر میں لیتے ہوئے ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، اردو افسانہ 1947 کے بعد جیسے موضوعات کے تحت اردو افسانے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ 'اردو ناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ' اشرف جہاں کی عمدہ تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں سے اردو فکشن کی تنقید پر کام کرنے والوں میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا نام نمایاں ہے۔ ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ فکشن کی تنقید پر ان کی اہم کتابیں عبد الصمد عکس در عکس، غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار، کلیات سعادت حسن منٹو آٹھ جلدیں ہیں۔ 'فکشن کی بازیافت (2013)' تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس کے علاوہ الیاس احمد گدی اور رضا نقوی واہی کے فن پاروں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

موجودہ دور کے اہم فکشن کے نقادوں میں صفدر

امام قادری کا نام آتا ہے۔ان کی حالیہ کتابوں میں 'ذوق مطالعہ'(2014)، 'محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور اور دیگر مضامین (2015)'، 'مشاہدات (2016)' وغیرہ کے مطالعے ومحاسبے سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قاسم خورشید نے 'ادبی منظر نامے پر گئودان' میں ناول کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ناول 'گئودان' کو مختلف زاویے سے پرکھا ہے۔ ناول 'گئودان' پریم چند کا شاہکار ناول ہے۔ دیہی زندگی کے مسائل کی عکاسی جس دیانتداری سے پریم چند نے کی ہے اسے اردو اور ہندی کے علاوہ مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے مفکروں اور دانشوروں نے صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ستر فیصد آبادی کی سسکتی ہوئی زندگی کو محسوس کیا ہے۔ان کی دوسری اہم کتاب 'متن اور مکالمہ' کے نام سے 2016 میں شائع ہوئی۔ 'متن اور مکالمہ' کا اندراج جس جدت وندرت کی نشاندہی کرتا ہے قابل تعریف ہے۔ ان کی تمام آرا سے قطع نظر میری نگاہ موضوع کی مناسبت سے ان چند نکتوں پر مرکوز ہے جن کا تعلق فکشن سے ہے۔1960 کے بعد خواتین ناول نگار، عینی اور روشنی کی رفتار، نئی تنقید اور عہد رواں کے افسانے، تفریحی ادب اور جاسوسی ناول، سہیل عظیم آبادی: اردو فکشن کا اسکول، سجاد ظہیر وغیرہ فکشن نگاروں اور ان کے فن پاروں پر وسیع تناظر میں سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نئی نسل کے معتبر تنقید نگاروں میں سے ایک ہیں۔ یوں تو شہاب ظفر اعظمی کی نگاہ فکشن کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف پر بھی رہتی ہے لیکن ان کی اساس اور پہچان فکشن کے اسلوبیاتی مطالعے سے ہوتی ہے۔ فکشن کے فن پاروں کے سبھی اجزا پلاٹ، کردار، منظر، پس منظر و زبان و بیان پر خود کو مرکوز کرتے ہوئے اس کے اسلوب پر سنجیدگی غیر جانبداری اور تعمیری نقطۂ نظر ان کے سامنے ہوتا ہے۔ ان کی سنجیدگی اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے کہ وہ متن کو صرف ناقد کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ مصنف کے وژن، اس کے تجربات واحساسات و جذبات کی پیشکش کی گہرائی وگیرائی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے تنقیدی تجزیے میں متن کا مرکزی خیال اور مصنف کے زاویہ نگاہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہی اسلوب ان کو ان کے ہم عصروں میں انفراد بخشتا ہے۔

'اردو ناول کے اسالیب' چار سو صفحات پر مشتمل عمدہ تنقیدی جہات کا مجموعہ ہے۔ موصوف نے ناول کے آغاز وارتقاء کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف ادوار کی مناسبت سے پانچ ابواب میں تقسیم کر کے ہر ایک دور کے اہم ناول نگاروں اور ناولوں کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اردو ناول ترقی پسند تحریک کے بعد، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے نظریات و رجحانات کے حامل ناول نگاروں مثلاً عبدالصمد، پیغام آفاقی، الیاس احمد گدی، سید محمد اشرف، غضنفر، ساجدہ زیدی، محمد علیم، کوثر مظہری، شفق، آچاریہ شوکت خلیل اور شاہد اختر اور دوسرے فن کاروں کے بھی فن پاروں کو تنقیدی پیمانے پر پرکھتے ہیں۔

کتاب 'متن اور معنی' اپنی گوناگوں تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی خصوصیات کے ساتھ مختلف موضوعات لے کر 2013 میں شائع ہوئی۔ اس میں شامل بھی اکیس مضامین مختلف صنفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فکشن کے تعلق سے اس میں اردو داستانوں کا اسلوبی مطالعہ، ترقی پسند اردو ناول کے اسالیب، تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین، بہار کی خواتین افسانہ نگار جیسے موضوعات ہیں، جو عمیق مطالعہ اور غور وفکر کی جانب ذہن کو مرکوز کراتے ہیں۔ حال کے دنوں میں موصوف کی کتاب 'جہان فکشن' اور 'مطالعات فکشن' یک موضوعی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کے بھی مضامین اردو کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔

مطالعات فکشن کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے 2018 میں عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ موصوف نے اپنی سہولت کے لیے اختصاص، امتیاز اور انفراد جیسے تین ضمنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اختصاص کے تحت ناول اور افسانہ کے تعلق سے تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے پانچ مضامین شامل ہیں۔ان میں ترقی پسند تحریک سے قبل سے ہم عصر ادب تک مختلف جہات سے اردو فکشن پر گفتگو کی گئی ہے۔ انفراد کے حصے میں نئی پرانی کتابوں کا تبصرہ شامل ہے۔ یہ تبصرے فنکار کے مخصوص فکر واسلوب کی غمازی کرتے ہیں۔ امتیاز کے تحت دس فکشن نگاروں کا مجموعی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد معاصر فکشن نگاروں کی ہے۔ ناقد موصوف کا مثبت اور غیر جانبدارانہ رویہ ان کے مزاج میں داخل ہے۔ اس طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاصر فکشن نگاروں کے متون کی روشنی میں ان کی امتیازی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی مرتب کردہ دو کتابیں 'فرات: مطالعہ، محاسبہ' اور 'صالحہ عابد حسین: فنی اور فکری جہات' کے نام سے اردو فکشن کی تنقید میں مزید اضافہ ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی ادبی قدر وقیمت اور معنویت اس لحاظ سے اہم ہے کہ 'فرات' آٹھویں دہائی کے بعد منظر عام پر آنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کی تفہیم وتعبیر میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے قلمکاروں کو شامل کر کے ان کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے کی موصوف کی دوسری کتاب 'صالحہ عابد حسین: فنی اور فکری جہات' میں شامل مضامین سمینار میں پڑھے گئے مقالات ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی دستاویزی اہمیت اردو ادب میں مسلم ہے۔

'بہار میں اردو فکشن کی تنقید' پر لکھی گئی کتابوں کی فہرست بہت لمبی ہے جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے چند ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں شمیم صادقہ (قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کردار)، ڈاکٹر نسیم احمد (اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیے کے اثرات)، شمشاد جہاں (کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار)، ثریا جبیں (عصمت چغتائی بحیثیت افسانہ نگار)، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ (اردو اور ہندی کے سیاسی ناول: ایک تقابلی مطالعہ)، ابوبکر رضوی (اردو افسانے میں مہملیت کا رجحان)، واجدہ تبسم (قاضی عبد الستار کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ)، مسرت جہاں (قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ)، رضوانہ پروین (الیاس احمد گدی اور شجیو کی ناول نگاری کا تقابلی مطالعہ)، شمع انجم (اردو افسانوں میں دلت مسائل کا جائزہ) وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

■

Dr.Musarrat Jahan
Post-Doc.Fellow,Patna University
Patna-800005 (Bihar)
Mob:08969042640/09801377362
E-mail:-drmusarratjahanali@gmail.com

محمد شارب

حسین الحق

فکشن کے ایک روشن باب کا خاتمہ

حسین الحق کو پہلی بار دسمبر 2016 میں قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا جب ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ (جھارکھنڈ) کے شعبۂ اردو میں 'اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر' پر یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں ان کے ساتھ ساتھ اسلم جمشید پوری، شاہد رضوی، پروفیسر فاروق، ڈاکٹر کہکشاں پروین، احمد بدر (صدور) وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ اس میں بحیثیت ریسرچ اسکالرز مقالہ نگار کے راقم الحروف کی بھی رانچی سے شرکت ہوئی تھی۔ جب حسین الحق کو دعوت سخن دی گئی تو میں نے دل ہی میں اراکین بزم (ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی، ڈاکٹر زین رامش، ڈاکٹر ہمایوں اشرف وغیرہ) کا شکریہ ادا کیا۔ اس دن کی تقریب میرے لیے تاریخ رقم کرنے جیسی تھی کہ جن کا نام اب تک میں نے ناول 'بولومت چپ رہو' اور 'فرات' کے حوالے سے سنا تھا آج انھیں اپنی آنکھوں سے اور دن کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ رنگ گورا چٹا، قد درمیانہ، آنکھوں پر عینک، خشخشی داڑھی اور زبان و بیان میں بلا کی روانی تھی۔ جب موصوف نے تمہید کے بعد اپنی تقریر کا سلسلہ شروع کیا تو نظیر اور اردو ادب کے حوالے سے ایسی معلومات افزا باتیں سامنے آئیں جن سے اب تک میں نابلد تھا۔ دوران تقریر معلوم یہ چلا کہ انھیں نظم و نثر دونوں اصناف ادب میں ید طولی حاصل تھا۔ انھوں نے کوئی سو سے زائد غزلیں بھی لکھیں ہیں۔ شاعری میں اپنا تخلص حسین استعمال کرتے تھے۔ وہ کلاسیکی اردو شعریات کے احیا کے آرزو مند تھے اور اسی بنیاد پر برصغیر کی مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو، عربی اور فارسی زبان کے کلاسیکی ادب کے مطالعے سے اردو شاعری کو وقار و عظمت عطا کرنے کے خواہاں تھے، لیکن اسے بھی محض ایک اتفاق ہی کہا جائے گا کہ موصوف کا ایک بھی شعری مجموعہ ہنوز منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ اگر شعری تصنیف کے پس منظر میں بات کی جائے تو ایک کتابچہ 'آخری گیت' جو ایک طویل نظم تھی تقریباً 32-30 صفحات پر مشتمل تھا شائع کرایا۔ جہاں تک اردو فکشن کی بات کی جائے تو اس صنف میں انھیں زبردست عبور حاصل تھا جس کے تعلق سے صوبۂ بہار کی سرزمین کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جہاں سے جید فکشن نگاروں اور دانشوروں نے جنم لیا۔ ایسے ہی ناموں میں ایک معروف نام موصوف کا ہے۔

حسین الحق جو 72 برس کی عمر گزار کر اس دار فانی سے 23 دسمبر 2021 کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انھیں اب مرحوم لکھتے کلیجہ منھ کو آتا ہے گزشتہ ایک سال سے گلے کے کینسر میں مبتلا تھے۔ علاج و معالجے میں کوئی دقیقہ باقی نہ تھا اور علاج کے دوران ہی پٹنہ کے میدانتا ہسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا اور آبائی وطن سہسرام میں

حسین الحق جو 72 برس کی عمر گزار کر اس دار فانی سے 23 دسمبر 2021 کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انہیں اب مرحوم لکھتے کلیجہ منو کو آتا ہے گزشتہ ایک سال سے گلے کے کینسر میں مبتلا تھے۔ علاج و معالجے میں کوئی دقیقہ باقی نہ تھا اور علاج کے دوران ہی پٹنہ کے میدانتا ہسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا اور آبائی وطن سہسرام میں سپرد خاک ہوئے۔

سپرد خاک ہوئے۔ وہ مختلف اصناف ادب میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت تھے جن کی شخصیت کے کئی گوشے روشن ہیں جہاں یہ بیک وقت ایک غیر معمولی فکشن نگار تھے، وہیں ایک مشفق ومہرباں استاذ کی حیثیت سے مختلف جامعات میں درس وتدریس کا کام انجام دیا تو علم تصوف میں بلا کی مہارت حاصل تھی، مصلح ایسے کہ کسی کو ان کی تجاویز سے کوئی اختلاف نہ ہوتا، فلسفیانہ گفتگو میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، خود احتسابی اور نقد ونظر کے سارے احوال پر اظہار خیال ان کا کمال سمجھا جاتا تھا اور ساتھ ہی عالمی ادبیات کے ماہرین میں بھی ان کا شمار ہوتا۔ ان کے معاصرین فکشن نگاروں میں عبدالصمد، پیغام آفاقی، غضنفر، مظہر الزماں خاں، شوکت حیات، شموئل احمد، سلام بن رزاق، نورالحسنین، انجم عثمانی کے نام نامی شامل ہیں۔

حسین الحق کی پیدائش 2 نومبر 1949 کو محلہ املی آدم، سہسرام، بہار میں ہوئی۔ ان کے والد مولانا انوارالحق شہودی نازش سہسرامی تھے جو ایک عالم، صوفی صفت انسان تھے اور والدہ کا نام شوکت آرا تھا۔ خود موصوف بھی متصوفانہ فکر رکھتے تھے۔ انھوں نے سیاسی، سماجی اور معاشرتی تغیرات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے لیکن عام انسانی زندگیوں پر جیسی غائرانہ نگاہ انھوں نے ڈالی ہے ویسی ان کے معاصرین میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شادی 1977 میں نشاط آرا خاتون سے ہوئی جن کے بطن سے دو بیٹیاں اور دو بیٹے تولد ہوئے۔ برسوں قبل بسلسلۂ ملازمت ان کی فیملی سہسرام سے گیا، نیو کریم گنج آکر آباد ہو گئی تھی لیکن اپنے آبائی وطن سے ان کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔

ان کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی وطن سہسرام میں ہی ہوئی۔ کبیریہ مدرسے سے مولوی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد آرا ضلع اسکول سے 1963 میں میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہو کر 1968 میں S.P. Jain college سہسرام سے B.A. کی ڈگری امتیازی نمبرات سے حاصل کی۔ 1970 میں M.A. کے امتحان میں بھی پٹنہ یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد 1972 میں مگدھ یونیورسٹی سے بھی فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ پھر عارضی طور پر گورو گووند سنگھ کالج، پٹنہ میں بحیثیت لیکچرار ملازمت بھی کی۔ اسی دوران انھیں U.G.C کی جانب سے جونیر فیلوشپ عطا ہوئی اور 1974 تک بطور ریسرچ فیلوشپ کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں تحقیقی وتدریسی کام انجام دیا۔ بطور لیکچرار ان کی پہلی تقرری S.P.College دمکا (موجودہ جھارکھنڈ) میں ہوئی لیکن یہاں انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد 1976 میں ان کی پہلی تقرری گیا کالج، گیا میں بحیثیت لیکچرار عمل میں آئی۔ بعد ازاں 1981 میں شعبہ اردو، مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا میں ان کا تبادلہ ہوا جہاں سے 2014 میں سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے 'اردو افسانوں میں علامت نگاری' کے موضوع پر 1985 میں پروفیسر افصح ظفر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری مکمل کی۔

اگر ان کے ادبی اسفار کا ذکر کریں تو وہ تقریباً دو سو سے زائد افسانوں کے خالق ہیں۔ ان کی پہلی کہانی 'عزت کا انتقال' صوفی بلیاوی کے نام سے ماہ نامہ 'کلیاں' لکھنؤ سے 1965 میں شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں ان کا پہلا افسانہ 'پسند' ماہ نامہ 'جمیلہ' دہلی میں شائع ہوا۔ ان کے

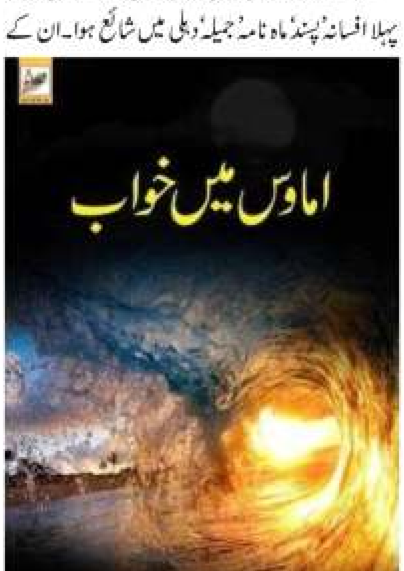

منتخب افسانوں میں نیو کی اینٹ، ندی کنارے دھواں، زخمی پرندے، مردہ راز دار، چپ رہنے والا کون، لڑکی کو رونا منع ہے، جلیبی کا رس، کریلا، گونگا بولنا چاہتا ہے، کُہاسے میں خواب، سبحان اللہ، وقنا عذاب النار، ایندھن، ناگہانی وغیرہ ہیں جو اردو فکشن میں لازوال مقام رکھتے ہیں۔ ان کے طویل تخلیقی سفر میں سات افسانوی مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'پس پردۂ شب' (1981)، دوسرا مجموعہ 'صورت حال' (1982)، تیسرا مجموعہ 'بارش میں گھرا مکان' (1984)، چوتھا مجموعہ 'گھنے جنگلوں میں' (1989)، پانچواں مجموعہ 'مطلع' (1995)، چھٹا مجموعہ 'سوئی کی نوک پر رکا لمحہ' (1997) اور ساتواں مجموعہ 'نیو کی اینٹ' (2009) ہیں جو شائع ہو کر مقبول خواص وعام ہو چکے ہیں۔ انہوں نے جب افسانے لکھنے کا آغاز کیا تو وہ عہد جدید تجربات اور علامت نگاری کا تھا جہاں نئے نئے افسانے وجود میں آ رہے تھے جن پر شعور کی رو کی تکنیک کے واضح اثرات تھے لیکن انہوں نے روایت سے انحراف نہ کیا بلکہ اس میں اپنے منفرد اسلوب وزبان کے حسین امتزاج سے اپنی فکشن فہمی کا ثبوت پیش کیا۔ آگے چل کر ان کا یہی لب ولہجہ اور انداز بیاں جدید افسانہ نگاری میں ایک دستخط کا حامل بنا۔ فکشن کا قاری اس بات کو کیسے فراموش کر سکتا ہے جب عالمی تنقید نگار وارث علوی نے بھی مشہور فکشن نگار عبدالصمد بشمول رضوان احمد کی افسانوی زبان پر سخت اعتراضات کیے تھے اور ساتھ ہی خطۂ بہار کے نئے واردان کی زبان واسلوب پر سوالیہ نشان قائم کیا تھا۔ اسی زمانے میں حسین الحق اور شوکت حیات نے اپنی تخلیقیت کے ذریعے باور کرایا کہ ان کی زبان فکشن کے تئیں نہ صرف موافق ہے بلکہ معتبر بھی ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھیں جو قابل ستائش وتحسین ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے تنقیدی وصوفیانہ ومذہبی موضوعات پر بھی گراں قدر مضامین لکھے ہیں جن کا تعلق مطالعے سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں تصوف آمیز سادگی ہے۔

حسین الحق بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے لیکن بحیثیت ناول نگار بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ تین ناول اشاعت کی منزل سے ہمکنار ہو چکے ہیں جن میں ان کا پہلا ناول 'بولو مت چپ رہو' ہے جو 1990 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں موصوف نے آزادی کے بعد تعلیمی نظام میں جو تبدیلیاں آئیں اور کس طرح افسر شاہی نے اس مقدس پیشے سے وابستہ افراد کی عزت کا کھلواڑ بنایا ہے اس کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ ہی نکسلیوں کی تحریک کو پیش کیا ہے۔ اس ناول کا ایک کردار سابق انقلابی اور موجودہ ہیڈ ماسٹر افتخار الزماں معاشرے سے کٹا ہوا فرد ہے۔ اس نے آزادی کی تحریک میں جمہوریت، مساوات اور معاشی عدل کے خوابوں کی تکمیل کے مقصد سے حصہ لیا تھا لیکن آزادی کے بعد اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے یاران ہم پیالہ وہم نوالہ کامیاب دنیادار بن جاتے ہیں۔ ماسٹر چونکہ ایماندار ہے اس لیے اپنے چاروں طرف پھلنے پھولنے والی بدعنوانی، ہوس اور لوٹ کھسوٹ کے درمیان وہ اپنے آپ کو قائم کردہ اسکول کے قلعے میں محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو انسانیت، رواداری اور خدمت خلق کو اپنا شعار سمجھتا ہے۔ تحریک آزادی کے زمانے کی حب الوطنی، انسان دوستی، فرقہ وارانہ یگانگت اور قربانی کے جذبات آزادی کے بعد کے چند ہی سالوں میں ہوس پرستی، لالچ، استحصال اور فرقہ واریت کی مہیب شکل میں تبدیل ہو گئے اور ماسٹر افتخار الزماں جیسے لوگ پرانی اور فرسودہ اقدار کے امین بن کر رہ گئے۔

موصوف کا دوسرا ناول 'فرات' 1992 میں شائع ہوا۔ یہ 296 صفحات پر مشتمل وسیع کینوس کا ناول ہے جس میں نئی نسلوں میں کس طرح ذہنی، جذباتی اور اخلاقی تبدیلیاں رونماں ہوتی ہیں اسے مصنف نے صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ ناول اپنے اسلوب اور موضوع کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ اس میں نسلوں کے تصادم کو بڑی ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار وقار احمد کی ساری زندگی مجاہدے میں گزرتی ہے۔ یہ ناول ایک کرداری ناول ہے جس میں مصنف نے اس ناول کے مرکزی کردار کے توسط سے پانچ نسلوں پر مشتمل ایک حقیقی کہانی قاری کے سامنے پیش کی ہے ساتھ ہی غور و فکر کرنے کے اوقات بھی فراہم کیے ہیں۔ الماس فاطمہ اپنے تحقیقی مقالے میں رقمطراز ہیں کہ:

''حسین الحق نے اپنے ناول میں دو تہذیبوں کے تصادم کے علاوہ جنسی، نفسیاتی اور معاشرتی پیچیدگیوں کی سچی تصویر کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں لفظوں کے ذریعے ایسی فضا کی تخلیق کی ہے جس کی آرائش و زیبائش، حسن و جمال، دلکشی اور دلفریبی، سادگی اور روانی کے سحر میں قاری ناول ختم کرنے کے بعد بھی گرفتار رہتا ہے۔ حسین الحق نے ہمارے آس پاس کی زندگی کو جس طرح محسوس کیا ہے ویسا ہی اس ناول میں بیان کیا ہے۔''

(مشرف عالم ذوقی کے ہمعصر ناول نگار: کشمیر عظمیٰ)

مصنف نے فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے اپنے بچپن، والد کی زندگی، نظریۂ حیات اور تہذیبی و معاشرتی اقدار کی تصویر کشی کی ہے۔ مرکزی کردار وقار احمد پٹنہ یونیورسٹی کا طالب علم ہے جہاں کلیم عاجز جیسے استاد کی صحبت ملی۔ ایم اے کے بعد نوکری لگ گئی۔ اپنی محنت اور لگن سے ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور پرانی بستی کو خیر باد کہہ شہر کی ایک پوش کالونی میں ذاتی خوبصورت مکان 'سہسرام ہاؤس' بنواتے ہیں۔ یہاں دو نسلوں اور دو تہذیبوں کے تضاد و تصادم رونما ہوتے ہیں۔ اس میں وہی تکنیک استعمال کی گئی ہے جو اکثر فلموں میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ کسی کردار کا ہمزاد اس کے مد مقابل اگر محو گفتگو ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح وقار کا ہمزاد بھی اس سے باتیں کرتا ہے۔ یہ تین نسلوں کے اقدار کا احوال بیان کرتا ہے جو آسان کام نہیں ہے۔ اس میں تمام رشتے جبلتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے کردار اس کربیہ صورت حال کو جھیلتے ہیں۔ روحانی، اخلاقی تعلقات کی پامالی کھل کر سامنے آتی ہے۔ تبریز اور شبل کے کردار کے مابین بڑا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ شبل تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے۔ لیکن وہ تبریز کی مانند اپنی زندگی کو تعفن بھرے ماحول کا حصہ نہیں بننے دیتی۔ اس کی روشن خیالی اور آزاد خیالی اس کی فکر سے جھلکتی ہے لیکن عملی طور پر وہ ان غلاظتوں میں ملوث نہیں ہوتی جسے تبریز اپنی زبان میں تہذیب کے خفتہ کا خون سمجھتا ہے۔ ناول کے متعلق انور پاشا رقمطراز ہیں:

''حسین الحق' کا 'فرات' معاصر ناول میں موضوعی اعتبار سے قدرے الگ جہتیں رکھتا ہے۔ یہ ناول جنریشن گیپ (Generation Gap) اور بدلتے تہذیبی و معاشرتی اقدار سے پیدا شدہ صورت حال کو موثر انداز میں لاتا ہے۔ تین نسلوں کے درمیان موجود ذہنی اور معاشرتی تہذیبی و اخلاقی قدروں کے تصادم سے ناول کا ہیولیٰ تکمیل پاتا ہے۔ زبان و اسلوب میں رچاؤ اور چاشنی بیانیہ کو تازگی عطا کرتی ہے۔''

(معاصر اردو افسانے کے تہذیبی و سماجی سروکار، کتابی سلسلہ 7، نیا سفر، دہلی)

جہاں تک اسلوب بیان کا معاملہ ہے تو اس میں اظہار کی بے باکی، فکر کی ندرت اور لہجے کا توازن ناول کو ایک الگ انداز دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف شعری آہنگ سے اپنی نثر کو پر اثر بنانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تشبیہات و استعارات کے استعمال سے نثر میں بے ساختگی اور بے تکلفی بھی پیدا ہوئی ہے۔ بقول ڈاکٹر احمد صغیر:

''یہ تشبیہات و استعارے زیب داستاں کے لیے نہیں لائے گئے ہیں بلکہ ناول کی داخلی ضرورت بن کر سامنے آئے ہیں جن کے بغیر وہ جذبہ یا احساس قاری تک پہنچ ہی نہیں سکتا جو پہنچانا شاید ناول نگار کا مقصد ہے۔'' (اردو ناول کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد، ص 120)

عام طور پر حسین الحق اسلامی استعاروں سے کام لیتے ہیں۔ اس ناول میں بھی فرات زندگی اور خوش حالی کی علامت ہے اور ایک طرف انسانیت اس کے کنارے کھڑی پیاس سے نڈھال ہے۔ موصوف کے طرز نگارش کے ضمن میں یہ کہنا درست ہوگا کہ انہوں نے اس ناول میں اظہار کے ان تمام وسائل سے کام لیا ہے جن سے اسلوب کو منفرد اور فن کو عظیم بنایا جا سکتا ہے۔ ناول کی اثر پذیری کی بحث سے قطع نظر اس ناول میں معنوی اور اسلوبیاتی سطح پر تنوع کے ساتھ ساتھ وسعت بھی دکھائی دیتی ہے، جس کے حوالے سے قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر میں ہندوستانی معاشرتی تہذیب پر مغربیت کا کافی گہرا اثر ہے اور سیاسی وضع قطع تو بالکل فرنگی نقطۂ نظر سے مملو ہے۔ اور انھیں وجوہات و علل سے انسانی اخلاقی اقدار کی پامالی رونما ہوئی ہے۔ جدید مغربی تصورات و تفکرات نے انسانی فلاح و بہبود کے لیے فلسفیانہ موشگافیوں کی دقتیں بھی سہیں مگر کوئی بھی فلاحی فلسفہ انسانی معاشرے کے لیے حیات کا درماں نہ بن سکا۔ اور تیسرا ناول ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ 'اماوس میں خواب' (2017) ہے۔ اس ناول کا موضوع ملک کے موجودہ سیاسی و سماجی حالات تھے۔ اس کا کینوس وسیع ہے جس میں آزادی کے بعد مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات و انقلابات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

حسین الحق اپنے دور کے ان تخلیق کاروں میں سے تھے جن کے بغیر اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ بحیثیت ناول نگار ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ تنقید پر بھی انہوں نے گہری نظر ڈالی ہے اور ان کا اسلوب بھی اپنے ہم عصروں سے مختلف ہے۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے عہد اور ماحول کے تضادات کی ترجمانی کرتی ہیں جس میں افسانوی انفرادیت کے ساتھ ساتھ فکشن کی نئی جمالیات بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کو دیے ایک انٹرویو میں وہ اپنے وسیلہ اظہار کے طور پر فکشن کے انتخاب کے ضمن میں کہتے ہیں کہ:

''میرے خیال میں لکھنے والا خود کسی صنف کا انتخاب نہیں کرتا۔ شاید صنف لکھنے والے کا انتخاب کرتی ہے کیونکہ اختر اورینوی، آل احمد سرور، کلیم احمد، احتشام حسین، شمس الرحمٰن فاروقی سب نے شاعری کے انتخاب کی کوشش تو کی اور اس کے نمونے بھی پیش کیے مگر جس صنف نے مذکورہ بالا حضرات کا انتخاب کیا وہ حضرات شاعر نہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں لکھنے والے کی مرضی نہیں چلتی۔ خود میرا بھی یہی معاملہ ہے۔ شاعری کی ہے اور جم کے کی ہے۔ میری کاپیوں میں کم از کم سو غزلیں اور ڈیڑھ سو نظمیں موجود ہیں۔ مضامین بھی لکھے اور چھپے بھی، واہ واہ بھی ہوئی مگر وہ مولوی مدن کی سی اگر افسانوں میں ہی پیدا ہوئی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ شاعری اور مضمون تو میرا انتخاب تھا مگر میں دراصل فکشن کا انتخاب ہوں۔''

(ایک انٹرویو، ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، دسمبر 2003)

حسین الحق کو دیر سے ہی سہی ان کے ناول 'اماوس میں خواب' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2020 سے نوازا گیا۔ ان کی ادبی کاوشوں کے مد نظر انھیں غالب ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ ان کے جانے سے اردو فکشن میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی بھرپائی اس صدی میں مشکل ہے۔

■

Dr. Md. Sharib
Vill.: Masihani, Tola Mandeya
P.S.- Chhatarpur- 822113
Dist.- Palamu- Jharkhand
Mob.:9835938234

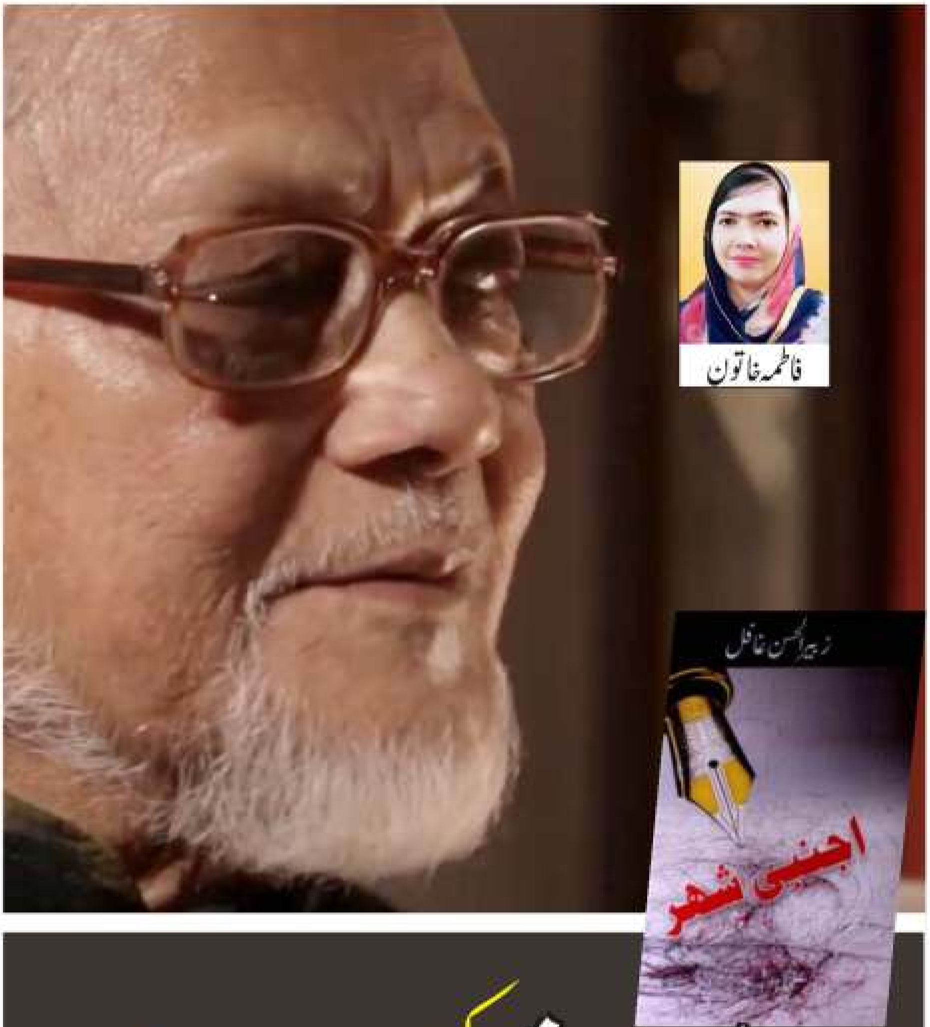

فاطمہ خاتون

زبیر الحسن غافل کی شاعری کے امتیازی پہلو

اجنبی شہر میں داخل ہونے سے پہلے لوگ کافی محتاط رہتے ہیں، پتہ نہیں وہاں کی سرزمین ہمیں کیا رنگ وبو دکھائے، لیکن جب اس کی سیر کی جاتی ہے تو ہمیں کئی نئی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ شہر ہمارے لیے اجنبی تھا اور وہاں کی ہر چیز سے ہم ناآشنا تھے، چونکہ ناآشنا چیزیں ہمارے شعور ولاشعور کو بہت جلد متاثر کرتی ہیں، لہٰذا ہم نئی کیفیت اور ناآشنا چیزوں سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، کم وبیش یہی حالت میری بھی ہوئی جب میں نے مجموعہ 'اجنبی شہر' کے حوالے سے زبیر الحسن غافل کی شاعری کا مطالعہ کیا تو ان کی متنوع خوبیوں سے روشناس ہوئی قبل اس کے اتنی جہتوں سے آشنا نہیں تھی، گویا ان کے اس مجموعے نے مجھ پر سحر کا سا اثر کیا۔ زبیر الحسن غافل نے اپنے اس مجموعے میں زندگی کے کئی رنگ بکھیرے ہیں۔ اس میں حمد اور نعت کی شکل میں، اللہ اور ہمارے پیارے نبی حضورؐ سے محبت کا اظہار ملتا ہے، تو 'سوزِ جگر' کی غزلیں ان کے جگر کا درد آشکارا کرتی ہیں، کبھی وہ 'شوخیِ نظر' کا تیر چلاتے ہوئے مزاحیہ انداز میں ملک کی سماجی وسیاسی حالت پر چوٹ کرتے نظر آتے ہیں تو وہیں وہ 'رنگ دِگر' کے ذریعے اپنی طرحی غزلوں سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ 'سلک گہر' کے متفرقات موضوعات کے ذریعے وہ اپنی ادبی صلاحیت کا لوہا منواتے ہیں، وہیں جب ہم 'دیدہ تر' کو دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں غافل صاحب کے دردمندانہ اظہار کے ذریعہ نم ہو جاتی ہیں، آخر میں اس 'اجنبی شہر' کی منزل 'نقش ہنر' پر ختم ہوتی ہے، جہاں معزز شخصیات نے 'اجنبی شہر' اور اس کے خالق زبیر الحسن غافل کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرکے ہماری معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ زبیر الحسن غافل کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر بھی کیا ہے۔ 'اجنبی شہر' کے آغاز سفر میں بھی مختلف قلم کاروں نے 'نقد ونظر' کے ذریعے زبیر الحسن غافل کی شاعری کو ادب کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی شاعرانہ بصیرت اور ان کی انفرادی صلاحیت کا برمحل اظہار کیا ہے۔

زبیر الحسن غافل کا تعلق بہار کے ضلع ارریا سے ہے، ان کا شمار ارریا کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں، ان کے کام اور مزاج میں مجھے بڑا تضاد نظر آیا، جو ڈیشیل مجسٹریٹ جیسے سنجیدہ عہدے کا انسان اتنے اعلیٰ پایے کی ظریفانہ شاعری کر سکتا ہے، یہ کافی متاثر کن ہے۔ ظریفانہ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے نانا فرزند علی شیدا اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے، ان کے ماموں اسلام الدین مخمور وکیل ہونے کے ساتھ اچھے شاعر بھی تھے، اور ظریفانہ رنگ میں شعر کہتے تھے۔ ان کے والد ظہور الحسن بھی اچھی شاعری کرتے تھے۔ گویا وکالت اور شاعری مشترکہ طور پر ان کے خون میں شامل ہے۔ زبیر الحسن غافل نے اپنی وکالت کے دوران سماج کے مختلف مسائل کو قریب سے دیکھا، انھیں ظالم ومظلوم دونوں کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ ملک کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ زندگی کے تلخ وشیریں تجربے کو مزاحیہ انداز میں قاری کے گوش گزار کردیتے ہیں، تاکہ موضوع کی تلخی قاری کو گراں نہ گزرے، یوں نیم کی گولی کو شوگر کوٹیڈ کرکے وہ قاری کو پیش کردیتے ہیں۔

زبیر الحسن غافل کی شاعری پر غالب، اکبرالہ آبادی، اور فیض احمد فیض کا اثر نظر آتا ہے۔ ظریفانہ رنگ میں وہ غالب سے متاثر نظر آتے ہیں تو طرز فکر میں وہ اکبرالہ آبادی سے زیادہ قریب ہیں، وہیں موضوع کے اعتبار سے وہ فیض احمد فیض کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم زبیر الحسن غافل کا انداز جدا ہے۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقت کو بڑے سلیقے کے ساتھ سادہ اور سلیس انداز میں شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ رشوت خوری ہمارے سماج کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ ہر طرف رشوت کی بدولت نااہل لوگ بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اسی کی بدولت مفاد پرست انسان اپنا کام آسانی سے نکال لیتا ہے، جب کہ ایماندار انسان خاموش تماشائی بن کر در در کی ٹھوکر کھاتا رہ جاتا ہے۔ ہمارے مکروہ سماج کے اس ناسور کو کریدتا ان کا ظریفانہ انداز دیکھیے۔

ہر بار نیا ایک کرشمہ یہ دکھائے
معصوم کو پھانسے کہیں مجرم کو بچائے
الزام بھی کچھ لکھے بناپاس کرائے
رشوت کے مقدمے سے بھی رشوت ہی چھڑائے
جاری ہے اس کا فیض ہراک خاص وعام پر
فن وشعبدہ کا ختم اسی کے ہے نام پر
(رشوت)

زبیرالحسن غافل کی شاعری صرف ہنسنے ہنسانے تک محدود نہیں بلکہ وہ سنجیدگی کے ساتھ سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں، جو کسی بھی بالیدہ ذہن کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہے۔ گویاان کی نظمیں ہمیں پیغام دیتی ہیں کہ ہم خود کو کس طرح حالات سے نبرد آزما کریں، اوراپنے سماج کی اصلاح کریں۔

موضوع خواہ سیاسی ہو یا سماجی لیکن انھوں نے شعری محاسن کو کبھی مجروح ہونے نہیں دیا۔ان کی شاعری میں فکروفن کا حسین امتزاج نظرآتا ہے۔

زبیرالحسن غافل ہر برائی کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں، مگر کہیں بھی جارحانہ رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ سادگی وسلاست کے ساتھ اپنی بات رکھتے ہیں، وہ نئی تہذیب کی عریانی سے بیزار نظرآتے ہیں، مگر انھوں نے اکبرالہ آبادی کی طرح نئی تہذیب کے خلاف محاذ نہیں کھولا بلکہ دھیمے انداز میں اس تہذیب کی شکایت کی ہے کیوں کہ اس نئی تہذیب نے ہم سے ہمارا اخلاق، ثقافتی ورثہ اور شرم وحیا کو Modernism کے نام پر چھین لیا ہے۔

شرم آنکھوں سے رخ سے حیالے گئی
جانے تہذیب نو اور کیالے گئی

زبیرالحسن غافل کی شاعری میں جہاں طنزومزاح کا نشاطیہ پہلو ہے وہیں ان کی غزلوں میں کلاسیکی شاعری کی بیش بہا خصوصیات بھی موجود ہیں۔انھوں نے اصل زندگی کے تمام لوازمات کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ان کے یہاں فلسفۂ حیات ہے تو عشق کی تپش بھی، دنیا کی بے ثباتی کا کرب ہے، تو حوصلہ واستحکام بھی، غرض ان کی شاعری میں نشاطیہ کرب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔زبیرالحسن غافل کی شاعری کی خصوصیات کے متعلق حقانی القاسمی اپنے مضمون صرصر سے الجھتی صبا: زبیرالحسن غافل کا تخلیقی مد و جزر میں لکھتے ہیں کہ:

''زبیرالحسن غافل کی شاعری میں 'نشاطیہ کرب' کی بھی بہت مثالیں ملتی ہیں۔دراصل یہی نشاطِ غم ہے جو زندگی کا اصل فلسفہ ہےاوراسی فلسفے سے انسانی زندگی میں امیداور رجا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔تمام تر خطرات کے باوجود امید و رجا کا شاعر زندگی کو نہایت آزادہ روی کے ساتھ گزار دیتا ہے۔دیکھا جائے تو کلاسیکی شاعروں کی طرح غافل میں بھی ایک جنون اور دیوانگی کی کیفیت ہے اوراسی مقدس دیوانگی نے ان کی زندگی کے زاویے اور حیات و کائنات کے نظریے کو اثباتی رنگ عطا کیا ہے۔حیات و کائنات کے تضادات میں انھوں نے جو توافق تلاش کیا ہے، وہ توافق اُن کے اندرون اور ذہنی وفکری صحت مندی کا اشاریہ ہے''

(مجموعہ 'اجنبی شہر'، از، زبیرالحسن غافل، براون بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2015، ص: 38-37)

موصوف کی زندگی کا اشاریہ ان کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں متنوع موضوعات پر اشعار مل جاتے ہیں۔ان کی غزلوں کے مختلف موضوع پر متفرق اشعار ملاحظہ ہو۔

بے نام آدمی جو سرشام ہوگیا
سورج کے شہر میں وہ اندھیراہی کرگیا

کبھی جوگزرا تیری گلی سے چراغ یادوں کے جل گئے ہیں
نظر جوآئی تمہاری چوکھٹ جبیں پہ سجدے مچل گئے ہیں

غافل کے لبوں پر ہنسی دیکھی تھی ہم نے
کچھ لوگ مگر کہتے ہیں آنکھوں میں نمی تھی

سلیقہ جن کو تھا رنج والم میں جینے کا
غموں کی دھوپ میں وہ اور بھی نکھر آئے

'اجنبی شہر' کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ زبیرالحسن غافل نے اردو شاعری کی تقریباً ہر صنف میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے، شخصی مرثیے کی اگر ہم بات کریں تو انھوں نے اپنے والد محترم کے لیے 'والد کی وفات پر' اور اپنے لخت جگر کا مرثیہ بعنوان 'اپنے مرحوم بیٹے اشعر حسن آشی کی نذر' لکھ کر اپنے درد کا اظہار کیا ہے۔زبیرالحسن غافل نے اپنے رنج وغم کو اس دردمندانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی شاعری کا منفرد رنگ وآہنگ آشکار ہو جاتا ہے۔

زبیرالحسن غافل نے پیروڈی کے ذریعے بھی اپنی شعری صلاحیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی پیروڈی میں تک بندی کی خامی نہیں بلکہ فکرو معنی کی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ انھوں نے مشہور شعرا غالب، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری اور دیگر شعرا کی زمین میں پیروڈیاں لکھ کر ان سنجیدہ موضوعات کو طنزومزاح کی دلکشی اور تازگی سے آراستہ کردیا ہے۔ ان کی پیروڈی میں 'دیتے ہیں دھوکا یہ لیڈر کھلا' (برغزل غالب) 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' اور 'خلد شیشے میں' شامل ہیں۔ایک بند دیکھیے۔

میں نے سمجھا تھا جنوں عشق کا گھٹ جائے گا
تو بھی اکتا کے مرے راہ سے ہٹ جائے گا
تھا نہ معلوم کہ وہ دن بھی کبھی آئے گا
بھوت کی طرح تو مجھ سے چمٹ جائے گا
اب میں بچوں کو کھلاؤں کے تجھے پیار کروں
تیری زلفوں کو سنواروں کہ میں بازار کروں
کیا دیا تو نے مجھے شادی کی جھنجھٹ کے سوا
حاصل عشق ہے کیا روز کی کھٹ پٹ کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
(پیروڈی 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ')

زبیرالحسن غافل کی طرحی غزلوں کی خاصی تعداد بعنوان 'رنگ دگر' ان کے مجموعے 'اجنبی شہر' میں شامل ہیں۔ان کی طرحی غزلیں درجہ کمال کی ہیں، جن میں ان کی شاعری کے سنجیدہ گوشے نظرآتے ہیں، ان میں سلاست وفصاحت اور غنائیت کی حسین رنگا رنگی ہے جو ان کی شاعری کو پراثر و پرلطف بناتی ہے۔شعر ملاحظہ ہو۔

کہیں یادوں کے کانٹے تھے کہیں تھے درد کے پتھر
تمھارے شہر میں کتنی پریشانی سے ہم گزرے

شاعری میں صنف ماہیا وہ صنف شعر ہے جس میں تین مصرعوں میں شاعر اپنی بات کہتا ہے، اس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم وزن جب کہ درمیانی مصرع کے دو حروف پہلے اور آخری مصرع کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں۔یہ پنجاب کی مشہور صنف ہے جو بنیادی طور پر گائی جانے والی صنف ہے، زبیرالحسن غافل نے نہ صرف اس صنف میں طبع آزمائی کی بلکہ کامیاب بھی ہوئے مثال دیکھیے۔

گجرا ابھی تازہ ہے
ایسے میں آجاؤ
موسم کا تقاضہ ہے

مجموعہ 'اجنبی شہر' میں زبیرالحسن غافل کی شاعری کی الگ دنیا آباد ہے، جس میں سنجیدہ ذہن کا انسان ظریفانہ انداز میں سماج کے مسائل، انسانی نفسیات، سیاست کی بے حسی، ثقافت کا بکھرتا شیرازہ اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ان کی شاعری کا نشاطیہ کرب ہمیں احساس دلاتا ہے کہ زندگی کی حقیقت پر ہنسنے والا اندر سے ٹوٹا اور بکھرا ہوا بھی ہوسکتا ہے۔تاہم یہ زبیرالحسن غافل کی شاعری کا امتیازی پہلو ہی ہے، جو ہماری آنکھوں میں نمی لاکر بھی ہونٹوں پر مسکان بکھیر دیتا ہے۔

■

Dr. Fatma Khatoon
B-40/8, 3rd Floor, Iron Gate
Garden Reach
Kolkata - 700024 (West Bengal)
Mob.:9831726195
Email.: fatmakhatoon2809@gmail.com

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

فیاض انور صبا

ہمارا علاقہ 'جگتدل' مضافات کہلاتا ہے جو کولکاتا سے 36 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ جوٹ ملوں کی بستی ہے جہاں چاروں طرف مزدور طبقہ آباد ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو مل مالکان کی طرف سے رہائش کی خاطر قلی لائن میں چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل گھر تفویض کیے جاتے ہیں۔ انہی گھروں کے بازو میں ایک چھوٹا سا جھونپڑی نما گھر ہے جہاں میں نے بچپن میں ابتدائی تعلیم مولوی محمد حنیف صاحب سے حاصل کی۔ مولوی صاحب جسمانی طور پر معذور تھے اور چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔ ایک کھاٹ پر نیم دراز ہوکر دلجمعی کے ساتھ ایک ذمہ دار استاد کی طرح درس دیا کرتے تھے۔ ان کی کڑک دار آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ یہ چھوٹی سا کٹیا نما مدرسہ تعلیم و تربیت کا گہوارہ تھا۔

بچوں کو ابتدائی طور پر اردو قاعدہ پڑھانے کے علاوہ 'تعلیم الاسلام' نامی ایک پتلی سی کتاب بھی پڑھائی جاتی تھی۔ بچوں کے ذہن و دل میں اسلامی آداب اور علوم دینوی پیوست کرنے کی یہ بہت کارآمد کتاب تھی علاوہ ازیں درجہ بندی کے لحاظ سے اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب بھی درس میں شامل تھی۔ یہ کتابیں انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرز پر شائع شدہ تھیں۔

عادات و اطوار کو سنوارنے اور پیکر اخلاق بنانے میں ان کتابوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس کے باعث ہماری زندگی میں ان کے اثرات پوری طور پر اثر انداز ہوئے اور اس کا بھرپور فائدہ بھی حاصل ہوا۔

جگتدل اولڈ مسک مکتب پرائمری اسکول میں جناب محمد اسلم انصاری، ڈاکٹر معصوم شرقی، نور اقبال اور رمضان علی جیسے شفیق اساتذہ کی ذہنی آبیاری کا صلہ یہ ملا کہ زبان اردو کی تعلیم بہتر طریقے سے حاصل ہوئی۔ نتیجتاً درجہ چہارم میں اول پوزیشن سے کامیابی ملی۔

پرائمری اسکول سے فارغ ہونے کے بعد جگتدل چشمۂ رحمت ہائر سکنڈری اسکول میں داخلہ ہوا۔ اسکول میں ہندی و اردو میڈیم دونوں زبان کے طلبا مشترکہ طور پر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہاں لائف سائنس کے استاد شری رام آگیا رائے تھے۔ ان کی تصنیف شدہ کتاب 'سگم جیو وگیان' جو ہندی میں چھپی تھی درس دیا کرتے۔ اس طرح اردو کے طلبا کو سمجھنے میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ مجھے تھوڑی بہت ہندی زبان آتی تھی لہٰذا میں نے ان سے اجازت لے کر پوری کتاب اردو میں ترجمہ کرنے کی ٹھان لی۔ اللہ کا شکر ہوا کہ محنت رنگ لائی اور میں نے اس کام کو جانفشانی اور لگن کے ساتھ مکمل کیا۔ ماسٹر صاحب کی حوصلہ افزائی نے بڑا کام کیا اور مدھیامک کے فائنل امتحان میں مجھے اس مضمون میں بہتر نتائج حاصل ہوئے۔ اس کارکردگی کے سبب میرے اندر کچھ لکھنے کا شوق پروان چڑھنے لگا۔

میرے والد محترم کا ایک ادبی و تعلیمی حلقہ تھا جہاں ان کے چند احباب جناب محمد عیسیٰ، ولی اللہ انصاری اور ایک اردو داں شری کالی چرن 'شمع ادبی معمہ' کے دیوانے تھے۔ ان کی محفلوں میں شامل ہوکر میں یہ مشاہدہ کرتا کہ وہ لوگ ایک جملے کے درمیان خالی جگہ پر موزوں الفاظ کو پر کرنے کے لیے بحث و مباحثہ کرتے تھے اس طرح مجھے مختلف اور نئے نئے الفاظ کو سمجھنے اور سیکھنے کا موقعہ ملا۔ ویسے میرے اندر کتب بینی کا شوق ابتدا سے ہی دماغ میں جگا رہا۔

محلے کے چائے خانے میں کولکاتا کا مشہور زمانہ اخبار 'آزاد ہند' آتا تھا جو احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا۔ ابو کو یہ فکر ہمیشہ لاحق رہتی کہ کس طرح اردو کی تحریر خوشخط ہو اور نگارشات (نامی گرامی ہستیوں کے) ذہنوں میں محفوظ رہے۔ اس ضمن میں ادارتی صفحہ کے تراشے لاکر ہمیں دیتے اور فرماتے کہ اسے دیکھ دیکھ کر من و عن خوبصورتی کے ساتھ لکھنا اور مجھے دکھانا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری تحریر نکھرنے لگی۔ یہ میری خوش نصیبی رہی کہ ایک مدت کے بعد اسی آزاد ہند کے دفتر میں بطور خوش نویس خدمت کا موقع ملا۔ لوگوں کی ارسال کردہ وہاں مختلف النوع تحاریر پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میں بہ آسانی ہر طرح کی ہاتھوں کی لکھی ہوئی مشکل سے مشکل عبارت پڑھنے میں ماہر ہوگیا۔

کولکاتا میں Publisher and book seller guild نامی مشہور و معروف ادارے کی توسط سے ہر سال کتاب میلہ Book fair کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایک بار میلے میں ایک بک اسٹال پر کتابوں کی ورق گردانی کے دوران 'ماہم سے کھاڑی' نامی ایک کتاب پر میری نظر پڑی جو مراٹھی زبان سے اردو میں ترجمہ شدہ تھی اور اس کے مصنف مراٹھی کے بے حد مقبول و معروف ادیب 'مدھو منگیش کارنک' تھے جو پدم شری ایوارڈ سے نوازے جا چکے تھے؛ خرید لی۔ میں نے یہ کتاب مراٹھی سے اردو زبان میں ترجمہ شدہ یہ کتاب مجھے بے حد پسند آئی۔

ممبئی میں ماہم کے کنارے چاروں طرف پھیلی ہوئی بے ہنگم جھونپڑیوں کے مکینوں کے تعلق سے وہاں کی سماجی، سیاسی و گھریلو حالات پر مبنی اس کتاب کی کہانی دلچسپ حقائق سے لبریز تھی۔ مصنف رقمطراز ہے "سالا جس علاقے میں لوگ پائپ کو توڑ کر چوری کا پانی پیتے ہوں وہاں کی ذہنی پستی کا عالم کیا ہوگا؟" سرے عام جوا کھیلنا، چوری کرنا، مختلف طریقے سے واردات انجام دینا، پیسوں کے لیے عصمت کی نیلامی کرنا ان کے ہاں ایک عام سی بات ہوا کرتی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر مکانات کی کمی کے باعث بحالت مجبوری ان جھونپڑیوں میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو کسی دفتر میں کام کرتے ہیں اور گھر سے نکلتے وقت بغل میں انگریزی اخبار دبائے سر جھکائے نکل پڑتے ہیں۔

مصنف نے بڑے فنکارانہ طریقے سے وہاں کا نقشہ پیش کیا ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر ہم رہ نہ سکے۔

نسائی کیفیات، ذہنی کشمکش کی شکار عورتوں کے جنسی، نفسیاتی، اور سماجی مسائل پر منفرد انداز میں تحریر رقم کرنے والی اردو ادب کی مشہور و معروف ادیبہ واجدہ تبسم

کی کتابیں خصوصاً نتھ سیریز پر شائع شدہ جیسے نتھ کی لاج، نتھ اترائی، نتھ کی عزت اور اترن کا مطالعہ کرنے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سماج میں نہ جانے کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں جن کو صرف اپنی بری خواہشوں کے تکمیل کی فکر ہوتی ہے۔ انجام سے بے پرواہ یہ لوگ درندگی کی انتہا کو پہنچ کر سماج میں زہر گھول دیتے ہیں۔ مصنفہ نے ایسے لوگوں کو بے نقاب کرتے ہوئے متاثرہ عورتوں کی ذہنی کیفیات کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ جہاں درد، سسکتی آہیں، کراہ اور مختلف النوع سماجی و نسائی مسائل کی جیتی جاگتی تصاویر ذہنوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

میں خود کو زبان اردو کے تعلق سے خوش قسمت مانتا ہوں کہ مجھے کولکاتا کے محمد جان ہائر سکنڈری اسکول میں داخلہ ملا جہاں ظہیر انور جیسی شخصیات (اردو کے معروف ادیب) کے علمی ذخائر سے کچھ نایاب گوہر تلاش کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

والد صاحب کی رحلت کے بعد کفالت کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر آن پڑی۔ ان دنوں اسکول مارننگ شفٹ میں جاری تھا لہٰذا وقت کی بچت کے باعث تگ و دو کر کے میں نے زکریا اسٹریٹ کے ایک پریس بنام 'دی اعجاز پرنٹرس' میں نوکری حاصل کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد پریس کے مالک عطاء الرحمان صاحب کے چھوٹے بھائی جناب ف۔ س۔ اعجاز نے اردو کا ایک منفرد رسالہ 'انشا' کے نام سے جاری کیا۔ زبان سے رغبت کی بنا پر میں نے ان کے رسالے کی تشہیر و توسیع میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس جنونی مدیر کے ادبی کارنامے کی وجہ سے ان کے ساتھ اول سے ہی پیش پیش رہا ہوں۔ ادبی تخلیقات کو منفرد انداز میں پیش کرنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ مختلف نمبر اور گوشے کی اشاعت نے ان کو قومی سطح سے بین الاقوامی مدیر بنا دیا۔ سرورق کی تزئین وہ خصوصی طور سے کرتے ہیں جو قاری کو دعوت فکر دیتی نظر آتی ہے۔

انشا کے کور پیج میں نظم و غزل کی پیشکش، پوری دنیا سے ڈھونڈ کر مختلف مکتبہ فکر کے ادبا و شعرا کی نثری و منظوم تخلیقات اس رسالے کو منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ ادارتی صفحہ کا بغور جائزہ لیں تو آپ فکر کی عمیق گہرائی میں غوطہ زن ہو جائیں گے۔ اس رسالے کی خصوصیت سے میں ہمیشہ متاثر رہا ہوں۔

اعجاز صاحب نے 'عالمی افسانہ نمبر' شائع کیا تھا جس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ فہرست میں کل 73 افسانے تھے اور ہر افسانہ نگار کے عنوان کے سامنے 73 اشعار درج کیے گئے تھے جو عنوان سے مطابقت رکھتے ہوئے تھے اور تمام اشعار از خود ان کے تھے۔

فی الوقت انشا پبلی کیشنز کا 26 واں خاص نمبر 'گوا شمارہ' آسمان ادب پر بالکل نئی طرز کی کمند ڈال چکا ہے۔ اس حیرت انگیز و منفرد کتاب نے ادبی حلقے میں تجسس کے اک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ مدیر نے کافی مشقت کے بعد بہت عرق ریزی سے کتاب مکمل کی ہے۔ اس بات پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ گلزار صاحب نے سرورق کی پینٹنگ بڑی کمال کے ساتھ کی ہے۔ قومی و بین الاقوامی سطح کے چنندہ ادبا و شعرا کی بہترین تخلیقات سے مزین یہ شمارہ اک نئی سمت کی طرف گامزن ہے۔

اردو کے چند جنونی علمی و ادبی دوستوں کے توسط سے جگتدل کے رستم گمٹی نامی پسماندہ علاقے میں ایک لائبریری کی بنیاد ڈالی گئی۔ سات ستاروں سے جڑی اس کا نام سیون اسٹارس لائبریری رکھا گیا۔

ہم لوگوں کی کاوشوں نے اپنا رنگ دکھلانا شروع کر دیا۔ لوگ ہماری طرف متوجہ ہونے لگے۔ آس پاس کے اردو اسکولوں کے اساتذہ سے رابطہ کر کے لائبریری میں بچوں کو ساتھ لے کر آنے کی دعوت دی گئی اور طلبہ میں لائبریری کی اہمیت و افادیت کے متعلق کلاس کے دوران بیان کرنے کی گذارش کی گئی۔ چھٹیوں میں علاقے کے عوام سے لائبریری میں شام کے وقت آکر مطالعے کی بابت پیغام دیا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد ہم لوگوں نے ایک ادبی مجلّہ شائع کرنے کی ٹھان لی۔ حالات ناموافق ہونے کے ساتھ ساتھ تمام متحرک ارکان بے روزگار تھے۔ بہر حال زبان اردو کی ترقی کے لیے ہم لوگوں نے تگ و دو شروع کر دی۔ سچی لگن اور بے لوث خدمت کا جذبہ کامیابی کی طرف بڑھتے قدم سے منزل کی طرف پہنچنا آسان ہوتا گیا۔

کتابت و چھپائی کے علم نے رسالے کی اشاعت میں کافی سہولت بخشی۔ لوگوں سے تعلقات کی بنا پر اشتہارات بھی بہ آسانی ملتے گئے۔

پروفیسر محمد منصور عالم نے مجلّے کا نام 'صدف' رکھنے کا نیک مشورہ دیا جسے تمام لوگوں نے سراہا۔ ہم سبھوں کی جانفشانی اور سخت محنت کی وجہ سے ہی رسالے کی اشاعت میں کامیابی ملی۔ اس کے تین شمارے شائع ہوئے جو جگتدل و کانکی نارہ کے لیے تاریخ کا حصہ بن گئی۔ جناب قیوم بدر نے ادارت کی ذمہ داری بخوبی نبھائی۔ معاون مدیران میں جناب خورشید اقبال اور اس خاکسار نے بھی تندہی کے ساتھ مل جل کر رسالے کی تزئین و معیاری مشمولات کی حصولیابی میں تن من دھن سے اپنا قیمتی وقت دے کر اسے تکمیل تک پہنچایا۔ سیون اسٹارس لائبریری کے فعال ارکان میں غلام محمود صدیقی، محمد عاشق علی، محمد حسین، محمد سمیع اللہ، محمد کلیم اللہ وغیرہ کا نام نہ لینا بددیانتی ہوگی۔

اس مجلّہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی ریسرچ اسکالر اس پرچے کی حصولیابی کے لیے ہمیں فون کیا کرتے ہیں۔ مجلّہ کی اشاعت کے مرحلے میں گوناگوں تجربات و مشاہدات حاصل ہوئے۔ ہر صنف کے ادبا و شعرا سے روبرو ہونے اور بہت کچھ سیکھنے و سمجھنے کا موقع ملا۔ 'صدف' کی کامیاب اشاعتی تکمیل میں مشہور و معروف شخصیات جیسے عبدالوہاب محسنی (مقبول و معروف آرٹسٹ) انور آرٹ پریس کے روح رواں جناب بدرالدین انصاری، حکیم محمد نظام الدین، پروفیسر محمد منصور عالم، وحید عرشی، حشم الرمضان، ف۔ س۔ اعجاز، حکیم محمد یوسف بخشی، بازغ بہاری، زماں قاسمی، ڈاکٹر معصوم شرقی، عظیم انصاری، وفا سکندر پوری، صابر اقبال، ڈاکٹر خورشید اقبال، ڈاکٹر ناصر علی امنی، بشیرالدین ناظمی، واقف رزاقی کے علاوہ اور بھی دیگر محبان اردو حضرات کا تعاون حاصل رہا۔ میرے ایک ہم جماعت شری بریندر کمار شاؤ (آرٹسٹ) کا بھی حصہ تھا کہ انھوں نے عنوان کی مطابقت و مفہوم کے مطابق تصویر اسکیچ کیا۔

'صدف' مجلّے کے تین شمارے شائع کرنے کا شرف اس علاقے کو حاصل ہے۔ اول تا آخر اشاعتی سلسلے کے گوناگوں تجربات نے زندگی کے تمام گوشوں پر متاثر کن اثرات مرتب کیے۔

لائبریری میں ہم لوگ مختلف موضوعات پر کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے کبھی رومانی تو کبھی مذہبی۔ ان میں سب سے زیادہ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن میں کبھی ایک، کبھی دو ناول پڑھ لیا کرتے تھے۔ دراصل ابن صفی جیسا ناول نگار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ طرز نگارش میں بلا کی چاشنی اور سماں باندھنے کا فن ان کو حاصل تھا۔ قاری ان کے ناول پڑھتے ہوئے اکیلے میں بے ساختہ ہنس دیا کرتا تھا۔ منظر کشی میں ماہر تھے۔ ادب، سائنس، سماجیات، معاشیات و دیگر فنون میں کمال کی قدرت رکھتے تھے۔ آج ہم جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں، وہ ان ہی کے ناولوں کے مطالعے کی دین ہے۔ زبان و بیان پر انھیں غضب کی مہارت حاصل تھی۔ میں ان کی تحریر کردہ لگ بھگ تمام کتابیں پڑھ چکا ہوں۔

■

Faiyaz Anwar Saba
P.L.B. Lane No.: 8/15 , PS: Jagatdal
North 24 Parganas - 743194 (WB)
Mob.:6290292939

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں
اردو تحقیق کی سمت و رفتار

سمیرا بانو

وادی کشمیر کی خوبصورت ترین اور دنیا بھر میں مشہور و شہرۂ آفاق ڈل جھیل کے کنارے واقع کشمیر یونی ورسٹی جموں و کشمیر میں علم و دانش کا ایک تابناک مرکز ہے۔ یہاں پر مختلف علوم وفنون کی درس وتدریس کے علاوہ تحقیق و دریافت میں بھی خاطر خواہ پیش رفت ہوتی ہے۔ جامعہ کے قیام سے ہی یہاں کے ہونہار طلبہ نے کارہائے نمایاں انجام دے کر ملک و بیرون ملک میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ یہاں قائم مختلف شعبوں میں پوسٹ گریجویشن اور ایم فل کے ساتھ ساتھ پی ایچ ڈی کے لیے بھی مقالات لکھے جاتے ہیں۔ دیگر شعبہ جات سے قطع نظر شعبہ اردو کی بات کریں تو یہ شعبہ یونیورسٹی کے اولین شعبوں میں سے ایک ہے۔ اس کا قیام 1958 میں عمل میں لایا گیا۔ یہاں اردو زبان وادب کے شیدائی اپنی تعلیمی، تحقیقی اور تخلیقی پیاس بجھاتے ہیں۔ شعبے سے فارغ التحصیل طلبا میں بعض اسکولوں اور کالجوں میں اردو درس وتدریس کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں اور بعض انتظامی امور بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

شعبہ اردو کشمیر یونی ورسٹی ہندوستان کی دیگر اہم جامعات کے اردو شعبوں سے کسی بھی طرح کم اہم نہیں یہاں اردو زبان و ادب کے اساتذہ اور اسکالرس نے اپنے کارناموں سے اردو دنیا میں نام پیدا کیا ہے۔ اردو دنیا کی جن نامور ہستیوں نے یہاں اپنی تدریسی، علمی اور تحقیقی خدمات انجام دی ہیں ان میں بطور خاص پروفیسر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر برج پریمی، پروفیسر نذیر ملک، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر فرید پربتی، پروفیسر منصور احمد منصور کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ پروفیسر صاحبان کے علاوہ بھی متعدد اساتذہ نے ابتدا سے تا حال مختلف ادوار میں اپنی خدمات انجام دی ہیں اور بعض ابھی دے رہے ہیں۔ ان میں پروفیسر اسد اللہ کامل، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر اللہ داد خان، پروفیسر جعفر رضا، پروفیسر محبوبہ وانی، پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر سجان کور بالی، پروفیسر عارفہ بشریٰ، ڈاکٹر کوثر رسول، ڈاکٹر مشتاق حیدر شامل ہیں۔

جہاں تک شعبے میں درس وتدریس کی بات ہے تو یہاں ہر سال ہزاروں خواہش مند طلبہ ایم اے اردو میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے عرضی فارم جمع کرتے ہیں، جن میں سے صرف 85 کامیاب طلبا کو داخلہ ملتا ہے۔ ایم اے کے علاوہ شعبہ اردو میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے بھی متعدد عرضی فارم موصول ہوتے ہیں۔ جن کا انتخاب امتحان میں کامیابی اور زبانی امتحان کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہاں مقدار کو نہیں معیار کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ شعبے میں کی گئی تحقیق میں بعض مقالات کو نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر داد و تحسین ملی ہے۔ اور وہ مقالات کتابی صورت میں منظر عام پر آنے کے بعد ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ یہ کتابیں اپنے اپنے موضوعات کے اعتبار سے مستند اور معتبر تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان میں 'اردو نظم پر یورپی اثرات' (حامدی کاشمیری)، 'مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے' (محمد زماں آزردہ)، 'منتوحیات اور کارنامے' (برج پریمی)، 'اردو رسم خط ارتقا اور جائزہ' (نذیر ملک)، 'فیض کی شاعری روایت اور انفرادیت' (نصرت چودھری)، 'اردو افسانے میں علامت نگاری' (مجید مضمر)، 'اردو میں نعت گوئی روایت اور ارتقا' (جوہر قدوسی)، 'اردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے عناصر' (شفق سوپوری)، 'اردو میں لغت نگاری' (نذیر آزاد)، 'کشمیری اور اردو مرثیہ میں ڈرامائی عناصر' (نرگس بانو)، 'اردو میں میر شناسی' (عارفہ بشریٰ)، 'اردو تنقید میں غالب شناسی' (سجان کور بالی) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چونکہ شعبہ اردو میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے متعدد مقالات آج تک لکھے گئے ہیں اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ یہاں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے کے لیے لکھے گئے مقالات کے موضوعات، اسکالرس اور نگراں حضرات کے ناموں کی فہرست زیادہ لمبی ہو جائے گی اس لیے ہم اس مضمون میں صرف شعبہ اردو کے پی ایچ ڈی کے مقالات کی تفصیل ہی پیش کریں گے۔ شعبہ اردو میں 1966 میں سب سے پہلے حامدی کاشمیری کو پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شدومد کے ساتھ جاری ہے اس وقت بھی شعبے میں 15 اسکالر رجسٹرڈ ہیں جو اردو ادب کے مختلف اور مخفی گوشوں پر تحقیق کرنے میں منہمک ہیں۔ 1966 سے تا حال کن کن اساتذہ کی نگرانی میں کن کن موضوعات پر یہاں کی کن اسکالرس نے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ سند حاصل کی ہے اور کون کون مصروف عمل ہیں۔ اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

نام ریسرچ	موضوع	نام اسکالر	سن تفویض
پروفیسر عبدالقادر سروری	اردو نظم پر یورپی اثرات	حامدی کاشمیری	1966
" " "	اردو میں سیرت نبی کا ادب	اسد اللہ کامل	1968
پروفیسر شکیل الرحمٰن	آغا حشر کاشمیری کی ڈراما نگاری	طاہرہ عبداللہ	1975
" " "	مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے	محمد زماں آزردہ	1978
" " "	اردو ناول میں کردار نگاری	شاہدہ پال	1980
" " "	اردو تنقید میں غالب شناسی	سجان کور بالی	1980
" " "	کشمیری غزل پر اردو غزل کے اثرات	غلام محمد بٹ	1984
" " "	اردو ناول میں المیہ عناصر	محمد اشرف	1987
پروفیسر حامدی کاشمیری	منتوحیات اور کارنامے	برج پریمی	1976
" " "	اردو اور کشمیری شاعری میں رومانیت	محبوبہ وانی	1979
" " "	اردو رسم خط ارتقا اور جائزہ	نذیر احمد ملک	1981

" " "	اردو اور کشمیری شاعری میں ترقی پسند رجحانات	محمد رمضان بٹ	1984
" " "	اردو افسانے میں علامت نگاری	مجید مضمر	1984
" " "	وجودیت اور اردو شاعری	محمد یوسف شاہ	1984
" " "	فیض کی شاعری روایت اور انفرادیت	نصرت چودھری	1986
" " "	اردو ناول پر فکری اور ادبی تحریکوں کے اثرات	گلزار احمد پڈر	1991
پروفیسر محمد زمان آزردہ	جدید غزل میں میر کی روایت	شفیقہ پروین	1981
" " "	اردو نثر میں سماجی طنز	سوہن لال کول	1982
" " "	اردو افسانے میں تہذیبی عناصر	منصور احمد میر	1986
" " "	اردو افسانے میں سماجی شعور	شفیقہ خان	1986
" " "	مولانا مودودی کی نثری خدمات	فریدہ قاری	1986
" " "	کرشن چندر کے رومانی کردار	منظور احمد بابا	1991
" " "	اردو افسانے میں سماجی طنز 1936 کے بعد	غلام احمد ڈار	1993
" " "	سردار جعفری شخصیت اور فن	کوثر پروین	1996
" " "	جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی ادبی خدمات	عبدالمجید بٹ	1996
" " "	کشمیری اور اردو مرثیہ میں ڈرامائی عناصر	نرگس بانو	1996
" " "	اردو میں نعت گوئی روایت اور ارتقا	جوہر قدوسی	1997
" " "	کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری	پرویز احمد وانی	1999
" " "	اردو زبان کی ترویج اور ترقی میں نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کا حصہ	مشتاق احمد	2005
" " "	اردو زبان و ادب میں ساہتیہ اکادمی کا حصہ	نصرت جان	2005
" " "	پروفیسر محمد امین اندرابی حیات اور کارنامے	فاروق احمد راتھر	2005
پروفیسر قدوس جاوید	اردو تنقید میں اقبال شناسی	نذیر احمد بٹ	1980
" " "	داستانی روایت اور اردو ناول	امرناتھ بھٹ	1984
" " "	اردو افسانے میں حقیقت نگاری	راجکمار سنگھ	1987
" " "	اردو تنقید پر سماجی و تہذیبی اثرات	غلام محمد وانی	1993
" " "	اردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے عناصر	عبدالقیوم ختائی	1993
" " "	اردو افسانے کے فروغ میں سکھوں کا رول	رچپال سنگھ	1996
" " "	اکبر حیدری حیات اور کارنامے	محمد جعفر	1997
" " "	اردو غزل جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک	شبینہ پروین	2006
" " "	شمس الرحمان فاروقی حیات اور کارنامے	شکیل احمد خان	2006
" " "	اردو تنقید کی نئی جہات	مشتاق حسین	2007
" " "	گوجری غزل پر اردو غزل کے اثرات	محمد اسلم چودھری	2007
" " "	گوجری زبان و ادب پر اردو کے اثرات	پرویز احمد	2007
" " "	گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری	شہناز پروین	2008
" " "	اردو ناول کا نیا منظر نامہ (1980 سے 2005 تک)	ظہور احمد خان	2010
" " "	اقبال، انسان اور خدا	فیض احمد حجام	2011
" " "	پروین شاکر کی شاعری	طاہرہ سعید	2012
" " "	عصمت چغتائی شخصیت اور فن	دل افروز گنجو	1986
پروفیسر برج پریمی	پریم چند کی کہانیوں میں سیاسی شعور	تسلیم بانڈے	1986
" " "	ابوالکلام کی نثر نگاری	فریدہ کول	1986
پروفیسر اسد اللہ کامل	اقبال اور تصوف	غلام نبی میر	1984

پروفیسر نذیر احمد ملک	پریم چند کے بعد اردو ناول میں نسوانی کردار	نسرین کوثر	1989
" " "	پریم چند کے بعد اردو ناول میں ہندوستانی تہذیب	شوکت افزا کرمانی	1989
" " "	شاہ حاتم حیات اور شاعری	غلام نبی بٹ	1995
" " "	اردو میں لغت نگاری	نذیر احمد گنائی	1996
" " "	اردو افسانے میں جنسی نفسیات	عبدالرشید خان	1996
" " "	ماہر القادری کی ادبی خدمات	عبدالحمید گنائی	2004
" " "	اردو میں ادبی تاریخ نویسی کا ایک جائزہ	کوثر مزمل	2008
" " "	اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک	محمد حسین زرگر	2008
" " "	اردو زبان و ادب کی ترقی میں مستشرقین کا حصہ	اسرار احمد ڈار	2009
" " "	اردو افسانے کی تنقیدی تاریخ (1936 تا2009)	مشتاق حسین مغلو	2014
" " "	کشمیری زبان و ادب پر اُردو کے اثرات	فریدہ اختر	2016
" " "	اردو تنقید میں حالی شناسی	صاعقہ جان	2018
" " "	علی گڑھ تحریک مابعد نوآبادیاتی مطالعہ	امتیاز قادر	2020
پروفیسر مجید مضمر	احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری	طارق احمد شاہ	1995
" " "	1960 کے بعد اردو کے ادبی رسائل	رفیع احمد بٹ	1996
" " "	تاریخی ناول کا فن اور نسیم حجازی	غلام محمد بٹ	1996
" " "	اردو میں میر شناسی	عارفہ بشریٰ	1987
" " "	اردو انشائیہ میں سماجی طنز	بشیر احمد	1998
" " "	1947 کے بعد کشمیر میں اردو غزل	نصرت پروین	2009
" " "	اردو افسانے میں کردار نگاری 1960 کے بعد	مبینہ اختر	2011
" " "	جموں و کشمیر میں اردو افسانہ	فہمیدہ اختر	2012
" " "	وارث علوی کی افسانوی تنقید	شاہ فیصل جان	2012
پروفیسر محبوبہ وانی	جیلانی بانو حیات اور کارنامے	عرفانہ عشی	2006
پروفیسر منصور احمد میر	1947 کے بعد ڈراما ایک تنقیدی مطالعہ	غلام محی الدین ڈار	2006
" " "	تقسیم ملک اور اردو ناول 'نمائندہ ناولوں کا تقابلی مطالعہ'	محمد شفیع ڈار	2010
" " "	اردو افسانے میں منظر نگاری	شیخ مختار	2014
" " "	اردو کی مزاحمتی شاعری 1857 کے بعد	کفایت حسین	2015
" " "	کشمیر میں اقبالیاتی ادب کا تنقیدی جائزہ	رخسانہ رحیم	2015
" " "	اردو میں مذہبی ادب کی روایت اور نعیم صدیقی کی ادبی خدمات	تجمل الاسلام	2017
" " "	مشرف عالم ذوقی بحیثیت فکشن نگار ایک تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ	شافیہ بانو	2020
" " "	کلام اقبال کے تہذیبی و تاریخی تناظرات کا تجزیاتی مطالعہ نوتاریخیت کے حوالے سے	وسیم اقبال نحوی	2020
" " "	اردو ناول میں مزاحمت اور احتجاج 1960 سے 2010 تک	عابد نور الامین	زیر تحقیق
پروفیسر سجان کور	جموں و کشمیر میں اردو تحقیق کا عصری منظر نامہ	تحمینہ جان	2017
پروفیسر عارفہ بشریٰ	اردو افسانہ اور برصغیر کا بدلتا اقتداری نظام	فیروز احمد میر	2014

" " "	فکشن اور تاریخ۔ اشتراک و افتراق (اردو کے نمائندہ تاریخی ناولوں کے حوالے سے)	فردوس احمد بٹ	2015
" " "	مارکسزم اور اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	بلال احمد وانی	2016
" " "	شکیل الرحمن کی تنقید نگاری اور جمالیات	مسرت جان	2017
" " "	ن۔م راشد کی شاعری: انحراف اور تعمیر نو	نگینہ بتول	2017
" " "	اردو طنز و مزاح اور کنہیا لال کپور	صلاح الدین شاہ	زیر تحقیق
" " "	معاصر اردو ناول میں مسلم سماج کے مسائل کی عکاسی نمائندہ ناولوں کے حوالے سے	بلال احمد گنائی	زیر تحقیق
پروفیسر فرید پربتی	شہر یار کی شعری خدمات	گلزار احمد وانی	2010
ڈاکٹر الطاف انجم	مابعد جدید تنقید اور مشرقی شعریات کے مابین مماثلت	سرتاج احمد بدرو	2017
" " "	اردو ناول میں ناسٹلجیا: ہجرت کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں کے حوالے سے	اسما بدر	زیر تحقیق
" " "	اردو افسانے کا نو مارکسی مطالعہ 1936 سے 1947 تک کے افسانوں کے خصوصی حوالے سے	توصیف احمد ڈار	زیر تحقیق
" " "	فکشن شعریات اور فکشن نگاری: ایک تجزیاتی مطالعہ	محمد اقبال لون	زیر تحقیق
" " "	مابعد جدید اردو افسانہ	محمد سلیم خان	زیر تحقیق
ڈاکٹر عرفان عالم	جدید اردو شاعری اور ناسٹلجیا 1960 کے بعد	عاشق احمد ناوو	2018
" " "	اردو میں افسانوی تنقید 1947 سے 2010 تک	اشفاق رشید گنائی	2020
" " "	اردو افسانے میں سیاسی شعور ایک تحقیقی مطالعہ	زاہد بشیر وانی	زیر تحقیق
ڈاکٹر کوثر رسول	قرۃ العین حیدر کی غیر افسانوی نثر اور تراجم	خضر محمد وانی	2018
" " "	جدید اردو نظم میں خطیبانہ اور بیانیہ عناصر	ریاض احمد کُھو	2018
" " "	اردو میں مابعد جدید شاعری اور تصوف	شبیر احمد ڈار	2020
" " "	قرۃ العین کے ناولوں میں مشترکہ تہذیبی عناصر	محمد شفیع بٹ	زیر تحقیق
" " "	اردو خودنوشت میں نفسیاتی کشمکش 1947 سے 2000 تک کی نمائندہ خودنوشتوں کے حوالے سے	عبدالباسط ہارون	زیر تحقیق
ڈاکٹر مشتاق حیدر	1947 کے بعد اردو میں خود نوشت نگاری نمائندہ اویبوں کے حوالے سے	رخسانہ حسین	2020
" " "	اردو غزل کے اہم پڑاؤ ایک تاریخی اور تنقیدی مطالعہ	اعجاز احمد قریشی	زیر تحقیق
" " "	اردو رباعی گوئی 1700 سے 2000 تک ایک موضوعاتی اور فنکارانہ مطالعہ	سمیع اللہ بٹ	زیر تحقیق
" " "	راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	فرزانہ	زیر تحقیق

درس و تدریس اور تحقیق و دریافت کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے متعدد سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ یہاں ہفتہ وار 'بزم ادب' مجلس کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں ایم اے کے طلبا حصہ لیتے ہیں جو اپنی تخلیقات اساتذہ اور ہم جماعت طالب علموں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جس سے ان کی تخلیقی صلاحتوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور وہ آگے چل کر کامیاب غزل گو، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، خاکہ نویس، نظم گو وغیرہ بنتے ہیں۔ وادی کے بہت سے نامور شعرا اور ادبا اسی بزم کے پروانے ہیں۔ جنھوں نے طالب علمی کے دوران یہاں اپنی کچی پکی نگارشات کو پیش کیا تھا اور مشفق اساتذہ کی رہنمائی سے فنی باریکیوں تک رسائی حاصل کی اور آج کامیاب فن کار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

شعبے میں ابتدا سے ہی قومی اور بین الاقوامی سیمناروں کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے۔ جن میں مقامی اساتذہ کے علاوہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے اردو کے نامور پروفیسر صاحبان، ناقدین و محققین حضرات شرکت فرماتے ہیں۔ یہاں سال میں کم سے کم ایک دو سمینار ہوتے رہتے ہیں۔ ابتدا سے تا حال جن مقتدر اردو داں حضرات نے ان سمیناروں میں شرکت کی ہے ان میں پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر وہاب اشرفی، عتیق اللہ، علیم اللہ حالی، مرزا حامد بیگ، ظہورالدین، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر محمد عقیل، پروفیسر عبید اللہ ہاشمی، پروفیسر مرزا خلیل، پروفیسر شہناز نبی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شعبۂ اردو سے ایک تحقیقی مجلّہ 'بازیافت' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ جس میں اردو زبان و ادب سے متعلق معیاری تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اس مجلے میں شعبے کے اساتذہ کی تحقیقی و تنقیدی نگارشات کے علاوہ ملک کے مقتدر ناقدین و محققین کے معیاری اور بصیرت افروز مضامین بھی شامل ہوتے ہیں۔ 'بازیافت' کے تا حال بعض مخصوص نمبر بھی منظر عام پر آ چکے ہیں جو ہر اعتبار سے لائق مطالعہ ہیں۔ ان خصوصی شماروں میں شبلی نمبر، اقبال نمبر، افسانہ نمبر، پریم چند نمبر، منٹو نمبر، نظم نمبر، جشن زریں نمبر اور حامدی کاشمیری نمبر شامل ہیں۔

شعبے کے طلبا کی فہم و فراست اور ذہانت و فطانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر سال یو جی سی کی جانب سے لیے جانے والے ملکی سطح کے مسابقتی امتحان نیٹ جے آر ایف NET/JRF میں شعبے کے طلبا بے مثال کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ تا حال شعبے سے فارغ التحصیل طلبا میں سے ایک اندازے کے مطابق 150 سے بھی زیادہ ایسے ہیں جنہوں نے NET/JRF یا SET کا امتحان پاس کیا ہے۔ اور اس تعداد میں ہر برس اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے تدریسی معیار کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شعبہ اردو کے متعدد طلبا ملک کی مختلف یونیورسٹیوں دلی، پنجاب، علی گڑھ، لکھنؤ، حیدر آباد، ممبئی، بھوپال، اندور، احمد آباد، کلکتہ وغیرہ میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں اور ملک کے طول و عرض میں شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کا نام روشن کر رہے ہیں۔

کتابیات

گلدستہ اردو: ڈاکٹر جوہر قدوسی
شیرازہ (کانفرنس نمبر): کلچرل اکیڈمی سرینگر
بازیافت: شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی
جامعہ کشمیر کی اردو ادبی خدمات: ڈاکٹر محمد یٰسین گنائی

■

Sameera Banoo
D/O:Gulzar Ahmad Ganaie
47,Ganaie Mohallah Samboora
Kakapora- 192304
Distt:Pulwama (Kashmir)
Mob:7006402409
Email:gulsamreen20@gmail.com

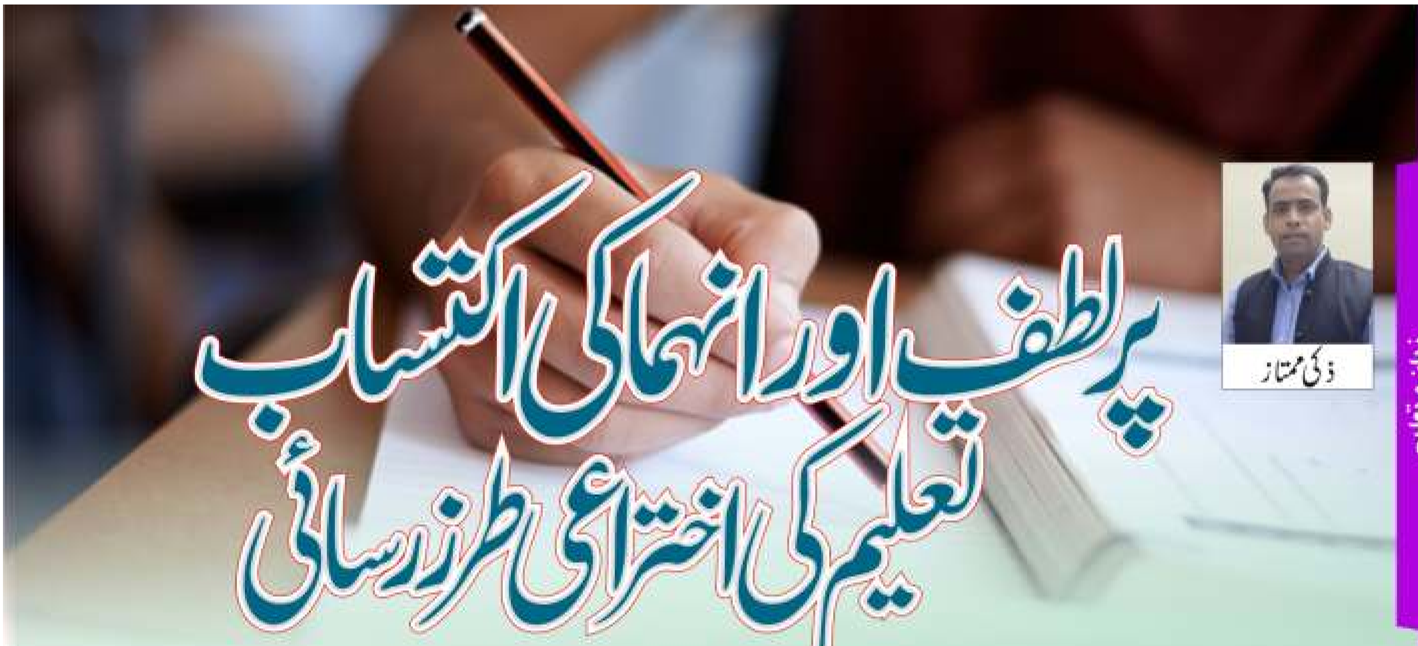

ذکی ممتاز

پرلطف اور انہماکی اکتساب
تعلیم کی اختراعی طرزِ رسائی

قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں کمرہ جماعت میں ایسے اختراعی اکتسابی طریقوں کوعمل میں لانے پر زور دیا گیا ہے، جو طلبا کے لیے پرلطف ہوں اور انھیں سیکھنے کے عمل میں مشغول رکھیں۔ پالیسی کے مطابق تدریس کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے جس میں اکتسابی عمل جامع، مربوط، پرلطف اور طلبا کو مشغول رکھنے والا ہو، جس میں ہر طرح کے طلبا کو شامل کیا جا سکے۔ پرلطف اور انہماکی اکتساب کی طرز رسائی بھی انھی عوامل کی پیروی کرتی ہے۔ اس مضمون میں پرلطف اور انہماکی اکتساب کے تصور، طریقہ کار اور اس میں شامل کی جا سکنے والی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کا مقصد معلمین کو تعلیم کی اس طرز رسائی سے روشناس کرانا ہے جس سے کہ بچوں کے اکتسابی عمل کو پرلطف اور انہماکی بنایا جا سکے۔

پرلطف اور انہماکی اکتساب سے مراد اکتساب کی ایسی طرز رسائی سے ہے، جس میں طلبا خوشگوار ماحول میں مثبت رویے کے ساتھ تجربہ کر کے علم حاصل کرتے ہیں۔ طلبا کو انفرادی یا گروہی طور پر کچھ نیا کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے جس میں کامیابی حاصل ہونے پر انھیں خوشی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ پرلطف اور انہماکی اکتساب تعمیری اکتساب پر مبنی ہے۔ ڈیوی کا خیال تھا کہ موثر تعلیم وہ ہے جس میں حد سے زیادہ تجربات شامل ہوں اور جس کے ذریعے غور وفکر کی صلاحیتوں میں نکھار آئے اور جو استاد کے کردار اور اس کے عکس سے رشتہ قائم کر سکے۔ Piaget کا بھی نظریہ تھا کہ بچے اس وقت زیادہ سیکھتے ہیں جب انھی چیزوں کے تجربات کی بنیاد پر ذاتی تفہیم کا موقع فراہم کرایا جائے۔ پرلطف اور انہماکی اکتساب میں معلم طلبا کو ان کی جبلت، فطرت اور دلچسپی پر مبنی سرگرمیوں کے ذریعے مشغول کرتا ہے، انھیں خود تحقیق اور تفتیش کی جانب گامزن کرتا ہے، وضاحت کرواتا/کرتا ہے، تفصیل سے بیان کرواتا/کرتا ہے اور تعین قدر کرتا ہے۔ بہترین پرلطف اور انہماکی اکتسابی طریقہ اسے تسلیم کیا جاتا ہے جس میں بچے خوشی خوشی اکتسابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں، تجربات کے ذریعے اپنی معلومات، تفہیم اور مہارتوں میں اضافہ کرتے ہیں اور خود ہی اپنا تعین قدر بھی کرتے ہیں۔ یہ اکتساب کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں طلبا خود کی کوششوں سے سیکھنے میں مشغول رہتے ہیں اور انھیں تجربات کے ساتھ ساتھ تفریح کے مواقع بھی فراہم ہوتے ہیں۔ اس طرح کا اکتساب لچکدار ہوتا ہے اور اس میں سمجھنے پر زیادہ اور رٹنے پر کم زور دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد طلبا کی مضامین میں دلچسپی پیدا کرنا، مواد کی بہتر تفہیم اور تحقیق کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ پرلطف اور انہماکی اکتساب میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ طلبا کو پڑھایا جانے والا مواد مختصر و جامع ہو اور ممکنہ حد تک آڈیو اور ویڈیو کی مدد سے مواد کو دلچسپ اور دلکش بنانے کی کوشش کی جائے۔ بازری کے ذریعے معلم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کی طلبا کی فہم اور مطلوبہ مقاصد میں کوئی خلا باقی نہ رہے۔

اکتسابی عمل میں شمولیت کی اہمیت بینجمن فرینکلین (Benjamin Franklin) کے اس قول سے واضح ہوتی ہے کہ:

مجھے بتایا گیا اور میں بھول گیا، مجھے پڑھایا گیا مجھے یاد رہا لیکن جب مجھے شامل کیا گیا میں تو میں سیکھ گیا۔''

کلاس روم میں سنجیدہ ماحول میں اکتسابی عمل کو انجام دینا ہر ایک معلم کی ترجیح ہوتی ہے اور طلبا سے بھی یہی امید کی جاتی ہے کہ وہ سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ اکتسابی عمل میں حصہ لیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف سنجیدہ ماحول میں ہی تدریسی واکتسابی عمل کو بہتر طریقے سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ ہم بھی لوگ اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ کلاس روم میں طلبا کو تدریس کی جانب راغب کرنے کے مقصد سے معلم ان سے 'توجہ دینے کے لیے' کہتے ہیں۔ لیکن طلبا اس وقت ہی توجہ دیتے ہیں اور سیکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں جب تدریس میں ان کی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس بات سے یہ واضح ہے کہ تدریس واکتساب میں طلبا کی توجہ مکمل طور پر راغب کرنے کے لیے معلم کو پرلطف اور انہماکی اکتسابی طریقوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس سے طلبا میں اکتسابی عمل کے لیے خود بخود خواہش اور دلچسپی پیدا ہوگی اور ان کو جبراً توجہ مرکوز کرنے یا نظم وضبط میں رہنے کی تلقین کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس طرح طلبا خود کی کوششوں سے سیکھیں گے، کم وقت میں زیادہ سیکھیں گے اور جو بھی سیکھیں گے وہ مستحکم ہوگا۔ ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ تھکاوٹ، تدریس میں بوریت، تناؤ، الجھن، اور اضطراب کی کیفیت پیدا کرتی ہے، جس سے طلبا کی آمادگی اور حوصلہ افزائی میں کمی واقع ہوتی ہے، نتیجتاً اکتسابی عمل میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جب کلاس روم کا ماحول خوشنما ہو، سیکھنے کے لیے اپنائے جانے والے طریقے پرلطف اور انہماکی ہوں، تو طلبا خوشی اور آزادی کے ساتھ سیکھتے ہیں۔ ان میں سیکھنے کے لیے مثبت رویہ پیدا ہوتا ہے اور سیکھنے کے عمل سے جذباتی طور پر وابستہ ہو پاتے ہیں۔ معلم کو طلبا کو خود سے سیکھنے اور خود مطالعہ کرنے کی آزادی دینی چاہیے، اس سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور مطالعے کی عادت کی نشو ونما ہوتی ہے۔

معلم کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ کلاس روم میں طلبا کے چہرے پر شکن، فکر یا مایوسی نہ ہو بلکہ ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے ہشاش بشاش ہوں۔ ایسا

اس لیے کہا جا رہا ہے کیونکہ معلم اکثر اسکولوں میں ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ سے یا کسی دیگر وجہ سے طلبا کو سزا دیتے ہیں، جس سے نہ صرف سزا پانے والے طلبا بلکہ پوری کلاس میں خوف کا ماحول ہوتا ہے۔ ایسے میں ہم کیسے امید کر سکتے ہیں کہ طلبا کچھ نیا کریں گے یا سیکھیں گے۔ خوف کی وجہ سے کیے گئے کلاس ورک یا ہوم ورک سے بچے حقیقت میں کچھ بھی نہیں سیکھتے ہیں، وہ صرف ایک خانہ پری کرتے ہیں کیونکہ ان سے زبردستی کوئی کام نہیں کرایا جا سکتا ہے۔ کہاوت بھی ہے کہ ''گھوڑے کو تالاب تک لے جا سکتے ہیں لیکن پانی نہیں پلا سکتے ہیں۔'' کیونکہ پانی تو وہ خود ہی پیے گا۔ اسی طرح طلبا کے ساتھ ایسا کرنا نفسیاتی طور پر بھی درست نہیں ہے، اس لیے معلمین کو سکھانے سے زیادہ طلبا کے اندر سیکھنے کی خواہش پیدا کرنے پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اکتساب کا مقصد طلبا پر پڑھائی کا بوجھ ڈالنا نہیں ہے اور نہ ہی کلاس ورک یا ہوم ورک کو متعینہ وقت پر مکمل کرنا ہے۔ اسی طرح اکتساب کسی چیز کو سمجھے بنا رٹ لینا یا معلومات کو دماغ میں ٹھوس لینا نہیں ہے اور نہ ہی امتحان میں نمبرات حاصل کرنا ہے، بلکہ اکتساب کا مقصد مضمون کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا، اس پر غور و فکر کرنا اور اسے اپنی زندگی میں استعمال کر کے دیکھنا ہے، جس سے آئندہ زندگی کی تیاری کی جا سکے۔ سال در سال امتحان پاس کر لینا اکتساب کا مقصد نہیں ہے، بلکہ آنے والی زندگی کے لیے خود کو تیار کرنا اس کا حقیقی مقصد ہے۔

طلبا کی زندگی میں معلم کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ معلم کی طلبا سے محبت، ان پر اعتماد اور ان کی صحیح رہنمائی، طلبا میں حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ اس کے برخلاف بے وجہ کی ڈانٹ، مار اور سزا طلبا میں احساسِ کمتری پیدا کرتی ہے اور طلبا کو ضدی بناتی ہے۔ کلاس روم کا ماحول خوش نما ہونا چاہیے اور طلبا کے اندر تجسس، دلچسپی، تخلیقی صلاحیتیں، سیکھنے کا جذبہ اور خواہش پیدا کرنے والا ہو، جس سے وہ کلاس روم میں خود سے نئے نئے سوالات اٹھائیں اور ان کے حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اسکول میں جب خوشگوار ماحول میں اکتساب ہوگا تو طلبا کا دل خود بخود اسکول جانے کے لیے کرے گا۔ اسکول انہیں جیل نہیں لگے گا، جس میں پڑھائی کے بہانے انہیں قید کیا گیا ہو۔ جیسا کہ گجو بھائی (Giju Bhai) بھی کہتے تھے کہ:

'' کلاس روم میں طلبا کو ایسے ماحول میں سکھایا جائے جو نہایت ہی دلکش اور خوش نما ہو، جہاں بچے ہنستے ہوئے آئے اور گنگناتے ہوئے جائے۔ جہاں بچہ ایک بار آجائے تو اسے بار بار آنے کا دل کرے۔ جہاں انہیں پڑھائی کا، کلاس ورک کا، ہوم ورک کا، معلم کا، امتحان کا خوف نہ ہو، بلکہ جب وہ گھر جائے تو ڈر کے بجائے گیت، کہانی، ڈرامے کے کردار، کھیل یا کوئی ہنر لے کر جائے اور دوبارہ جب اسکول آئے تو نئے جوش نئی امنگ اور کچھ نیا سیکھنے کی للک سے آئے۔ تدریس ایسی ہو، جس میں طلبا کو جو کچھ بھی بتایا جائے اس کی دلچسپی، جذبات، ضرورت، تجربات اور شمولیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتایا جائے، جس میں نیا پن ہو اور نئے طریقے سے بتایا جائے۔''

جان ایڈمس نے تدریس کے بارے میں کہا کہ:

'' یہ ایک دو قطبی عمل ہے، جس میں طلبا اور معلم دونوں شامل ہیں''

اس لیے تدریسی عمل میں معلم کو طلبا کی شراکت کو یقینی بنانا چاہیے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو طلبا کو تدریسی عمل میں سننے والے کے طور پر نہیں بلکہ شرکا کے طور پر حصہ لینا چاہیے۔

اس طرح سے پرلطف اور انہماکی اکتساب حالانکہ اختراعی طریقہ نظر آتا ہے لیکن تمام ماہرین تعلیم ایسے ہیں جو بہت پہلے ہی اکتساب کے ان طریقوں پر زور دیتے رہے۔ میکڈوگل (Mc. Dougall)، کالڈ ویل کوک (Cold Well Cook)، مانٹیسری (Montessori) اور فرابیل (Froebel) نے تعلیم و اکتساب کے لیے کھیلوں کو ذریعہ بنانے کی پیروی کی اور کہا کہ کھیل ایک تفریح کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما کا ذریعہ اور زندگی کی تیاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ کھیلوں سے اکتساب کو پرلطف اور انہماکی بنایا جا سکتا ہے۔ کھیل کے تمام ایسے اصول بتائے جس کی بنا پر طلبا کی جسمانی، ذہنی، سماجی اور اخلاقی نشوونما ہوتی ہے۔ اسی طرح رابندر ناتھ ٹیگور اور روسو نے کہا کہ بچے قدرتی ماحول میں قدرت سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور ایسا سیکھنا پرلطف اور انہماکی ہوتا ہے۔ ہیلین پارکہرسٹ (Helen Parkharst) نے ڈالٹن طریقہ (Dalton Method)، کیلپیٹرک (Kilpatric) نے پروجیکٹ طریقہ (Project Method) اور ڈاکٹر اینی بیسینٹ (Dr Annie Besant) نے تجرباتی طریقہ پر زور دیا۔ اس طرح تمام تعلیمی ماہرین نے بھی مختلف طریقوں کے ذریعہ سے اکتساب کو پرلطف اور انہماکی بنانے پر زور دیا جس سے طلبا اس قابل بن سکیں کہ وہ زندگی کے تمام حالات کا سامنا کر سکیں۔

تدریس کو پرلطف، مؤثر اور خوشگوار بنانے کے لیے وقت، حالات، ماحول اور مضامین کے مطابق مختلف طریقے اپنائے جا سکتے ہیں، لیکن اس کا کوئی ایک ٹھوس فارمولا نہیں ہے جو کبھی کے لیے یا سبھی پر ہم وقت یکساں طور پر نافذ کیا جا سکے۔ ہر مضمون کے لیے اور ہر کلاس روم کے لیے مختلف طریقہ کار اور طرزِ رسائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں پر کچھ اہم باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جسے ذہن میں رکھ کر طلبا کے لیے اکتساب کو پرلطف اور انہماکی بنایا جا سکتا ہے۔

- تدریس کے طریقوں کو سیکھنے کا دل کہا گیا ہے، لہٰذا ہمیں تدریس کے دوران مختلف جدید و اختراعی تدریسی طریقوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں طلبا کو تجربات کے ذریعے سیکھنے، دستکاری، آرٹ، کھیلوں سے مربوط تعلیم دینے، کہانی سنانے پر مبنی تدریسی طریقے کو اپنانے اور مختلف مضامین کے درمیان تعلقات کی تلاش کرنے پر بھی زور دیے جانے کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اختراعی تدریسی طریقوں جیسے خود سے کر کے سیکھنا، تجربات سے سیکھنا، قدرتی اشیا کا مشاہدہ کر کے سیکھنا، پروجیکٹ پر مبنی آموزش، برین اسٹارمنگ (Brainstormin)، بلینڈیڈ لرننگ (Blended Learning)، فلپیڈ کلاس روم (Flipped Classroom) کے ذریعے سیکھنا اور باہمی تعاون کے ذریعے سیکھنا وغیرہ طریقوں کو اپنی تدریس میں استعمال کر سکتے ہیں۔ معلم کا طریقہ تدریس جتنا زیادہ پرلطف اور طلبا کو مشغول رکھنے والا ہوگا، طلبا اتنے ہی زیادہ بہتر طریقے سے سیکھنے کی کوشش کریں گے۔
- اکتساب میں طلبا کو مشغول رکھنے کے لیے کلاس روم میں انکشاف یا دریافت کے کلچر کو فروغ دینا ہوگا، جہاں طلبا اپنے آپ کو آزادانہ طور پر کام کرنے کے لیے بااختیار محسوس کریں۔
- معلم اس بات سے بہتر واقفیت رکھتے ہیں کہ طلبا کے درمیان انفرادی فرق پایا جاتا ہے، اس لیے انھیں طلبا کے ساتھ کھل کر بات چیت کرنی چاہیے اور ان کے مسائل کو سننا اور اس کو حل کرنا چاہیے۔ انھیں کلاس روم میں سبھی طلبا کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھنے کا مواقع فراہم کرنا چاہیے۔ طلبا سے گروہی سرگرمیاں بھی کرائی جانی چاہیے جس سے وہ تصورات کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر سکیں اور بحث مباحثہ کر سکیں۔
- موجودہ وقت میں ٹیکنالوجی میں ترقی کی وجہ سے دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے، لہٰذا وقت کی تبدیلی کے مطابق ہمیں کلاس روم میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ کووڈ-19 کے دور میں ٹیکنالوجی نے تدریس و اکتساب کے عمل کو ایک نئی سمت دی ہے اور تعلیم کے میدان میں اس کی اہم ضرورت کو متعارف کرایا ہے۔ ٹیکنالوجی کا استعمال اگر معلم کلاس روم میں صحیح طریقے سے کریں تو یہ ایک بیش قیمتی آلہ ہے، جس کے استعمال سے مزے دار اور دلچسپ اسباق تیار کیے جا سکتے ہیں۔ تمام طلبا کے لیے

ٹیکنالوجی کا استعمال آج ایک عام بات ہوگئی ہے اور وہ اس کا استعمال بڑی ہی دلچسپی کے ساتھ اور بہتر طریقے سے کر رہے ہیں۔ٹیکنالوجی صرف نئی چیزوں کو سیکھنے میں مددہی نہیں کرتی ہے بلکہ اس کے ذریعے مشکل چیز کو آسانی کے ساتھ سکھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے تدریس واکتساب کو پر لطف بنانے کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ اس کے ذریعے طلبا کو سیکھنے کے نہ صرف لامحدود مواقع فراہم ہوتے ہیں بلکہ انھیں مشغول بھی رکھا جاسکتا ہے۔ آج صرف ایک بٹن کے ذریعے طلبا کو تمام طرح کی معلومات چند سیکنڈ میں دستیاب ہو جاتی ہے اور وہ جب چاہیں اور جہاں بھی ہو، وہاں سے اپنے معلم کے رابطے میں رہ سکتے ہیں۔

- معلم اگر خود تناؤ میں رہیں گے تو طلبا اس سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ کیونکہ طلبا یقینی طور پر معلم کے احساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔طلبا معلم کو اپنا رول ماڈل مانتے ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔
- معلم کے طور پر ہمیں اس بات کی بہت فکر ہوتی ہے کہ طلبا کے سامنے ہم جو مواد پیش کرنے جارہے ہیں وہ کس طرح سے واضح کیا جائے، جس سے طلبا کو آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ لیکن اس بات کے لیے فکر مند نہیں ہوتے ہیں کہ جو مواد ہم پیش کرنے جارہے، اس میں طلبا کی دلچسپی کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ اس لیے معلم کو کلاس روم میں جانے سے پہلے اس بات کی فکر کرنی چاہیے اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا ہم ایسا مواد بنا سکتے ہے یا ایسے طریقہ تدریس کا استعمال کر سکتے ہیں، جو اکتسابی عمل کو پرلطف بنا سکے اور طلبا کو سیکھنے کی سرگرمیوں میں مشغول رکھ سکیں۔ اس کے لیے ایک معلم کے اندر مضمون میں مہارت اور تدریسی مہارتوں سے کہیں زیادہ طلبا کو سمجھنے کی مہارت ہونی چاہیے۔
- اکتساب کو حقیقی زندگی سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ طلبا جب کچھ نیا مواد دیکھتے ہیں تو اکثر ان کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کا حقیقی زندگی میں کیا استعمال ہے۔ ان کا یہ سوال درست بھی ہے۔ مثال کے طور پر اگر انھیں ریاضی کے تصور، اوسط اور فیصد کو پڑھایا جا رہا ہے، تو انھیں اس وقت یہ بھی بتایا جائے کہ وہ اس کا استعمال حقیقی زندگی میں کب کہاں اور کس طرح سے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سائنس کے تصورات کو سائنسی تجربات کے ساتھ سکھایا جائے۔ اگر طلبا کو پودوں کے بارے میں بتایا جارہا ہے تو کلاس روم کے باہر بھی بہت کچھ ہے جہاں طلبا کو لے جا کر انھیں پیڑ پودوں کے بارے میں دکھایا جاسکتا ہے اور تجربات کے ساتھ سکھایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے سماجی علوم میں معلم اپنے آس پاس کے سماج میں موجود ایسے مادی وسائل اور مقامات کی فہرست تیار کر سکتا ہے، جن سے طلبا بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد طلبا کو ان مقامات پر آسانی سے لے جایا جاسکتا ہے اور مادی اشیا کو دکھا سکتے ہیں، جس سے طلبا براہ راست سماجی علوم کی بہت سی چیزوں کو سیکھ سکیں۔ انھیں کلاس روم سے باہر قدرتی ماحول میں لے جا کر پیڑ پودوں، پہاڑوں، آبشاروں، دریا، مختلف قسم کی مٹی کو دکھایا اور ان کے بارے میں بتایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انھیں مختلف مقام جیسے: ریڈیو اسٹیشن، دوردرشن، اخبار کے دفتر، فلم کے اسٹوڈیوں، آرٹ گیلری، ریجنل سائنس سینٹر، عجائب گھر، پنچایت گھر، محکمہ دفتر، ریاستی اسمبلی، بینک، کارخانے، ٹیلی فون ایکسچینج، فارم ہاؤس، باغات، مختلف تاریخی عمارتیں، مختلف عبادت گاہیں، میوزیم، کتاب میلہ، سائنس میلہ یا نمائش، ہائیڈرو پاور اسٹیشن، تھرمل پاور اسٹیشن، پولیس اسٹیشن، بس اسٹیشن، ریلوے اسٹیشن، عدالتیں، پوسٹ آفس، کتب خانے، دوا خانے، ہسپتال وغیرہ میں سے جو بھی ہمارے اسکول کے اطراف میں ہو یا جہاں ہم اپنے بچوں کو آسانی سے لے جا سکتے ہوں وہاں لے جائیں۔ جس سے طلبا وہاں جا کر براہ راست معلومات حاصل کر سکیں۔ اس طرح کا سیکھنا طلبا کے لیے نہ صرف پرلطف ہوگا بلکہ انہماکی بھی ہوگا۔ طلبا کلاس روم میں اور کتابوں میں تو بہت کچھ پڑھتے ہیں لیکن ان کو مختلف مضامین اور پروجیکٹ بھی دیے جائیں جس سے وہ کلاس روم سے باہر جا کر حقیقی زندگی میں عملی طور پر کر کے سیکھ سکیں۔طلبا کے لیے تعاملی اسباق (Interactive Lessons)، سلائڈ شو، گیمس اور ویڈیوز کا استعمال سیکھنے کو خوشگوار بنانے کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ معلم مختلف طریقوں اور تکنیک کو یکجا کر کے طلبا کو سبق اور سرگرمیوں کے دوران زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

جس طرح اکتساب ایک مسلسل اور تا زندگی چلنے والا عمل ہے اسی طرح تدریس بھی ایک مسلسل چلنے والا اکتسابی عمل ہے اور معلم تدریسی عمل کے دوران طلبا سے بہت کچھ تا زندگی سیکھتے ہیں اور جیسے جیسے ان کے تجربات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ان کی تدریسی صلاحیتوں میں بھی نکھار آتا جاتا ہے۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اس بات کا بھی ذکر کیا گیا ہے کی طلبا کی مجموعی ترقی کے لیے اس میں اکیسویں صدی کی ضروری مہارتوں جیسے تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحیتیں، مواصلات، اشتراک، مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت، اخلاقیات، سماجی ذمے داری، ڈیجیٹل خواندگی کو پیدا کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جائے اور نصاب، درسی کتابیں، تدریس اور تعین قدر کے طریقوں میں بدلاؤ کیے جائیں۔

ملک کے بیشتر حصوں میں معلمین اس سمت میں کوشاں ہیں اور پرلطف وانہماکی اکتساب کے لیے اسکولوں میں مختلف اختراعی تجربات پر عمل پیرا ہیں۔ این سی ای آر ٹی نے 7 سے 17 ستمبر 2019 کے درمیان 'شکچھک پرو' کو آزادی کے امرت مہوتسو کے طور پر منایا، جس میں پرلطف اور انہماکی اکتساب کے موضوع پر' آن لائن ویب سیریز کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں کافی تعداد میں ملک کے مختلف حصوں سے معلمین نے شرکت کی۔ انھوں نے اپنے تدریسی مضامین کے تعلق سے اپنے تجربات کو پاور پوائنٹ کے ذریعے پیش کیا اور بتایا کہ انھوں نے اپنے اسکول میں کس طرح سے تدریسی واکتسابی عمل کو دلچسپ اور خوشگوار بنانے کے لیے مختلف النوع سرگرمیوں کا سہارا لیا۔ جیسے ایک معلم نے بتایا کہ انھوں نے کس طرح سے طلبا میں ریاضی کے مضمون کے لیے خوف کو دور کرنے کے لیے اور ان کی ریاضی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ریاضی اور سائنس کے لیب کی تعمیر کی اور ریاضی اور سائنس کیمپ و میلے کا انعقاد کیا۔ ریاضی اور سائنس کے کوئز کا سافٹ ویئر تیار کیا، یوٹیوب چینل کا آغاز کیا اور انھیں آئی آئی ٹی، سائنس سٹی، سائنس پارک کی سیر پر لے جایا گیا۔ اسی طرح اکتساب کو دلچسپ بنانے کی لیے کلاس روم میں آئی۔سی۔ٹی کا استعمال کیا اور طلبا کو کمیونٹی کے کاموں میں شمولیت اور مہارت پر مبنی تعلیم دینے کے مواقع بھی فراہم کیے۔ ان میں سے ایک معلمہ نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے طلبا کے اکتساب کو دلچسپ بنانے اور اس میں ان کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے کھلونوں پر مبنی تدریسی طریقے کا استعمال کیا، جسے ٹوائے بیسڈ پیڈاگاگی (Toy Based Pedagogy) بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں تدریس کے لیے مواد سے متعلق موضوع پر کپڑے اور مٹی کا استعمال کر کے طلبا کی مدد سے کھلونے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک معلم نے بتایا کہ انہوں نے کٹھ پتلی کا استعمال تدریس میں کس طرح سے کیا اور طلبا کے لیے اینی میٹیڈ (Animated) کھلونے اور ویڈیو اسباق بھی تیار کیے۔ اس طرح اس آن لائن ویبینار کے ذریعے بھی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں جس پرلطف اور انہماکی اکتساب کو دینے کی بات کہی گئی تھی اسے دنیا بھر کے معلمین تک پہنچایا گیا، جس سے کہ دیگر معلمین بھی اپنے اسکول میں ان طریقوں کا استعمال کر سکیں۔

■

Dr. Zaki Mumtaz
(Assistant Professor)
Maulana Azad National Urdu University
College of Teacher Education
Bhopal- 462001 (MP)

ایڈیٹنگ کے رموز و فن

محمد توحید خان

ایڈیٹنگ ایک ایسا عمل ہے جس میں تحریر کے مواد، تنظیم، قواعد، بیانیہ اور پیش کش پر نظر ثانی کرنا شامل ہے۔ ایڈیٹنگ کا مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ آپ کے خیالات قارئین، سامعین اور ناظرین کے سامنے واضح طور پر پیش کیے جائیں۔ پروف ریڈنگ آپ کے کام کی چھوٹی تفصیلات میں درستگی کی جانچ پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ یہ مجموعی ترمیمی عمل کا ایک حصہ ہے اور ایڈیٹنگ کے آخری مرحلے کے طور پر بہترین طریقے سے کیا جاتا ہے۔

ایڈیٹنگ کے بارے میں جب آپ سوچتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے؟ بہت سے لوگ ایڈیٹنگ کے بنیادی کام کو قواعد یا املا کی غلطیوں کو تلاش کرنے اور انھیں درست کرنے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ تاہم ایڈیٹنگ اس سے بہت زیادہ ہے۔ ایڈیٹنگ ایک ایسا عمل ہے جس میں تحریر کے مواد، تنظیم، قواعد، بیانیہ اور پیش کش پر نظر ثانی کرنا شامل ہے۔ ایڈیٹنگ کا مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ آپ کے خیالات قارئین، سامعین اور ناظرین کے سامنے واضح طور پر پیش کیے جائیں۔ پروف ریڈنگ آپ کے کام کی چھوٹی تفصیلات میں درستگی کی جانچ پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ یہ مجموعی ترمیمی عمل کا ایک حصہ ہے اور ایڈیٹنگ کے آخری مرحلے کے طور پر بہترین طریقے سے کیا جاتا ہے۔

ایڈیٹنگ کیا ہے؟: ایڈیٹنگ کو وسیع پیمانے پر بنیادی ایڈیٹنگ، جامع ایڈیٹنگ، کاپی ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ کے زمرے میں رکھ کر درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ یہ سب ایڈیٹنگ کی ایک شکل ہے جو بصری ڈیزائن اور فہم کو بہتر بنانے کے لیے کسی دستاویز یا مسودے کی مجموعی ہیئت، انداز اور مواد کا جائزہ لیتی ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصل ایڈیٹر کیا کرتے ہیں؟ ایڈیٹرز وہ سب کچھ کرتے ہیں جو کاپی ایڈیٹرز، سب ایڈیٹرز اور پروف ریڈرز کرتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ وہ آپ کے مسودے کے تمام اجزا پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا یہ مجموعی طور پر آپس میں مربوط ہیں یا نہیں۔ مسودے کی ایڈیٹنگ کے لیے ایڈیٹر کا مشورہ درج ذیل ہوگا:

* اپنے دستاویز کو مکمل طور پر جانچیں نیز اس کے مختلف حصوں کے الگ الگ اجزا کو آزادانہ طور پر دیکھیں۔
* چیک کریں کہ مسودہ آپ کے ہدف کے قارئین کے ساتھ واضح طور پر ترسیل کرتا ہے۔
* ساختی عناصر یا ناکافی بحث کی نشان دہی کر کے اس کی درستگی پر توجہ دیں۔
* دلیل اور اسلوب کے ساتھ مسائل کو نمایاں کریں۔
* اصطلاحات کی درستگی اور مستقل مزاجی کو یقینی بنائیں۔
* اختصار، وضاحت، مناسب منتقلی اور پیراگراف کے اندر فطری بہاؤ کو یقینی بنانے کے لیے جملوں پر نظر ثانی کریں۔
* اپنے مسودے کی مجموعی روانی کو بہتر بنانے کے لیے جملوں یا متن کے ٹکڑوں کو تبدیل کریں۔

اس طرح ایڈیٹنگ میں دستاویز کی 'عنوان سے ضمیمہ تک' مکمل نظر ثانی شامل ہوتی ہے۔ اگر آپ کتاب لکھ رہے ہیں، رسائل یا جرائد کے لیے مضامین یا اکیڈیمک پیپر تو آپ کو عام طور پر الگ الگ ہیئت کی ایک مخصوص پیروی کرنی ہوگی اور اس کا لہجہ اس صنف کے مطابق رکھنا ہوگا۔ اگر آپ مضمون کو کسی خاص رسالے یا جریدے میں شائع کرانا چاہتے ہیں تو یقیناً اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ زیادہ تر رسائل و جرائد کو پہلے سے کہیں زیادہ مضامین آج موصول ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو ناقابل اشاعت سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے ایڈیٹنگ آپ کو اس ہدف کو حاصل کرنے میں زیادہ آسانی سے اور نظر ثانی کے مرحلے پر مدد کر سکتی ہے۔ ساتھ ہی مبصرین کے خدشے کو بھی زیادہ مؤثر طریقے سے حل کرنے میں آپ کی مدد کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ نے کسی اہم رسالے یا جریدے کو اشاعت کے لیے ہدف نہیں بنایا ہے تب بھی یہ ذہن میں رکھنا بہتر ہے کہ رسائل و جرائد میں عام طور پر زبان اور پیش کش سے متعلق کچھ مشترکہ معیارات ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصل ایڈیٹنگ

> آپ کی کتاب کو کاپی ایڈیٹنگ، ڈیولپمنٹ ایڈیٹنگ یا دونوں کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ ایک کاپی ایڈیٹر آپ کے متن کی میکانکس کو ٹھیک کرتا ہے۔ جیسے کہ الفاظ کا انتخاب، جملے کی ساخت اور قواعد۔ ایک ڈیولپمنٹ ایڈیٹر کہانی کے مجموعی ڈھانچے اور بیانیہ سے گزرتا ہے تاکہ ایک ہموار اور جامع کہانی وجود میں آسکے۔

بے حد لازمی اور معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک اہم ایڈیٹر، زبان اور موضوع کا ماہر ہے جو آپ کے پیپر کو اس وقت تک پالش کرے گا جب تک یہ قومی اور بین الاقوامی رسائل وجرائد کے اشاعتی معیار پر پورا نہ اترے۔

عظیم قلم کاروں کو کہانی بیان کرنے میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ وہ کردار ایسا تیار کرتے ہیں جو قابل اعتماد ہو اور پہلے صفحے سے ہی قارئین کی توجہ مرکوز رکھنا چاہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ عظیم مصنفین بھی اپنے بیانیہ میں کچھ ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جو غیر دانستہ ہوا کرتی ہیں۔ بعد میں ان غلطیوں پر قلم کاروں کی نگاہیں بھی نہیں پہنچ پاتیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انھیں کتاب کی ایڈیٹنگ کا فن بھی معلوم ہو جو اشاعت کے عمل میں ایک ضروری قدم ہے تو بہت سی پریشانیوں سے بچا جاسکتا ہے۔

اپنی کتاب میں ایڈیٹنگ کیوں کریں؟: آپ اپنی کتاب خود شائع کر رہے ہوں یا روایتی پبلشنگ ہاؤسز کے ساتھ کام کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہوں ایک مسودہ لکھنے کے بعد آپ کا پہلا قدم اپنے کام میں ترمیم کرنا ہے۔ کوئی بھی ادبی کام اپنے پہلے مسودے کے بعد شائع شدہ کتاب نہیں بنتا۔ ہر بیسٹ سیلر کے یہاں مسودے متعدد ترمیمات اور حذف و اضافے سے گزرتے ہیں۔ آپ قارئین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنا قیمتی وقت آپ کی تخلیق کردہ دنیا میں لگائیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کو ایک اچھی طرح سے لکھی ہوئی کہانی فراہم کرنے کی ضرورت ہوگی جس میں قارئین کی دل بستگی کا سامان ہو اور اس میں کوئی ساختی اور ہیئتی مسئلہ نہ ہو جو آپ کی کہانی کو ناقابل یقین بنا دے۔ ایسے میں آپ کو یہ یقینی بنانا ہوگا کہ ہر سطر واضح، جامع اور ضروری ہے۔ ایک قاری ایک ناول کو یا کسی موضوع پر لکھی گئی کتاب کو پڑھ رہا ہے تو یہ یقینی بنانا بے حد ضروری ہے کہ سطر اور پیراگراف بوجھل نہ ہو، ورنہ وہ اس کتاب سے اکتا کر اسے پڑھنے سے گریز کرے گا۔ مختصر یہ کہ کتاب کی ایڈیٹنگ کا مطلب ہے کہ اچھی کہانی اور عظیم کتاب۔

اپنی کتاب میں ایڈیٹنگ کے طریقے: کتاب میں ترمیم کرنے کے مختلف طریقے ہیں اگر آپ کسی پبلشنگ کمپنی کے ساتھ کام کر رہے ہیں تو ان کے اندرون خانہ ایڈیٹرز کی ٹیم یہ کام کرے گی۔ اگر آپ خود شائع کر رہے تو آپ خود ہی ترمیم کے عمل سے گزریں گے اور بہترین کام کرنے والے ترمیمی طریقوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔ اپنی کتاب میں ترمیم کرنے کے طریقے اس طرح ہیں:

سیلف ایڈیٹنگ: اگر یہ آپ کی پہلی کتاب ہے تو ذاتی یا خودکار ایڈیٹنگ آپ کو ایک بہترین مصنف بنا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو قواعد کے اصولوں اور کہانی کو ترتیب دینے کے بہترین طریقوں پر قدرت ہونی چاہیے۔ مصنفین کو اپنی پوری کتاب کے کم از کم دو خودکار ایڈیٹنگ راؤنڈ کرنے چاہئیں: پہلی بار کہانی کے بڑے عناصر جیسے کہ کہانی کی ساخت اور بیانیہ کی ترمیم کے لیے۔ دوسری بار تفصیلات میں ترمیم کے لیے۔ مثلاً ٹائپ کی غلطی اور اوقاف۔

بیٹا ریڈر (Beta Reader) کی مدد سے: بیٹا ریڈر یا تو ایک پیشہ ور یا دوست یا خاندانی ممبر ہوتا ہے جو آپ کی کتاب کو پڑھ کر مشورے دیتا ہے۔ انھیں آپ کو بتانا چاہیے کہ آپ کی کتاب کو ساختی نقطہ نظر سے کیا ضرورت ہے۔

> بلند آواز سے پڑھی جانے والی کہانی کو سننا کسی مسودہ میں موجود غلطیوں کو نمایاں کرسکتا ہے۔ آپ اپنی کہانی کو خود پڑھیں یا کسی دوست سے پڑھائیں۔ آپ اسے پڑھ کر خود بھی ریکارڈ کرسکتے ہیں اور اسے دوبارہ سن سکتے ہیں۔ اپنی کتاب کی ایک کاپی اور ریکارڈنگ کمپیوٹر پر کھلی رکھیں تاکہ قواعد کے کسی مسئلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس کی تصحیح ہوسکے۔

مثلاً آپ کے پلاٹ یا کردار کی نشوونما میں کوئی تضاد ہے یا الگ الگ مناظر کی عکاسی یا منظرکشی کس طرح پیش آئی ہے۔

ایک پروفیشنل ایڈیٹر کی مدد سے: ایک پروفیشنل بک ایڈیٹر آپ کے کام کو ان کی خاصیت کے لحاظ سے مختلف سطحوں پر اپڈیٹ کرنے میں مدد کرسکتا ہے۔ آپ کی کتاب کو کاپی ایڈیٹنگ، ڈیولپمنٹ ایڈیٹنگ یا دونوں کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ ایک کاپی ایڈیٹر آپ کے متن کی میکانکس کو ٹھیک کرتا ہے۔ جیسے کہ الفاظ کا انتخاب، جملے کی ساخت اور قواعد۔ ایک ڈیولپمنٹ ایڈیٹر کہانی کے مجموعی ڈھانچے اور بیانیہ سے گزرتا ہے تاکہ ایک ہموار اور جامع کہانی وجود میں آسکے۔

اپنی کتاب میں ترمیم کرنا آپ کے تحریری عمل کا حصہ ہونا چاہیے۔ خواہ آپ کسی پیشہ ور ایڈیٹر کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں یا خودکار ایڈیٹنگ۔ یہاں آپ کے مسودے کی ایڈیٹنگ کے دوران عمل کرنے کے مندرجہ ذیل مراحل ہیں:

اپنی کہانی سے ایک وقفہ لیں: جب آپ اپنا مسودہ مکمل کرلیں تو ایڈیٹنگ شروع کرنے سے قبل ایک وقفہ لیں۔ اسٹیفن کنگ اپنی کتاب On Writting: A Memoir of the Craft میں لکھتے ہیں کہ جب وہ اپنا پہلا مسودہ ختم کرلیتے ہیں تو کہانی کو چھ ہفتوں تک ایک دراز میں رکھتے ہیں اور پھر اسے ایڈیٹنگ کے لیے نکالتے ہیں۔ آپ اور آپ کی کہانی کے درمیان کچھ فاصلہ رکھنا آپ کو تازہ نگاہ اور صاف ذہن کے ساتھ موضوع پر واپس آنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اپنی کہانی بلند آواز سے پڑھیں: بلند آواز سے پڑھی جانے والی کہانی کو سننا کسی مسودہ میں موجود غلطیوں کو نمایاں کرسکتا ہے۔ آپ اپنی کہانی کو خود پڑھیں یا کسی دوست سے پڑھائیں۔ آپ اسے پڑھ کر خود بھی ریکارڈ کرسکتے ہیں اور اسے دوبارہ سن سکتے ہیں۔ اپنی کتاب کی ایک کاپی اور ریکارڈنگ کمپیوٹر پر کھلی رکھیں تاکہ قواعد کے کسی مسئلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس کی تصحیح ہوسکے۔

کہانی کو بڑے کینوس پر تصور کریں: آپ کی پہلی سیلف ایڈیٹنگ ترقیاتی ترمیم کے اصول پر مبنی ہونی چاہیے یعنی کہانی کے ساتھ کوئی مسئلہ تلاش کریں۔ پلاٹ پوائنٹس کا ایک منطقی تسلسل ہونا چاہیے جو شروع سے آخر تک روانی پیدا کرے۔ پلاٹ کی خامی تلاش کریں جسے ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ یقینی بنائیں کہ آپ کے ذیلی پلاٹ مرکزی کہانی کے ساتھ اچھی طرح سے مربوط ہیں۔ یہ بھی یقینی بنائیں کہ آپ کے مرکزی اور ثانوی کردار واضح محرکات

اور قابل اعتماد خصلتوں کے ساتھ سہ جہتی (Three Dimentional) ہوں۔ کردار کی تفصیلات کو دیکھتے ہوئے اس بات کو یقینی بنائیں کہ آپ کا نقطہ نظر پوری کہانی میں یکساں ہے۔

منظر کے لحاظ سے ایڈیٹنگ کریں: یقینی بنائیں کہ ہر منظر کا ایک مقصد ہے۔ جیسے کہ پلاٹ کو آگے بڑھانا، تنازع کو مزید الجھانا یا کردار کی نشو ونما میں مدد کرنا۔ جیسا کہ آپ مناظر کو توڑتے ہیں، ڈائلاگ پر جائیں اور کسی بھی غیر ضروری مذاق کو تراشیں۔ یقینی بنائیں کہ ابتدائیہ مضبوط ہے اور دیگر جزئیات اطمینان بخش جو آپ کے تمام ڈھیلے سروں کو جوڑتا ہے۔

خود اپنا کاپی ایڈیٹر بنیں: اپنے اگلے مرحلے پر اپنی کاپی کی ساختی سلیت کو چیک کریں۔ سطر بہ سطر جائیں اور بنیادی غلطیوں کو درست کریں۔ ہجے کی جانچ کریں۔ یقینی بنائیں کہ آپ کے پاس دو جملوں کے درمیان وقفہ کی صرف جگہ ہے۔ لہٰذا اوقاف اور قواعد کی غلطیوں کو درست کریں۔ اس کے علاوہ ایسے الفاظ تلاش کریں اور تبدیل کریں جنھیں آپ اپنی کہانی میں اکثر دہراتے ہیں، جنھیں تکیہ کلام یا بیساکھی کے الفاظ کہتے ہیں۔ اگر آپ کو غیر فعال آواز میں لکھے ہوئے سطور ملتے ہیں تو انھیں فعال آواز میں دوبارہ لکھیے۔ آخر میں اپنے جملے کی ساخت اور الفاظ کے انتخاب کو ہمیشہ ذہن میں رکھتے ہوئے چیک کریں کہ وہ سادہ اور بہتر ہے۔

درستگی کی جانچ کریں: اگر آپ افسانوی یا غیر افسانوی کتاب لکھ رہے ہیں تو یہ یقینی بنانا ہوگا کہ آپ جو معلومات پیش کرتے ہیں وہ درست ہیں۔ اپنی کتاب میں شامل تمام اعداد و شمار، کہانی یا حقیقت کے ذرائع تلاش کریں تا کہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ آپ کی فکر مربوط اور درست ہے۔

پروف ریڈر حاصل کریں: ایک بار جب آپ کی ترمیم مکمل ہوجائے تو پروف ریڈر کی خدمات حاصل کریں۔ آخری بار آپ کی کہانی کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنا ہمیشہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ پروف ریڈنگ ٹائپ کی غلطیوں کو پکڑ سکتی ہے جو آپ سے چھوٹ سکتی ہیں۔

نیوز آرگنائزیشن میں ایڈیٹنگ کی بنیادی باتیں: نیوز آرگنائزیشن میں ایڈیٹنگ کے لیے کچھ رہنما اصول بنائے گئے ہیں۔ ان اصول وضوابط کی پیروی کرنا خبری اداروں کی ذمے داری ہوتی ہے۔ رہنما اصول جو ایڈیٹنگ کو کنٹرول کرتے ہیں ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ قارئین کے علم کو زیادہ نہ سمجھیں اور ان کی ذہانت کو کبھی کم نہ آنکیں۔ نیوز آرگنائزیشن میں ایڈیٹنگ ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خبریں جلد باز رپورٹرز کے ذریعے لکھی جاتی ہیں اور کچے ہیرے کی طرح کھردری ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایڈیٹرز کی ایک ٹیم کے ذریعے اس کاپی کو تراش خراش کر قابل اشاعت یا قابل نشر بنایا جاتا ہے۔

تحریر کے کسی ٹکڑے کی توجہ کو برقرار رکھنا ایڈیٹنگ کے مرحلے کا ایک اور اہم نکتہ ہے۔ مصنّفین اپنے کام کی محافظت کے لیے بدنام زمانہ ہیں۔ متن تیار کرنا ایک تکلیف دہ اور وقت طلب عمل ہوسکتا ہے۔ اتنا وقت اور محنت لگانے کے بعد بعض مصنفین کے لیے مماس جملوں یا اقتباسات کو پہچاننا اور حذف کرنا بہت مشکل ہے، خاص طور پر اگر وہ اچھی طرح سے تیار کیے گئے ہوں یا ان میں شاندار خیالات ہوں۔

اس طرح ادارے کے اندر اور باہر سے آنے والی خبروں کے درمیان توازن قائم کرنے کے لیے ایڈیٹنگ کی جاتی ہے۔ خبروں کے انبار میں سے ضروری خبروں کو چھانٹ کر نکالنا اور ان میں بھی اچھی طرح سے لکھے گئے مضامین اور ناتجربہ کار رپورٹرز کی لکھی ہوئی اسٹوری کے درمیان توازن بنانا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس عمل میں ناپسندیدہ اسٹوری کو الگ کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ آخر میں صرف قابل اشاعت و قابل نشر اسٹوریز کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ان تمام اسٹوریز کو قواعد، نحو، حقائق، اعداد و شمار اور بامعنی بنانے کے لیے بار بار چیک کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی انھیں مزید بہتری کے لیے واضح کیا جاتا ہے اور وقت اور جگہ کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔

ایڈیٹنگ کے مقاصد

(I) درستگی کے لیے کوشش: درستگی ایڈیٹنگ کے مرحلے کی اہم ذمے داری میں سے ایک ہے۔ خبروں کی رپورٹ کی پیشہ ورانہ اور اخلاقی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے تحقیقی اور تحریری عمل میں حقائق کی جانچ کو شامل کریں جن میں ناموں کی درستگی، ہجے اور تلفظ، کہانی کے حقائق پر مبنی تفصیلات، اور کوئی بھی تفصیلات جن سے نتیجہ اخذ کیا گیا ہو۔ درستگی کے لیے متعدد تحقیق معمول ہیں۔ تمام محتاط، ذمے دار مصنّفین کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مکمل متن کی ساکھ، تحقیق اور تحریری عمل میں درستگی پر منحصر ہے۔

(II) حقائق کی جانچ: انٹرنیٹ نے حقائق کی جانچ کے لیے ذرائع تک رسائی بڑھادی ہے۔ بدقسمتی سے انٹرنیٹ نے مشکوک ذرائع تک بھی رسائی پیدا کردیا ہے۔ ان ذرائع کی علمی اعتباریت اور قابل اعتماد ہونے کے بارے میں بحثیں جاری رہیں گی جن میں عوام بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ عجلت میں آپ کی خام تحقیق تیار رسائی، رفتار اور صداقت کی عام شکل، عوامی استعمال اور دستیاب وسائل کی قبولیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسا کہ طب، قانون اور دیگر موضوعات پر خصوصی ویب سائٹس کے ساتھ مشکوک ویب سائٹس کی موجودگی سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ آج تو حالت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص آن لائن سرجیکل آپریشن کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اصل کیا ہے؟ زیادہ تر انٹرنیٹ صارفین غیر مانوس اور غیر تصدیق شدہ ویب سائٹ پر کریڈٹ کارڈ کی معلومات درج کرنے سے بچنے کے لیے کافی سمجھ دار ہیں۔ ’خریدار ہوشیار رہیں‘ کی نصیحت بالکل ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو حقائق پر مبنی معلومات تلاش کرنے کے لیے ویب کا اندھا دھند استعمال کرتے ہیں۔

(III) معروضیت کو برقرار رکھنا: غلط معلومات کو اچھے ذرائع سے بھی مشتہر کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک پریشان ماں جو دعوی کرتی ہے کہ اس کا قیدی بیٹا وفاقی قانون کا بے قصور شکار ہے، اپنے بیٹے کے مقدمے میں جذبات سے مغلوب ہوکر اس غلط نتیجے پر پہنچی ہوگی، جب کہ مقدمہ کے حقائق اس کے برعکس ہیں۔ معروضیت کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی بھی رپورٹر اس کی ماں کے نقطہ نظر (اگرچہ غیر دستاویزی ہی کیوں نہ ہو) اور حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے رپورٹ تیار کرسکتا ہے اور وہ گرفتار کرنے والی اتھارٹی کے ذریعے بتائے گئے کسی دوسرے دعوے کی بھی اطلاع دے سکتا ہے۔

(IV) Track پر رہنا: تحریر کے کسی ٹکڑے کی توجہ کو برقرار رکھنا ایڈیٹنگ کے مرحلے کا ایک اور اہم نکتہ ہے۔ مصنّفین اپنے کام کی محافظت کے لیے بدنام زمانہ ہیں۔ متن تیار کرنا ایک تکلیف دہ اور وقت طلب عمل ہوسکتا ہے۔ اتنا وقت اور محنت لگانے کے بعد بعض مصنفین کے لیے مماس جملوں یا اقتباسات کو پہچاننا اور حذف کرنا بہت مشکل ہے، خاص طور پر اگر وہ اچھی طرح سے تیار کیے گئے ہوں یا ان میں شاندار خیالات ہوں۔ مصنفین کو ان عمومیات کی طرف بھی اندھا کیا جاسکتا ہے جو کسی موضوع کی تفصیلات کا مناسب احاطہ نہیں کرتے ہیں۔ مختصراً ایڈیٹر کا کردار اکثر لکھنے کے عمل میں مصنف کی جذباتی اور فکری سرمایہ کاری سے متصادم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے مصنفین کے لیے متن میں ترمیم کرنے سے پہلے خود کو اس

سے دور رکھنا یا کسی اور سے متن کو ایک غیر جانب دار ایڈیٹر سے پڑھنے کے لیے کہنا عام ہے۔

سب ایڈیٹر کے فرائض اور ذمے داریاں

سب ایڈیٹر بنیادی طور پر اس طریقہ کار کے لیے ذمے دار ہوتا ہے، جس میں کسی جریدے یا اخبار کو ڈھالا جاتا ہے، پرنٹنگ کے لیے بھیجا جاتا ہے اور عوام کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے پاس ایک وکیل کا تجزیاتی نقطہ نظر اور تیز دماغ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ کہانی کو جلدی سمجھ سکتا ہے اور معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اسے نامہ نگاروں کی طرف سے بھیجے گئے مواد سے اہم نکات کو اکٹھا کرنا ہوتا ہے اور انھیں ایک منطقی اور دلچسپ انداز میں شکل دینا ہوتا ہے۔ اسے مناسب سرخیاں دینی پڑتی ہیں اور دستیاب

> سب ایڈیٹر طویل اور مشکل جملوں کو چھوٹے اور آسان جملوں میں تبدیل کر کے تحریر کی پڑھنے اور سننے کی اہلیت کو بہتر بنا سکتا ہے۔ وہ اس کام میں اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتا ہے یا من مانی نہیں کر سکتا۔ اسے ایسی تبدیلیوں کی مجموعی تاثیر پر شدت کے ساتھ غور کرنا پڑتا ہے۔

جگہ کے مطابق مواد پر نظر ثانی کرنا اور جامع بنانا ہوتا ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے، جس کے لیے مہارت، لکھنے کی ذہانت اور زبان پر عبور درکار ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ایک سب ایڈیٹر کو مختلف رپورٹرز کی رپورٹس سے نمٹنا پڑتا ہے۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے پریس یا نیوز اسٹوڈیو تک پہنچنے کے لیے اسے یہ تمام چیزیں وقت پر کرنی پڑتی ہیں۔

سب ایڈیٹر ان تمام مواد پر جو اس تک پہنچتا ہے زندگی یا موت جیسا اختیار رکھتا ہے۔ چونکہ خبری ادارے اپنی اسٹوریز مختلف ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً کارسپونڈنٹ، رپورٹرز، اسٹرنگرز، ٹیلی فون، نیوز ایجنسی کی رپورٹس اور زبانی مواصلات۔ لہٰذا یہ تمام معلومات سب ایڈیٹر کے ذریعے چھن کر قابل نشر و اشاعت بنتی ہیں۔ سب ایڈیٹر کو اپنے سامنے پڑے کسی مردہ مادہ میں جان ڈالنی ہوتی ہے تاکہ اسٹوریز نئے سرے سے جی اٹھے اور جاندار بن جائے۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ اخبار کا میک اپ سب ایڈیٹر کے News Values کی عکاسی کرتا ہے۔ میک اپ کے فن میں سب ایڈیٹر کی ادارتی صلاحیت کا اصل امتحان بلاشبہ مرکزی خبر کے صفحے کی ظاہری شکل ہے۔ یہ وہ صفحہ ہے جسے پڑھنے والوں کی اکثریت سب سے پہلے پڑھتی ہے۔

سب ایڈیٹر درحقیقت اخبار کے دیگر ملازمین کی بہ نسبت اس معنوں میں زیادہ ذمے دار ہوتا ہے کہ اخبار کا فائنل پروڈکٹ کیسا لگتا ہے اور قارئین کے لیے اس میں کیا ہے۔ اخبار کی شکل حقیقت میں سب ایڈیٹر کے ذریعے طے کی جاتی ہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ سب ایڈیٹر کے پاس صحیح قسم کی خبروں کا انتخاب کرنے کی ناک ہونی ضروری ہے۔ یہ سب ایڈیٹر کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ کل کے اخبار میں کیا شائع ہونے والا ہے اور کس شکل میں۔ درحقیقت اپنے کام کا وسیع تجربہ رکھنے والا سب ایڈیٹر وقت کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر بننے کے لیے موزوں ترین شخص ہوتا ہے۔

سب ایڈیٹر کی ایڈیٹنگ میں صفحات پر تصاویر کے استعمال کی ذمے داری بھی شامل ہے۔ تصویروں کی قدر کا زیادہ اندازہ لگانا مشکل ہوگا۔ چونکہ ایک تصویر ہزار الفاظ میں بولتی ہے۔ اس لیے تصویروں کو ان کی بہترین تاثیر کے لیے استعمال کرنے کی درکار مہارت کی توقع سب ایڈیٹر سے کی جاتی ہے۔ تصویریں اگر متعلقہ ہیں تو ان کو اخبار میں شامل کرنے کے قابل بنانے کے لیے وہ آرٹ ڈائریکٹر اور دیگر معاونین کی مدد بھی لیتا ہے۔ تصویروں کے انتخاب اور ان کے ڈسپلے کے لیے بھی سب ایڈیٹر ہی فیصلہ لیتا ہے۔ ایسے میں سب ایڈیٹر کو اہم فوٹو گرافرز اور فوٹو گرافی کی ایجنسیوں سے بھی واقفیت ضروری ہے جو حقیقت میں اس کے اخبار کو اہم واقعات اور خبروں کی تصاویر فراہم کرتے ہیں۔ بڑے اخبارات میں تو اپنے فوٹو گرافر رکھنے کا چلن ہے جو اپنے اخبار کے لیے خصوصی تقریب اور دیگر پروگراموں کا احاطہ کرتے ہیں۔

سب ایڈیٹر کے لیے اگلا قدم وہ اہم الفاظ جو قارئین کی توجہ اسٹوری کی طرف مبذول کرتے ہیں، پرکشش سرخی لکھنا ہے۔ سرخی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ سرخی دیکھتے ہی قاری خبر پڑھنے پر مائل ہو۔

سب ایڈیٹر کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ وہ اسٹوریز کی درستگی کی جانچ کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ معنی خیز ہے۔ تمام ناموں، تاریخوں، عنوانات، اعداد و شمار، جگہ کے نام یا کسی بھی مشتبہ نکتے کو دستیاب حوالہ کے مختلف ذرائع سے چیک کرے۔ اچھی طرح سے لکھی گئی اسٹوریز پر کم سے کم توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب ایڈیٹر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ مصنفین اور رپورٹرز کے ساتھ مثبت تعلقات بنائے اور اسے مستقل طور پر برقرار رکھے کیونکہ وہ خبری نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سب ایڈیٹر کی خوبیاں: سب ایڈیٹر کو مختلف علوم اور ان مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے ہر قاری، سامع یا ناظر کو جلدی اور آسانی سے سمجھانے میں مدد کر سکے کہ اصل کہانی کیا ہے۔ رپورٹر یا مصنف اور قاری کے درمیان سب ایڈیٹر پل کا کام کرتا ہے۔ ایک سب ایڈیٹر میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے وہ اس طرح ہیں:

* زبان اور ہجے کی بہت اچھی کمانڈ اور واضح طور پر لکھنے کی صلاحیت * درستگی کا جنون * وسیع علم * ایک منظم ذہن * اخبار کی بہترین تیاری کا شعور * تیز رفتار اور دباؤ میں درست طریقے سے کام کرنے کی صلاحیت * مصنفین اور رپورٹرز کا احترام * اشاعتوں کو متاثر کرنے والے قوانین کی اچھی معلومات * تصور کرنے کی صلاحیت * حس مزاح * تفصیلات کو حاصل کرنے کے لیے تیز دماغ اور اچھی آنکھ * صحافیوں اور دیگر ایڈیٹرز کے ساتھ رابطہ کرنے کی صلاحیت * زبردست سرخیاں لکھنے کی تخلیقی صلاحیت

تصویروں کا ڈسپلے اور ان کا کیپشن لکھنے کی صلاحیت: سب ایڈیٹر طویل اور مشکل جملوں کو چھوٹے اور آسان جملوں میں تبدیل کر کے تحریر کی پڑھنے اور سننے کی اہلیت کو بہتر بنا سکتا ہے۔ وہ اس کام میں اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتا ہے یا من مانی نہیں کر سکتا۔ اسے ایسی تبدیلیوں کی مجموعی تاثیر پر شدت کے ساتھ غور کرنا پڑتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ جملے کی لمبائی یا پیچیدگی ہی پڑھنے یا سننے میں دشواری کا باعث بنتی ہے۔ کل ملا کر ایڈیٹنگ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے کسی مسودے کو درست کیا جاتا ہے، اس میں ترمیم کی جاتی ہے تاکہ وہ قابل اشاعت بن سکے اور قاری اور سامع اسے پڑھ سن کر محظوظ ہو سکیں۔ برقی میڈیا میں بھی خبروں کے شعبے سے متعلق ایڈیٹر کی ذمے داریاں بھی کم و بیش سب ایڈیٹر کی ذمے داریوں کی طرح ہی ہوتی ہیں۔ اچھے بلیٹن کی تشکیل کے مرحلے میں سب ایڈیٹر کی بیشتر ذمے داریوں، خوبیوں اور مہارت کا اطلاق ایڈیٹرز پر بھی ہوتا ہے۔ اسٹوری کو واضح، جامع اور ترسیلی بنانے کا عمل یہاں بھی اسی طرح اپنایا جاتا ہے جیسے کہ پرنٹ میں لیکن یہاں اختصار پر ساری توجہ مرکوز ہوتی ہے۔

Reference:
(1) https://www.shareyouressays.com
(2) https://work.chrom.com
(3) www.masscommunication.com
(4) www.mediabistro.com
(5) https://www.prospects.ac.uk

■

Dr. Md. Tauheed Khan
Associate Professor, Centre of Indian Languages
School of Languages, Literature and Culture Studies, JNU
New Delhi - 110067

محمد فاروق

اردو طنز و مزاح اور اودھ پنچ

تمام اصناف ادب کی اساس انسانی زندگی ہے اور انسانی زندگی کی تکمیل جذبہ وفکر اور عزم، حسن وقبح، حق و باطل نیز خیر وشر سے ہوتی ہے۔ مذکورہ اوصاف میں سے کوئی نہ کوئی ایک صفت کسی صنف میں ضرور واضح انداز میں ملتی ہے۔

طنز و مزاح، دو مختلف انسانی کیفیات کے فنکارانہ اظہار پر مبنی فن پارے کو کہتے ہیں جن کے سنتے یا پڑھتے ہی شیریں یا تلخ احساس میں تموج آجاتا ہے۔ اگر کوئی فن کار نرم مزاج ہو، ٹھنڈا دماغ رکھتا ہو اور کسی کا دل دکھائے بغیر بات میں بات پیدا کر کے محض ہنسنے ہنسانے کی کوشش کرنا چاہتا ہے تو اس کا یہ مشغلہ مزاح کی حدود میں رہتا ہے۔ اسے انگریزی میں Humar کہتے ہیں، وہ فنکار جو بات میں بات پیدا کرتے وقت دوسروں کی نازک مزاجی اور خوش گمانی کا خیال نہ کرتے ہوئے کسی کو چوٹ پہنچاتا تو وہ طنز بن جاتا ہے۔ اس کی انگریزی اصطلاح Satire ہے۔ گویا طنز و مزاح میں دو مختلف کیفیات پائی جاتی ہیں۔

اردو میں مزاح کی دو قسموں کی وضاحت اس طرح ملتی ہے: مزاح جلی اور مزاح خفی

مزاح جلی میں مزاح نگار نشانۂ مزاح کے مضحک پہلوؤں کی نمایاں طور پر ہنسی اڑاتا ہے۔ یہ مزاح قہقہے کا محرک ہوتا ہے جس سے لوگ عام طور پر خاصے محظوظ ہوتے ہیں۔

مزاح خفی میں ظرافت موج تہہ نشیں کی طرح اندر اندر پھیلتی ہے اور اس کو برتنے' اس سے لطف اندوز ہونے، کے لیے لطیف ذوق، باریک بین نگاہ، تیز ذہانت اور غیر معمولی حسِ ظرافت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان عناصر کی ترکیب سے ظہور پائے مزاح کی کیفیت جب آورد کی بجائے آمد کی ہوتی ہے تو یہ 'خالص مزاح' کے زمرے میں آجاتا ہے۔ اس لیے فرائڈ نے اس کی الگ صورت بتائی ہے۔ اسی نوع کے مزاح کو حالی نے 'سہانی خوشبو سے لپٹی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا' سے تعبیر کیا ہے جس کی بنیاد طبیعت میں شگفتگی اور زندہ دلی ہے۔ خواجہ عبدالغفور نے 'خالص مزاح' کی وضاحت یوں کی ہے:

"...اس کی کیفیت آمد کی ہے آورد کی نہیں، یہ گھسیٹا ہوا یا گڑھا ہوا مزاح نہیں... بلکہ فی البدیہہ اور برجستہ ہوتا ہے۔ اس کا سرچشمہ خوش طبعی ہوتا ہے اور خوش کلامی اور خوش گفتاری پھوٹنے والے چشمے کی طرح رواج رواں! صرف صورت واقعہ یا انسانی کمزوریاں ہنسی کا محرک نہیں ہوتی ہیں بلکہ ہمدردیاں، دل خوش کن باتیں، بیان میں گھلاوٹ یا زبان میں لچک، اس کے منبع ہوتے ہیں۔ سمجھ بوجھ، فہم وذکا اور حساس دل، صحیح احتساب اور سلاست اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔"

(طنز ومزاح کا تنقیدی مطالعہ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1982، ص 290)

اس بابت اکبر الہ آبادی بھی ایسا ہی خیال رکھتے ہیں۔ کہا ہے۔

لطف سخن تو ہے یہی میرس بھی ہو، وٹی بھی ہو
ذہن کا وصف ہے یہی، اور ہیجانٹی بھی ہو

معلوم ہوا کہ خوش کلامی، خوش گفتاری اور لطیف اظہار سے مزاح پیدا ہوتا ہے اور 'لطیف اظہار' ذکاوت کی دین ہوتی ہے۔ وہیں ظرافت بھی جس میں آمد کی کیفیت ہو، ذکاوت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ شعری ونثری مزاحیہ فن پاروں کے مطالعے سے لگتا ہے کہ جس فن پارے میں ظرافت کی چاشنی ہے وہی اعلیٰ معیار کو چھو پایا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ شعر

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

یادلا ور فگار کا یہ قطعہ

سکتہ تھا ایک شاعرِ اعظم کے شعر میں
یہ دیکھ کر تو میں بھی تعجب میں پڑ گیا
پوچھی جو اس کی وجہ تو کہنے لگے جناب
سردی بہت شدید تھی مصرعہ سکڑ گیا

دونوں فن پارے میں آمد کی کیفیت ہے اور برجستگی بھی، خوش طبعی کا لطیف اظہار ہے اور اس اظہار میں معنوی تہہ داری بھی ہے۔ خالص مزاح ہے جس کی تہہ میں دوڑتی ظرافت کی رو ہی حس لطیف کو شگفتگی عطا کرتی ہے اور مزاح کی سطح بلند کرتی ہے۔

زندگی اور متعلقات زندگی کے غیر متناسب مظاہر کو فنکارانہ طور پر نمایاں کرنے سے مزاح ظاہر ہوتا ہے۔ اس فنکارانہ اظہار میں گدگداہٹ ہو اور ہلکی چبھن بھی ہو تو اس کی چاشنی اور لطافت، جاندار اور دیرپا ہوتی ہے۔ مزاح، احساس برتری، ناپسندیدگی، تمسخر، دعوت غور وفکر اور جذبہ ہمدردی کے آمیزے سے متشکل ہوا کرتا ہے۔ مزاح نگار وحدت کی بجائے کثرت کے ماحول کو پسند کرتا ہے اور اس میں اپنے کو پروان چڑھاتا ہے، وہ براہ راست اظہار نہیں کرتا بلکہ لطیف اشارے کرتا ہے۔ وہ تعمیر کی نسبت تنقید کی جانب میلان رکھتا ہے۔ اس کا احساس برتری صرف فریب نظر ہے کیونکہ وہ اپنی کوتاہیوں غیر آہنگ برتاؤ اور ردعمل پر خوب کھلے دل سے ہنستا ہے، غیظ وغضب اور کینہ وکدورت سے دل کو صاف رکھتا ہے۔

جہاں تک مزاح کی تکنیک کا تعلق ہے تو مزاح نگاری کو بھی ایک فن کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں تمام فنون لطیفہ کی طرح فطری مذاق کو بڑا دخل ہے۔ مزاح جب تک دوسروں کے اندر آواز بازگشت پیدا نہیں کرتا، کامیاب نہیں ہو سکتا اور یہ آواز بازگشت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک زبان پر قدرت حاصل نہ ہو۔ ہنسی کے لیے تضاد اور تقابل کا وجود لازم ہے کیونکہ تضاد کے بغیر چیزوں کی معنویت غائب ہونے لگتی ہے۔

مزاح نگاری کی تکنیک کا ایک عنصر موازنہ ہے۔ اس کی عمدہ مثال پطرس بخاری کے انشائیہ 'کتے' میں ملتی ہے جہاں مشابہت اور تضاد سے مزاح کو تحریک دی گئی ہے جو مشاعروں اور کتوں کے ہنگاموں کے مابین ہے۔ دوسرا عنصر مزاحیہ کردار ہے جس کی مثال سرشار کے یہاں 'خوجی' سجاد حسین کے یہاں 'حاجی بغلول' اور امتیاز علی تاج کے 'چچا چھکن' کی صورت میں ملتی ہے۔ تیسرا

عنصر مزاحیہ صورت واقعہ ہے۔ جس کی مثال پطرس بخاری کے یہاں انشائیہ 'مرحوم کی یاد میں' میں ملتی ہے۔ ان تکنیکوں کی مدد سے مزاح نگار، کبھی خود کو مضحک بناتا ہے اور کبھی شریک حیات کو، کبھی احباب میں سے تو کبھی دوسروں کے درون خانہ تاک جھانک کر بھی مضحک کردار نکالتا ہے۔ کبھی کسی رویے پر، معمولات زندگی کے کسی پہلو پر ہنسا جاتا ہے کہ وہ غیر معمولی اور عام روش سے الگ ہے اور کبھی کسی طریق اور واقعے پر اس لیے ہنسا جاتا ہے کہ وہ مذاق عام میں ناپسندیدہ ہے۔ اس کی مثالیں سجاد حسین اور 'پنچ' کے مضامین و انشائیے میں ملتی ہیں۔ مزاح نگاری کا چوتھا عنصر زبان و بیان کی بازیگری ہے اور پانچواں عنصر تحریف یا پیروڈی ہے۔ جس کی مثالیں کنہیالال کپور وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں۔ ان ہی طریقوں سے کام لے کر مزاح نگاری میں کامیابی حاصل کی جاتی ہے۔

انگریزوں کے مکمل تسلط کے بعد ملک میں سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی سطح پر جو بگاڑ آیا اس سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے مہم چھیڑنے والے شعرا و ادبا ایسے ابھرے جنھوں نے طنز و مزاح کو اپنا ہتھیار بنایا۔ اس کے لیے منشی سجاد نے اخبار 'لندن پنچ' کی طرز پر 1877 میں لکھنؤ سے اخبار 'اودھ پنچ' نکالا اور انھیں اجتماعی اظہار کا ایک میدان فراہم کیا۔ یہ اخبار 1912 تک بڑی آن بان سے نکلتا رہا۔ اس اخبار کے ذریعے بے شمار طنز و مزاح نگار متعارف ہوئے۔ ان میں خود ایڈیٹر 'اودھ پنچ' منشی سجاد حسین، منشی احمد علی شوق، نواب سید محمد خان آزاد، مولوی عبدالغفور شہباز، پنڈت رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، جوالا پرشاد برق، تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی محفوظ علی کاکوروی، منشی احمد علی کسمنڈی، فدا حسین خان، مولانا امید امیٹھوی، ابوالکلام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا اخبار تھا جس نے طنز و مزاح کے نئے گر دریافت کر کے اپنے دور کے رائج الوقت معیار کی ترجمانی کی۔ شعرا و ادبا کو ایک بڑا عوامی پلیٹ فارم مہیا کیا۔ بالخصوص نثر میں طنز و مزاح کے پھلنے پھولنے کی زمین تیار کی۔ اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر ریاض خیرآبادی نے گورکھپور سے 'اخبار فتنہ' بعدہ 'عطر فتنہ' اسی زمانے میں جاری کیا۔ اس طرح 'اودھ پنچ' طنز و مزاح کے میدان کو وسعت دے کر اجتماعی شعور کا حصہ بنا۔ اس کی اہمیت پر ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں روشنی ڈالی ہے:

''... غالب کے بعد اردو نثر میں مزاح نگاری کا اگلا دور 'اودھ پنچ' سے شروع ہوتا ہے۔ اگر چہ بقول چکبست 'اودھ پنچ' کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ غالب سے کہیں مختلف ہے کہ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے تیر کمان سے، لیکن اس وقت کی سوسائٹی کو مد نظر رکھ کر 'اودھ پنچ' کے علم برداروں کی نگارشات کا جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی اس اخبار نے اردو زبان میں پہلی بار بھرپور طنزیہ انداز اختیار کیا اور ایک ایسے وقت میں جب کہ زندگی میں انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں' فضا کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی...'' (اردو ادب میں طنز و مزاح، ص 188)

'اودھ پنچ' کے ادبا میں سب سے ممتاز پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں جنھوں نے متعدد مزاحیہ نگارشات کے علاوہ اردو کا پہلا طنزیہ و مزاحیہ ناول 'فسانہ آزاد' ادب کو دیا۔ یہ ایک وسیع کینوس کا ناول ہے جس میں طنز و مزاح کے سارے حربے مل جاتے ہیں۔ گرچہ دور سرشار کے اسالیب مزاح نگاری اور لوگوں کا عمومی مذاق اب بدل گیا ہے پھر بھی بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

''... سرشار نے اپنے عہد کے تہذیبی رویوں کے تضاد سے جو مزاح پیدا کیا ہے وہ آج بھی زندہ ہے اور خوجی کی شکل میں اپنے عہد کے زوال کی علامتوں کو ایک مزاحیہ کردار میں پیش کر کے انھوں نے ایک لافانی مزاحیہ کردار تخلیق کیا ہے۔ اگر زمانہ سرشار کے فن کو مکمل طور پر بھی منسوخ کر دے تو بھی خوجی ان کے نام اور فن کو قائم رکھنے اور دوام دینے کے لیے کافی ہے۔

اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں 'فسانہ آزاد' ایک ایسا لازوال قہقہہ ہے کہ جس کی گونج ہر عہد میں صدیوں تک سنائی دیتی رہے گی۔ اس قہقہے میں اتنی توانائی اور قوت ہے کہ وقت کے سرد اور ظالم ہاتھ بھی اس گونج کی لہروں کو خاموش نہیں کر سکتے۔ یہ اردو ادب میں قائم رہنے والی ایک مستقل تھرتھراہٹ ہے کہ جس کا رخ ہمیشہ مستقبل کی طرف رہے گا......'' (ایضاً، ص 119)

اور 'اودھ پنچ' کے شعرا میں سب سے ممتاز و منفرد شاعر اکبر الہ آبادی تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو جدید فکر سے ہم آہنگ کیا۔ اسے نیا تیور اور نئی دھار دی، اور طنز و مزاح نگاری کا ایسا معیار قائم کیا، ایسا اسلوب اختیار کیا جس کے وہ موجد اور خاتم بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے فن کو ایک خاص اسلوب، آہنگ اور انداز بخشا بلکہ اسے ایک نہایت نازک وقت پر اہم موضوعات کے تحت پیش کر کے 'اودھ پنچ' کے مقاصد کو پورا کیا اور اپنے ساتھ اخبار کی شہرت میں بھی چار چاند لگا دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''... اکبر الہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا عروج انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے خمس اول میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان کی سماجی، مذہبی،' سیاسی اور معاشی زندگی کی سنگین دیواروں میں مغرب کی بڑھتے ہوئے سیلاب نے ایسے شگاف پیدا کر دیے تھے کہ معاشرے کی ساری عمارت کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے میں اکبر کے ذہن اور بازو میں جنبش پیدا ہوئی اور طنز کے نوکیلے تیروں کی بارش شروع ہو گئی'' (ایضاً، ص 119)

نثر میں طنز و مزاح کو بیسویں صدی میں عروج حاصل ہوا کیونکہ 1857 کے بعد کا زمانہ انگریزوں کی آقائی اور ہماری غلامی کے ساتھ ساتھ مغربی زبان، مغربی تہذیب اور مغربی معاشرت کے تسلط کا زمانہ تھا جس میں ہندستانی واضح طور پر دو گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ایک پرانی قدروں کا کسی طور پر سودا کرنے کو تیار نہیں تھا، دوسرا انگریزوں کی لائی ہوئی ہر نئی قدر کا فدائی تھا۔ اور سیاسی نظام جبر و استحصال کے ڈگر پر چل رہا تھا۔ ایسے میں ہندستانی قوم حد درجہ انتشار میں مبتلا تھی۔ شعرا و ادبا محسوس کر رہے تھے کہ اب معاشرتی زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ ابھر رہا ہے جو انفرادی سے زیادہ اجتماعی بنیادوں پر استوار ہو رہا ہے۔ اس لیے قومی اور اجتماعی سطح پر پوری شدت سے اس نئے نظام کی سیاسی و معاشرتی خرابیوں پر کلی یا جزوی طور پر حملہ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ شخصی و انفرادی ہجوگوئی پر توانائی صرف کرنے کی۔ اس نئی صورت حال نے طنز و مزاح کے شاعرانہ اسلوب کو کچھ بے اثر سا کر دیا تھا کیونکہ کھلے جملوں کے لیے جس قدر موثر نثر کا اسلوب ہوتا ہے نظم کا نہیں ہوتا۔ 'اودھ پنچ' کی تحریک نے اس کی بنیاد استوار کر بھی دی تھی۔ اس لیے نثر نگاروں نے مضبوطی سے قلم سنبھالا۔

آزادی ہند تک قومی اور بین الاقوامی حالات بھی ایسے ہوئے جس نے طنز و مزاح نگاری کی فضا بنا دی، نتیجتاً مزاح نگاروں کی قابل لحاظ تعداد ابھر کر سامنے آئی۔ ہمارے افکار و خیالات پر مغربی تہذیب کے اثرات پڑ رہے تھے۔ مغربی ادب کا رنگ مشرقی ادب میں چڑھ رہا تھا۔ لہٰذا طنزیہ و مزاحیہ ادب بھی نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ منصۂ شہود پر آنے لگا۔ اس دور میں نئی نئی فنی تکنیک اور موضوعاتی تنوع کے ساتھ ابھرنے والے طنز و مزاح نگاروں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، عظیم بیگ چغتائی، عبدالعزیز فلک پیما، فرقت کاکوروی، مرزا فرحت اللہ بیگ، تمکین کاظمی، مرزا چپاتی، ایم ایم اسلم، سالک باری، سجاد علی انصاری، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت علی تھانوی، کنھیالال کپور، کرشن چندر، شفیق الرحمن اور ابراہیم جلیس نمایاں رہے۔

■

Mohammad Farooque
4, Gowala Para Bye Lane, P.O Rishra
Distt.: Hooghly- 712248 (West Bengal)
Mob.:9748576762

اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں صوفیائے دکن کا حصہ

احمد

> بلاشبہ زبان کی تعمیر و ترقی، ترویج و اشاعت صوفیا کا مطمح نظر نہیں تھا بلکہ عوامی زبان کی طرف ان کا میلان تبلیغی اور اصلاحی مقاصد کے پیش نظر تھا۔ صوفیا کے ارادت مندوں میں عوام اور خواص دونوں ہی ہوتے ہیں۔

اردو برصغیر میں عام بول چال کی وہ زبان ہے جس کا قدیم ہند آریائی زبان سے بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ ہندوستان میں رابطے اور بول چال کی زبان کے طور پر اس کی ترویج و اشاعت مسلمانوں کی آمد سے بھی پہلے کا واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس دور میں ارباب اقتدار اور اہل علم و دانش نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اس زبان کے ابتدائی نمونے متعدد علاقوں میں مختلف شکلوں میں شبہ پاروں کی صورت بکھرے نظر آتے ہیں۔ اردو زبان کی ایک اہم خاصیت رہی ہے کہ وہ جس علاقے میں گئی وہاں کے علاقائی اثرات کو قبول کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد گزار بنی۔ اردو زبان کی اس کشادہ قلبی کا اثر یہ ہوا کہ ہر علاقے میں اس کا رنگ و آہنگ ایک دوسرے سے قدرے مختلف اور جداگانہ رہا۔ اس میں جذب و ادغام کا ایک لطیف رشتہ ہمیشہ موجود رہا جس نے قومی وحدت اور مذہبی ہم آہنگی کا راستہ ہموار کیا۔ اپنے مختلف رنگ و اسلوب اور لب و لہجے کی وجہ سے مختلف علاقوں میں اس کا نام بھی مختلف رہا۔ زبان کے نام میں اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ علاقائی اثرات کو قبول کرنے کی وجہ سے اردو کا رنگ و روپ متعدد علاقوں میں جداگانہ رہا۔ اردو زبان کو اس کے تاریخی پس منظر کی بنا پر مختلف ناموں مثلاً ریختہ، ہندوی، ہندوستانی، اردو اور اردوئے معلی جیسے ناموں سے تعبیر کیا گیا۔

تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دور میں مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی اثرات ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ ہو رہے تھے اسی دور میں اردو زبان مقامی محاوروں اور کہاوتوں میں استعمال کی جا رہی تھی۔ اردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ اس بات کا شاہد ہے کہ ابتدا میں اشرافیہ کے بڑے طبقے نے اسے نا قابل اعتنا سمجھا کیونکہ ان کے درمیان فارسی جیسی متمول زبان رائج تھی۔ یہ اشرافیہ طبقہ تھا جس کی زبان عربی اور فارسی تھی۔ تیسرا گروہ ان انسان دوست صوفیا کا تھا جن کی آمد نے انسانیت اور اردو زبان کو بہت کچھ دیا۔ صوفیا نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی اور اردو نے ذہنوں میں۔ انھوں نے اردو کو بڑے پیمانے پر اپنایا اور عوام میں اپنی تعلیمات کو پہونچانے کا ذریعہ بنایا۔ وہ اردو کو اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا ایک بہترین ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے۔ اس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ یہ زبان عوام میں بولی اور سمجھی جاتی رہی ہوگی۔ لہٰذا اس کے توسط سے عوام سے مکالمہ کرنا آسان تھا۔ تبلیغ و ارشاد کے بامعنی اور مفید مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی نئی یا اجنبی زبان کو اپنانا کار لاحاصل تھا۔ اس بات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان کی بنیاد بہت قدیم ہے اور اس کے تشکیلی دور میں صوفیا کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صوفیا کے کلام اور ان کے ملفوظات سے ادبی تخلیقیت اور لفظوں کے خلاقانہ استعمال کی کوئی زندہ اور توانا روایت نہیں ملتی لیکن ایک زبان کی حیثیت سے اردو کی ترویج و اشاعت میں ان کا کردار مثالی ہے۔ صوفیا کی ابتدائی کوششیں نہ ہوتیں تو شاید اردو زبان و ادب اور اسلوب و آہنگ کی زندہ اور توانا روایتیں بھی نہ ہوتیں۔

اردو زبان کے تشکیلی دور میں صوفیا کی تحریری سرگرمیوں، ملفوظات اور تواریخ میں محفوظ ان کے اقوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ زبان کی تعمیر و ترقی، ترویج و اشاعت صوفیا کا مطمح نظر نہیں تھا بلکہ عوامی زبان کی طرف ان کا میلان تبلیغی اور اصلاحی مقاصد کے پیش نظر تھا۔ صوفیا کے ارادت مندوں میں عوام اور خواص دونوں ہی ہوتے ہیں۔ یہ صوفیا سے تعلق کا نتیجہ ہی تھا کہ اردو زبان کے بعض محاورے اور روزمرہ کی کہاوتیں ان مصنفین کی کتابوں میں بھی جگہ پا جاتی ہیں جو اپنی نگارشات فارسی میں رقم کیا کرتے تھے۔[1] مثال کے طور پر ابوالفرج، خواجہ مسعود سعد سلمان، منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف اور امیر خسرو وغیرہ کی فارسی تصانیف میں بہت سے اردو یا ہندوی الفاظ کا بے تکلف استعمال ہوا ہے۔

اردو زبان کی تشکیل کے تعلق سے سب سے پہلا نام مسعود سعد سلمان لاہوری (1046-1121) کا لیا جاتا

ہے۔انھیں ہندوی کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔[2]

امیر خسرو کے مطابق ان کا ایک ہندوی دیوان بھی تھا جو آج مفقود ہے۔ امیر خسرو فارسی کے شاعر تھے لیکن 'دیباچۂ غرۃ الکمال' سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تفریح طبع کے طور پر ہندوی زبان میں بھی کچھ شاعری ضرور کی ہے۔[3]

امیر خسرو سے بہت سی معروف پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں منسوب ہیں جن میں سے اکثر کی استنادی حیثیت مشکوک ہے۔ امیر خسرو کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا کے ایک اور مرید امیر حسن کی ایک غزل اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، شیخ حمید الدین ناگوری، خواجہ نظام الدین اولیا، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری وغیرہ کے ارشادات وملفوظات اور بیاضوں میں بھی اس زبان کے ابتدائی نقوش اور تشکیلی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جنوبی ہندوستان ایک طویل مدت تک شمالی ہند سے الگ تھلگ رہا ہے۔ جنوبی ہند میں عرب تاجر اور مبلغ کی حیثیت سے اور ترک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ جو اپنی زبان اور روایات بھی ساتھ لائے۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی روابط کا آغاز جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور کے حملوں سے شروع ہوا جو محمد بن تغلق اور اورنگ زیب کے عہد تک جاری رہا۔ ان کے حملوں اور فتوحات کے سبب بڑے پیمانے پر آمد و رفت کے علاوہ تہذیبی لین دین کی راہیں استوار ہوئیں۔ محمد تغلق کی وفات کے بعد جب تغلق سلطنت کمزور ہوگئی تو دکن میں بہمنی سلاطین کو عروج حاصل ہوا اور امیر تیمور کے حملے کے بعد گجرات بھی آزاد ہوگیا اور نتیجتاً مظفر شاہ نے وہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ دکن کی ان دونوں ریاستوں کی تاریخ کے تحقیقی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے سلاطین کے عہد میں اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ اس عہد کی ادبی اور تخلیقی سرگرمی میں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان میں فخر الدین نظامی بیدری کے علاوہ سبھی صوفی ہیں اور ان صوفیا کی تحریری کاوشیں مذہبی نوعیت کی ہیں۔ جن میں شیخ بہاء الدین باجن (1388-1506) کی تصنیف 'خزائن رحمت اللہ' فارسی نثر میں ہے۔ اس کتاب کے 'خزینۂ ہفتم' میں شیخ باجن کا صوفیانہ کلام بھی شامل ہے۔[4]

قاضی محمود دریائی (1469-1534) کا کلام بھی صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م 1565) شاہ ابراہیم کے بیٹے تھے۔ جیو گام دھنی کے مجموعے کا نام 'جواہر اسرار اللہ' ہے۔ شیخ خوب محمد چشتی (م 1614) اسی زمانے کے نامور صوفی شاعر اور گجرات کے صوفیائے کبار میں سے ہیں۔ فارسی زبان اور انشا پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی اردو مثنوی 'خوب ترنگ (1578)' بڑی شہرت کی حامل ہے۔ شیخ خوب محمد چشتی کی تصنیف 'امواج خوبی' جو کہ فارسی نثر میں ہے دراصل اسی مثنوی کی شرح ہے۔ خوب محمد چشتی کا ایک منظوم رسالہ 'چھند چھنداں' بھی خاصا مشہور ہے۔ اس رسالے میں فارسی عروض کو ہندوی عروض کے توسط سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی جیو گام دھنی اور خوب محمد چشتی نویں اور دسویں صدی ہجری کے صوفی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔[5]

دسویں صدی ہجری کے اواخر اور گیارھویں، بارھویں صدی ہجری میں شیخ احمد گجراتی، سید محمد مہدی، میاں مصطفیٰ، عالم گجراتی، محمد فتح بلخی وغیرہ قابل ذکر شعرا ہیں۔ یہ تمام شعرا گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی ادبی روایت 'گجری روایت' کہلاتی ہے۔

حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کی دکن تشریف آوری سے دکن میں دکنی اردو کی تحریری تخم ریزی ہوئی۔ آپ کے خلیفہ میراں جی شمس العشاق (م 1496) کو اردو لکھنے والوں میں اولیت حاصل ہے۔ ان کا تعلق خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سلسلے سے تھا۔ آپ شاہ کمال الدین بیابانی کے خلیفہ تھے۔[6] خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق اور مغز مرغوب ان کی نظمیں ہیں۔ 'شہادت التحقیق' میراں جی کی ایک طویل نظم ہے، جس میں انھوں عام لوگوں کی تفہیم کے لیے معرفت اور شریعت وطریقت کے مسائل قرآن وحدیث کی روشنی میں آسان اور سادہ زبان میں بیان کیے ہیں۔ سید اشرف بیابانی (1459-1528) کی تین تصانیف دستیاب ہیں: 'لازم المبتدی'، 'واحد باری' اور 'نوسر ہار' میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

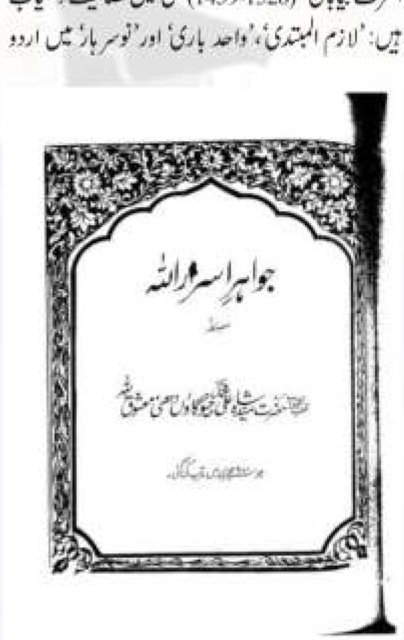

شاہ برہان الدین جانم، میراں جی شمس العشاق کے فرزند ارجمند اور خلیفہ تھے۔[7] ان کا مفصل حال نامعلوم ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کا انتقال 1582 کے بعد ہوا۔ شاہ برہان الدین جانم اپنے وقت کے بڑے عارف باللہ اور برگزیدہ بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ 'کلمۃ الحقائق' اور 'رسالۂ وجودیہ' ان کی نثری کتابیں ہیں۔ ان کا منظوم کلام 'وصیت الہادی'، 'بشارت الذکر'، 'فرمان از دیوان'، 'حجۃ البقا'، 'ارشاد نامہ'، 'منفعت الایمان'، 'نکتۂ واحد' اور 'سکھ سہیلا' کی شکل میں ملتا ہے۔ ان کی نظم وصیت الہادی ایک مربوط و مسلسل نظم ہے جس کے اوزان ہندوی ہیں لیکن عربی فارسی کے الفاظ کی تعداد دور ماقبل کی بہ نسبت زیادہ نظر آتی ہے جو کہ عربی فارسی کی وہ اصطلاحات ہیں جو تصوف میں رائج ہیں۔

جانم کی نثری تصنیف 'کلمۃ الحقائق' میں شریعت و طریقت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ہندوی اور فارسی طرز احساس میں جو کشمکش چل رہی تھی وہ بہت نمایاں ہے۔ ان کی نثر کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''توں بندہ خدا تھے تو فعل تیرے وہ بھی خدا تھے جسے تیری طاقت میں آوتا وکار کمال قدرت غالب آتی خداست و نہ بنی کہ در کار دنیا نفسانی جہد کوشش تدبیر قوی دیکھلا تا و در کا خدائی یعنی کاہلی می کند انصاف نہ شوی درخور۔''[8]

شہباز حسینی قادری بیجاپوری (م 1606) ہدایت اللہ حسینی کے پوتے اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اولاد سے تھے۔[9] ان کا کلام بہت کمیاب ہے جس کی وجہ سے ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل امر ہے۔ البتہ دستیاب کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا موضوع بھی تصوف ہے اور کلام میں عربی اور فارسی الفاظ کا تناسب بھی بڑھ گیا ہے۔

اس دور کے صوفی شعرا میں شیخ برہان الدین جانم کے دو مرید شیخ داول اور شیخ محمود خوش دہاں کے علاوہ ان کے پوتے شاہ امین الدین عالی بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان صوفیا کے کلام کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے صوفی طرز تحریر میں زبان کے ارتقائی مراحل کا علم ہوتا ہے۔ شمس العشاق میراں جی کا اسلوب گجری و ہندوی روایت سے عبارت ہے۔ برہان الدین جانم بھی بنیادی طور پر اسی روایت کے پیرو ہیں لیکن ان کے کلام میں فارسیت کی چمک اجاگر ہے۔ جانم کا یہی اسلوب شیخ داول، شیخ محمود الحق خوش دہاں اور امین الدین عالی کے یہاں اور بھی صاف وشستہ ہوگیا ہے۔

شیخ غلام محمد داول (م 1657) نے اپنے متصوفانہ

خیالات کے اظہار کے لیے اردو زبان کو وسیلہ بنایا۔ ان کا پیشہ کتابت تھا۔ ان کی چار نظمیں چہار شہادت، کشف الانوار، کشف الوجود اور 'ناری نامہ' ہیں۔ شیخ داول نے 'خیال' میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان کے کئی 'خیال' دستیاب ہیں۔ شیخ داول نے عموماً برہان الدین جانم کے خیالات کی تشریح سے سروکار رکھا ہے۔ ان کا اظہار بیان کسی حد تک جدید اسلوب سے قریب ہے۔

شیخ محمود الحق خوش دہاں، شاہ ابوالحسن قادری کے بھانجے اور شاہ بدرالدین حبیب اللہ کے نواسے تھے۔[10] بیجاپور میں پیدا ہوئے اور بیدر میں نانا کے یہاں پرورش و پرداخت ہوئی۔ بیجاپور آ کے برہان الدین جانم کے مرید ہوگئے اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے امین الدین عالی کے اتالیق بھی ہوئے۔ ان کا ایک اردو رسالہ دستیاب ہے جس کے مرتب حمید الدین شاہد ہیں اور انھوں نے اس رسالے کو 'رسالہ محمود خوش دہاں بیجاپوری' کا نام دیا ہے۔ ان کی اردو نثر خاصی نکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے چند جملے بطور نمونہ درج کر دیے جائیں تو مضائقہ نہ ہوگا:

''اول ذکر جلی اللہ کا ناؤں ظاہر کے اعضا سوں، ذکر قلبی باطن کی زبان سوں ہمیشہ، بعد ازاں ذکر روحی مشاہدہ اس طریق سوں۔ اول مرشد کی صورت دل میں مقابلہ پکڑنا، اس صورت کوں دیکھنا۔ سو روح کا نظر ہے۔ اس دل میں یوں بولنا کہ صورت کوں دیکھتا سو کون۔ کیا نظر پاک ہے۔ عجب لطیف بعد ازاں اس صورت پر تے نظر ثابت کرنا۔ علاحدہ نظر معلق رکھنا۔''[11]

شاہ امین الدین عالی (1582-1675)، برہان الدین جانم کے بیٹے [۱۲] اور شیخ خوش دہاں کے شاگرد تھے۔ شاہ امین الدین عالی کی کئی تصانیف ہیں جن میں 'محب نامہ'، 'رموز السالکین'، 'کلام اعلیٰ' نظم میں اور 'گفتار حضرت امین'، 'وجودیہ' اور 'کلمۃ الاسرار' نثری تصانیف ہیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں شاہ امین الدین عالی کا کلام ان تغیرات کا مظہر ہے۔ ان کی زبان ہمارے لیے قدرے مانوس ہے۔ یہی انداز اور اسلوب ان کے گیتوں اور دوہروں میں بھی ہے۔

امین الدین عالی کی تصنیف 'وجودیہ' میں نثر کی ترتیب، تنظیم، ربط، جملوں کی ساخت اور بیان کا تسلسل خوش دہاں کی نثر سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی نثر میں فاعل، مفعول اور فعل کی نشست ماضی کی نثر کے بالمقابل زیادہ باقاعدہ ہے۔ مثال کے طور پر 'وجودیہ' کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''علوی کے مرتبے چار ہیں۔ سفلی کے مرتبے چار ہیں۔ اول مرتبہ علوی۔ مرتبۂ چہارم سفلی۔ مرتبۂ اول مقام شہود۔ مرتبۂ دوم مقام محبت۔ مرتبۂ سیوم مقام حال۔ مرتبۂ چہارم سفلی۔ مرتبۂ اول تنگی لذت۔ دویم شہوت۔ سیوم خطرات نیک بعلق دل۔ چہارم ممتنع دیگر عروج ونزول آدمیاں کا۔''[13]

'گفتار شاہ امین الدین اعلیٰ' اور 'کلمۃ الاسرار' بھی ان کی نثری تصانیف ہیں۔ 'کلمۃ الاسرار' بہ طریق سوال و جواب لکھی گئی ہے۔

قطب شاہی دور میں اردو ادب شروع سے ہی غیر مذہبی میلان کا حامل رہا ہے۔ اس کے باوجود دو صوفی بزرگ ایسے ہیں جن کی نثری تصانیف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذکر کے بغیر دکن میں اردو ادب اور صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ نامکمل کہلائے گا۔ اس عہد میں میراں جی حسین خدا نما کی نثری تصانیف 'چہار وجود'، 'شرح تمہیدات ہمدانی' اور 'قربیہ' کے علاوہ میراں یعقوب کی تصنیف 'شمائل الاتقیا' بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

میراں جی حسین خدا نما (1595-1663) عبداللہ قطب شاہ کی سرکار میں پیشے سے سواروں کے جمعدار تھے۔ وہ بیجاپور کے دربار میں قطب شاہی سلطنت کے سفیر بھی رہے۔ انھوں نے اپنی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تین کتابیں تالیف کیں۔ وہ اپنی تصنیف 'چہار وجود' میں سوال و جواب کی صورت میں متصوفانہ مضامین کی تشریح پیش کرتے ہیں۔ 'تمہیدات ہمدانی' عربی کی مشہور تصنیف ہے جسے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی (م 1138) نے تحریر کیا تھا۔[14] خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م 1421) نے فارسی میں اس کتاب کی شرح لکھی۔ میراں جی حسین خدا نما نے گیسو دراز کی اسی فارسی شرح کو 'شرح تمہیدات ہمدانی' کے نام سے بہ زبان دکنی تحریر کیا۔ اس دور میں میراں جی حسین خدا نما کے شاگرد میراں یعقوب کی تصنیف 'شمائل الاتقیا' کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ میراں یعقوب کی نثر میں سادگی اور پُرکاری دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر تبلیغی مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ادبیت کے تقاضوں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ نمونے کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''جھوٹ کیوں ہے۔ جوں چودویں رات کا چاند۔ جوں جوں دن جاتے تیوں تیوں کم ہوتا۔ ہور سچ جوں پہلا چاند ہے۔ روز روز روشن ہوتا ہے۔''[15]

اوپر پیش کیے گئے اقتباس میں تبلیغ کا دلنشین انداز اور نثر کا ادبی حسن اپنی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ صاحب کتاب نے متصوفانہ اور شرعی اصطلاحات کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مثال کے طور پر وحدت کا ترجمہ 'ایک پنا'، دوئی کا 'دو پنا'، کثرت کے لیے 'بہوت پنا'، آدمیت کے لیے 'آدمی پنا'، خودی کے لیے 'میں پنا' وغیرہ۔ اس مضمون میں میرے پیش نظر حضرات صوفیا کی تالیفات اور اردو کی تشکیل میں ان کے کردار کا جائزہ لینا ہے اس لیے میں نے ان مذہبی تصنیفات سے صرف نظر کیا ہے جن مصنفین کا تعلق جماعت صوفیا سے نہیں ہے۔ ورنہ قطب شاہی سلطنت میں دیگر مذہبی تصانیف بھی لکھی گئیں جن کے مصنفین کا شمار صوفیا میں نہیں ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اردو زبان کی ابتدائی تشکیل او رترسیل میں صوفیائے دکن کی تحریری وتقریری سرگرمیاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ دکن کے صوفیا نے اردو زبان کی ترویج واشاعت میں جو گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ بہتر سماج کی تشکیل میں صوفیا کے روحانی کردار کے ساتھ ان کی لسانی خدمات کو بھی منظر عام پر لانا چاہیے۔ بلاشبہ ان کے ارشادات وملفوظات کا لسانی مطالعہ اس پُر آشوب دور میں لسانی کدورتوں کو مٹانے میں معاون ثابت ہوگا۔

حواشی:

1. مقالات حافظ محمود شیرانی (جلد اول)، شیرانی، مظہر محمود، مجلس ترقی ادب: لاہور، طبع دوم، 1966، ص: 62 تا 73
2. تاریخ ادب اردو (جلد اول)، جالبی، جمیل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: دہلی طبع پنجم، 1993، ص 23
3. دیباچۂ غرۃ الکمال، امیر خسرو، مترجم: لطیف اللہ، گلشن اقبال، کراچی، سنہ ندارد، ص 133
4. تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ص 106
5. ایضاً، ص ملخص 107 تا 129
6. اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، عبدالحق، مولوی، انجمن ترقی اردو ہند: اردو گھر، نئی دہلی، 1988، ص 34
7. ایضاً، ص 45
8. تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ص 211
9. ایضاً، ص 227
10. ایضاً، ص 305
11. ایضاً، ص 307
12. اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص 50
13. تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ص 315
14. ایضاً، ص 498
15. ایضاً، ص 502

■

Dr. Ahmad Khan
Lecturer History, MANUU,Gachibowli
Hyderabad-500032 (Telangana)
Mob.:9811715196,8851013094
Email.: ahmadkhanlaisi@gmail.com

عبدالودود انصاری سے ایک ملاقات

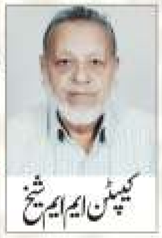

کیپٹن ایم ایم شیخ

اردو دنیا میں جب 'بچوں کا ادب' پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے تو تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن تشنگی کی کیفیت مایوسی میں اس وقت تبدیل ہوجاتی ہے جب 'بچوں کا سائنسی ادب' پر نگاہ ڈالی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بچوں کے سائنسی ادب پر لکھنے والوں کی تعداد بڑی آسانی سے انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔اس کے باوجود بچوں کے سائنسی ادب پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو ایک نمایاں نام دیکھنے کو ضرورملتا ہے جن کا اشھب قلم تین دہائیوں سے برق رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے وہ ہیں مغربی بنگال کے جناب عبدالودود انصاری جنھوں نے اپنے مضامین میں نئے نئے اُسلوب کلاکامیاب تجربہ کیا ہے۔آپ ہندوستان کے ایسے ادیب ہیں جنھوں نے سائنسی مضامین کو مکتوب نگاری کی شکل دے کر سیکڑوں مضامین لکھے ہیں۔یقینا مورخ جب بھی اردو میں مکتوب نگاری کی تاریخ مرتب کرے گا تو ان کے سائنسی خطوط کوبڑے احترام سے جگہ دے گا۔موصوف کے مکالمہ نگاری پر مشتمل مضامین بھی اس قدر دلچسپ ہوتے ہیں کہ بچہ ہو یا بڑا شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ان کی اردو میں یک موضوعی سائنسی کوئز کی کتابیں بھی بعد کے مصنّفین کے لیے مشعل راہ بنیں۔ انھوں نے پاپولر سائنس کے علاوہ سائنس کی نصابی کتابیں بھی تصنیف کیں جس نے بچوں کی کثیر تعداد کو استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔آئیے ان سے بات چیت کا سلسلہ شروع کر تے ہیں۔

ایم ایم شیخ: سب سے پہلے اپنا خاندانی پس منظر بتایئے!

عبدالودود: میرے آباواجداد کا تعلق بہار سے ہے۔ میرے دادا غربت کی وجہ سے معاش کی تلاش میں بنگال کی سرزمین آسنسول آئے اور ریلوے میں ملازمت پا کر مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کرلی۔ آسنسول میں ہی میرے والد محترم مرحوم جناب عبدالحکیم کی پیدائش ہوئی۔ والد محترم ریلوے میں بطور ڈرائیور ملازم تھے۔ نظم ونسق کے بڑے پابند تھے۔خود نان میٹرک تھے لیکن تعلیم کے کٹر حامی تھے۔اسلام پر عمل کرنا اور ہم سبھی بھائی بہنوں کو عمل پیرا ہو نے کے لیے بڑی سختی سے کام لیتے تھے۔ ریلوے میں ملازمت کے دوران ایک حادثہ ہوا جس میں اپنا داہنا پیر کھو بیٹھے۔ ان کا انتقال 2009 کے رمضان المبارک کی پہلی شب قدر قرآن پاک کی تلاوت کے فوراً بعد ہوا۔

م م ش: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

عبدالودود: میری پیدائش 9 ستمبر 1957 (بہ اعتبار سند) شہر آسنسول میں ہوئی۔

م م ش: اپنی تعلیم کے سلسلے میں کچھ بتایئے کہ کس ماحول میں تعلیم پائی؟

عبدالودود: میں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو میڈیم سے حاصل کی۔ بردوان یونیورسٹی سے ریاضی میں آنرز اور ماسٹر ڈگری کی سند حاصل کرنے کے بعد کلیانی یونیورسٹی سے بی ایڈ، ہماچل پردیس یونیورسٹی سے ایم ایڈ اور الہ آباد یونیورسٹی سے وگیان رتن اول کلاس سے پاس کیا۔ بانی پور کالج سے فزیکل ایجوکیشن کا مختصر مدتی کورس بھی مکمل کیا۔ میں جس محلے میں رہتا تھا وہاں کے حالات اچھے نہ تھے۔ پورا علاقہ جرائم پیشوں کا اڈہ تھا۔ آئے دن بم وگولی کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا مگر اللہ اور میرے والد کی نگرانی نے مجھے اس ماحول میں بچائے رکھا۔ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ گھر مٹی اور کھپڑے کا تھا۔ بجلی بھی نہیں تھی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے ایم ایس سی پارٹ ون تک لالٹین کی روشنی میں پڑھائی لکھائی کی۔ اس وقت میٹرک پاس کرنا بہت بڑی بات تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے محلے میں کسی نے میٹرک پاس کیا تو اس کے والدین خوشی میں ایک تقریب منعقد کرکے سارا دن گراموفون بجایا اور دو تین سو آدمیوں کی ضیافت بھی کی۔ میں اپنے خاندان کا سب سے پہلا آنرز گریجویٹ بنا۔

م م ش: آپ نے پہلی ملازمت کب اور کہاں پائی؟

عبدالودود: میں ایم ایس سی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس دوران ایک بیماری میں مبتلا ہوگیا جس سے میری تعلیم رک گئی۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ پھر اللہ کے فضل سے روحانی اور جسمانی سکون ملا۔ اسی درمیان حمایت الغربا ہائیر سکنڈری اسکول میں ریاضی کے استاد کے لیے اشتہار دیکھا۔ میں نے درخواست دیدی۔ اللہ کے فضل سے میں انٹرویو میں کامیاب ہوگیا۔ ادھر تعلیم ادھوری اُدھر ملازمت لیکن ابا کے حادثے کے بعد گھر کی ذمے داری کی وجہ سے ملازمت جوائن کرلیا۔ اس کے بعد ملازمت کے دوران اپنی ایم ایس سی کی تعلیم بھی مکمل کرڈالی۔ اس اسکول میں کم وبیش نو سال ریاضی پڑھاتا رہا۔

م م ش: آپ برسوں مغربی بنگال میں بنیادی استادوں کے واحد تربیت کے کالج میں بحیثیت پرنسل فائز رہے ہیں۔ ذرا اپنے تجربات پر روشنی ڈالیے!

عبدالودود: میں اس ادارے میں کم وبیش اٹھائیس سال بطور پرنسپل خدمات انجام دے کر ستمبر 2017 میں سبکدوش ہوا۔ اس دوران ریاست کے کم وبیش ہزاروں معلموں کی تربیت کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ کے فضل وکرم سے میرے شاگرد مغربی بنگال کے ہر ضلعے میں کارپیغمبری انجام دے رہے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ اردو میڈیم کے بچوں کا مستقبل روشن کرنے میں پرائمری کے استاد کا اہم رول ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ قوم کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے میں سب سے اہم خدمات پرائمری اساتذہ کی ہیں۔

م م ش: سنا ہے کہ آپ نے کالج دوبارہ جوائن کرلیا ہے!

عبدالودود: جی ہاں! اللہ کا شکر ہے کہ حکومت نے میرے تجربے اور تعلیمی صلاحیت کے مدنظر مزید پانچ سال کے لیے دوبارہ تدریسی خدمت کے لیے اسی کالج میں میری تقرری کر دی ہے اور میں جون 2018 کو پھر یہاں درس وتدریس سے منسلک ہوگیا۔

م م ش: کالج میں دوبارہ درس و تدریس سے منسلک ہوکر کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

عبدالودود: دراصل سبکدوشی کے بعد میں چند مہینے تصنیف وتالیف میں بے حد مصروف رہا۔ قلق صرف اس بات کا تھا کہ میں معلموں کی تدریس سے محروم ہوگیا جو ایک بڑی سعادت کی بات تھی کیونکہ ایک معلم کی تدریس کئی نسل کی تدریس ہے۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا کہ حکومت نے مجھے دوبارہ موقع عنایت کر دیا۔ میں اللہ کا شکرگزار ہوں اور اللہ کے سامنے سربسجود ہوں کہ اللہ موت کے آخری لمحے تک خلوص اور اخلاص کے ساتھ درس وتدریس کی توفیق عطا کردے۔

م م ش: اب یہ بتایئے کہ تصنیف وتالیف کی دنیا میں کب اور کیسے قدم رکھا؟

عبدالودود: میں جب آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا تو اسی وقت سے لکھنے کا شوق ابھرا۔ اس وقت ایک چھوٹا سا مضمون ماہنامہ مسرت، پٹنہ میں لکھ کر بھیجا۔ وہ مضمون شائع ہوگیا۔ پھر درمیان میں لمبا خلا رہا۔ جب میں اسکول میں معلم بنا تو باضابطہ طور پر سائنس کی نصابی کتابیں لکھنا شروع کیا۔ اس طرح سال بہ سال فزیکل سائنس درجہ دوئم تا دہم لکھنے میں کامیاب ہوا۔ ان میں مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے شائع شدہ فزیکل سائنس برائے نہم ودہم بھی ہیں جن کے کئی اڈیشن شائع ہوئے اور کثیر طالب علموں نے بھرپور استفادہ کیا۔

م م ش: اب یہ بتایئے کہ آپ نے پاپولر سائنس لکھنے میں قدم کب اور کیسے رکھا؟

عبدالودود: یہ 1995 کی بات ہے کہ مقامی اخبار میں ماہنامہ اردو سائنس، نئی دہلی کا اشتہار دیکھا۔ میں نے مدیر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کو شمارے کے لیے لکھا۔ موصوف لگاتار دو تین ماہ رسالہ تحفتاً بھیجتے رہے۔ میں نے ایک مضمون بعنوان 'فیثا غورث۔ ایک مطالعہ' بھیجا۔ انھوں نے اس مضمون کو میرے تعارف کے ساتھ مارچ 1995 کے شمارے میں شائع کیا اور جواباً لکھا کہ مضمون اچھا ہے لیکن تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ لکھتے جایئے۔ یہی وہ جملہ ہے جو مجھے تواتر کے ساتھ لکھنے پر آمادہ کرتا گیا اور اس کے بعد پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اسی لیے میں بلا خوف کہتا ہوں کہ میرے لکھنے لکھانے کا اصل محرک ڈاکٹر محمد اسلم پرویز ہی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے اب تک چار سو سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

م م ش: آپ کا شمار 'سائنس برائے ادب اطفال' لکھنے والوں کی فہرست میں ہوتا ہے۔ آپ بتایئے کہ اس جانب کس طرح متوجہ ہوئے؟

عبدالودود: میں نے بڑوں کے لیے بھی لکھا اور بچوں کے لیے بھی۔ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے لیے زیادہ لکھا۔ سچ پوچھیے تو بچوں کے لیے لکھنے میں بڑا سکون حاصل ہوتا ہے یا یہ کہیے کہ اللہ نے میرے قلم کو اطفال کی جانب رواں دواں کر دیا ہے۔

م م ش: آپ کا شمار اولین ادیب میں ہوتا ہے جس نے مکتوب نگاری پر مشتمل سائنسی مضامین لکھے ہیں؟

عبدالودود: یہ اللہ کا فضل ہے کہ تقریباً سو سے بھی زیادہ مضامین کو مکتوب کی شکل دے چکا ہوں۔ ان میں سے 27 مضامین کو قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نے ایک کتاب 'آؤ سائنسی خط لکھیں' شائع کر چکی اور دوسری 'آؤ سائنسی خط پڑھیں' شائع کر چکی ہیں۔ دونوں کتابوں میں کل پچاس مکتوبات شامل ہیں۔ تیسری کتاب 'سائنسی چٹھی آئی ہے' شائع ہونے والی ہے جس کے اندر پینتیس سائنسی مکتوبات ہیں۔ آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ مکتوب نگاری والی میری کتابوں میں پاکستان کے اخباروں میں بھی تبصرے شائع ہوئے اور کتابیں بھی پسند کی گئیں۔

م م ش: آپ کی شائع شدہ کتابوں کی تعداد کتنی ہے اور بچوں کے لیے سائنسی مجموعہ کون کون سا ہے؟

عبدالودود: اب تک میری شائع شدہ کتابوں کی تعداد 30 ہیں۔ 'سائنس پڑھو اور آگے بڑھو'، 'ترقی کے زینے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی' اور 'مسلمان سائنسدانوں کی خدمات' سائنسی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور تینوں کتابیں مختلف اردو اکادمیوں سے انعامات حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ میرے چالیس مضامین پر مشتمل ایک کتاب 'اوراق سائنس' کو قومی اردو کونسل نے شائع کیا ہے۔

م م ش: آپ نے یک موضوعی کوئز کی کتابیں بھی لکھی ہیں؟

عبدالودود: میری یک موضوعی کوئز کی کتابوں کے نام اس طرح ہیں: جانور کوئز، پرندہ کوئز، سانپ کوئز، کیڑا کوئز اور فلک کوئز۔ یہ بھی ہندوستان کی اردو میں اولین سائنسی کوئز کی کتابیں ہیں۔

م م ش: آپ نے مغربی بنگال کے سلسلے سے کچھ تحقیقی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں؟

عبدالودود: میں نے 'مغربی بنگال کی اردو سائنسی خدمات' اور 'مغربی بنگال میں اردو سائنسی شاعری' دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پہلی کتاب مغربی بنگال اردو اکادمی شائع کر چکی ہے اور دوسری شائع کرنے والی ہے۔ ان دونوں موضوعات پر بھی کسی ریاست سے اب تک کتابیں منصۂ شہود پر نہیں آئی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے بعد میرے سائنسی دوست اپنی اپنی ریاست کے سلسلے سے قلم اٹھا چکے ہیں۔

م م ش: آپ کا ایک اشتہار اخباروں میں 'ہندوستان میں اردو خاتون کی سائنسی خدمات' پر دیکھا تھا۔ اس موضوع پر کہاں تک کام ہوا ہے؟

> **یہ اللہ کا فضل ہے کہ تقریباً سو سے بھی زیادہ مضامین کو مکتوب کی شکل دے چکا ہوں۔ ان میں سے 27 مضامین کو قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نے ایک کتاب 'آؤ سائنسی خط لکھیں' شائع کر چکی اور دوسری 'آؤسائنسی خط پڑھیں' شائع کر چکی ہیں۔ دونوں کتابوں میں کل پچاس مکتوبات شامل ہیں۔**

عبدالودود: اس موضوع پر کام جاری ہے۔ لیکن بتاتا چلوں اس سلسلے سے مخلصوں کا تعاون بڑا ہی سست ہے۔ اب دیکھیے آگے آگے ہوتا ہے کیا!

م م ش: اب ذرا 'بچوں کا سائنسی ادب' پر روشنی ڈالیے۔ اکثریت کی رائے ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

عبدالودود: دیکھیے میرے نزدیک 'بچوں کا ادب لکھنا مشکل ترین ہے' ایک مفروضہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ صرف بچوں کے ادب کی ہی بات کیوں کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہر ادب لکھنا دشوار ہے۔ دراصل صلاحیت پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ محنت اور ریاضت

سے پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے لیے اول شرط یہ ہے کہ آپ جس ادب پر لکھنا چاہتے ہیں اس ادب پر لکھے گئے مضامین کا گہرائی اور تسلسل کے ساتھ مطالعہ کریں۔ دوسری زباندانی اور اس کی درستگی پر مشق کرنی ہوگی۔ سائنسی مصنفین کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ان کا تعلق اردو کے ساتھ میٹرک تک ہی رہتا ہے۔ لہٰذا ہم سائنس والوں کو اس طرف زیادہ دھیان دینا ہوگا۔ بچوں کے ادب کے ساتھ خاص معاملہ یہ ہے کہ بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے اندر سائنسی دلچسپی رکھنی ہوگی۔

م م ش : بچوں کا اردو ادب اور سائنسی ادب میں کیا فرق ہے؟ دونوں کے سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

عبدالودود: اردو ادب میں بچوں کی زباندانی اور مثبت سوچ کے علاوہ ان کے اخلاق، اطوار اور کردار کی درستگی پر نظر کی جاتی ہے جب کہ سائنسی ادب میں بچوں کے اندر سائنسی معلومات اور ان کی اہمیت کے علاوہ سائنس کے سلسلے سے تجسس، تحقیق اور دلچسپی ابھارنا مقصود ہوتا ہے۔ دیکھیے اب دیومالائی، مافوق الفطرت، محیر العقول، تمثیلی اور طلسماتی داستانوں اور پریوں کی کہانی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ بچوں کی نفسیات میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں آج کے بچوں کو ریت پر گھر بنانا اور گڈے وگڑیا سے کھیلنا بالکل پسند نہیں ہے۔ آج وہ آئی پاڈ، موبائل اور ٹی وی سے دل بہلا رہے ہیں۔ آج کا بچہ چاند کو چندا ماما کہنے کا قائل نہیں اور نہ ہی اس بات کا یقین کرے گا کہ چاند پر کوئی بڑھیا سوت کات رہی ہے۔ لہٰذا آج کے بچوں کے ادیبوں کو اسی تناظر میں ادب تخلیق کرنی ہوگی۔ سائنس کے ادیبوں پر دوہری ذمے داری ہے۔ وہ اس وجہ سے کہ سائنس کے سر الزام جاتا ہے کہ یہ ادب کے لحاظ سے خشک مضمون ہے لہٰذا انھیں سائنسی ادب کی تخلیق ایسی کرنی ہوگی کہ ان میں شروع سے آخر تک بچوں کی دلچسپی برقرار رہے۔ مثال کے طور پر 'پھولوں کی زیرگی' پر معلومات فراہم کرانے سے پہلے باغ کا حسین منظر، پھولوں کی شگفتگی، کلیوں کی معصومیت، تتلیوں کی رنگینی اور پرندوں کی دلفریبیاں پیش کرنے کے بعد نفس مضمون کی جانب آنا ہوگا۔

م م ش: اچھا یہ بتایئے فی زمانہ کس ادب کی زیادہ اہمیت ہے؟ اس مسئلے کا حل کیا ہو؟

عبدالودود: فی زمانہ ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ مسئلے کا حل بنیادی اور ثانوی اسکولوں کے استادوں کے پاس ہے۔

م م ش: آپ ایک لمبے عرصے تک معلموں کی تدریس سے منسلک رہے اور تعلیم کے موضوعات پر مضامین بھی لکھا ہے۔ ذرا اس پر روشنی ڈالیے!

عبدالودود: میں نے تعلیم کے سلسلے سے اپنی معلومات اور تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے دو کتابیں تصنیف کی ہیں ایک 'استاد-ایک عظیم شخصیت' اور دوسری 'کیسے کیسے شاگرد تھے'۔ استاد والی کتاب کے تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں جو استاد کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتابچہ 'مائکرو ٹیچنگ'۔ ایک 'مختصر تعارف' بھی لکھا ہے جو زیر تربیت معلموں کے لیے معلوماتی کتاب ہے۔

م م ش : ہندوستان میں بچوں کے سائنسی ادب کی پیش رفت اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

عبدالودود: ہندوستان میں بچوں کے سائنسی ادب کی پیش رفت تو بڑی مایوس کن ہے کیونکہ نئے لکھنے والے سامنے نہیں آرہے ہیں۔ جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں کہ کوئی بھی ادیب پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ محنت، کوشش اور ریاضت سے لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہوا تو مسئلہ جہاں پر ہے وہیں پر برقرار رہے گا۔ آپ یہ بھی جان لیں اس سلسلے میں اردو والوں کی بے حسی کا بھی دخل ہے کہ اچھی سے اچھی کتابوں کی نکاسی نہیں ہوتی ہے جس سے مصنف بڑا مایوس ہو جاتا ہے۔ بہت ہوا تو سو دو سو کاپیاں قومی کونسل خریدتی ہے۔ اس طرف اکادمیوں کا بھی خاطر خواہ دھیان نہیں جاتا ہے اور نہ ہی کوئی ادارہ سوچتا ہے۔ میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ پڑھے لکھے اردو داں کے گھروں میں بھی بچوں کے رسائل اور پاپولر سائنس کی کتابیں پڑھی نہیں جاتی ہیں۔ لہٰذا یہی حال رہا تو یہی صورت حال مستقبل میں بھی رہی گی۔

م م ش: آپ بچوں کا سائنسی ادب لکھنے والوں میں کن کن سے متاثر ہیں؟

عبدالودود: میں سب سے زیادہ ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی سے نہ صرف متاثر ہوں بلکہ ان کی کتابیں پڑھ کر اپنی معلومات بڑھائی ہے۔ لکھنے کا انداز، زبان کی لطافت اور شیرینی سیکھنا ہو تو کوئی ان سے سیکھے۔ دوسرے محمد خلیل، سابق مدیر سائنس کی دنیا، نئی دہلی جو مجھے پیار سے 'دشمن' کہتے ہیں۔ ان کی خدمات بھی سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جاوید سعید کامٹوی، شاہد رشید، ڈاکٹر محمد رفیع الدین ناصر، انیس الحسن اور عبدالقیوم جنید شیخ وغیرہ کا بھی شمار اچھے ادیبوں میں ہوتا ہے۔

م م شیخ: آپ کے مضامین کن کن رسالوں اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے نام کیا کیا ہیں؟

عبدالودود: رسالے :تہذیب الاخلاق، اردو دنیا، اردو سائنس اردو ٹائمز، زبان و ادب، مسرت، نرالی دنیا، پیام تعلیم، امنگ، جل پری، اطفال ادب، گلشن اطفال، بزم اطفال، اچھا ساتھی، شعاع اردو، ستارے، فکر صحت، غبارہ، روح ادب، روبوٹ، بزم اطفال، نیا کھلونا، فردوس، قرطاس، قرطاس وقلم، حج میگزین، اوراق تعلیم، اطلاع عام اور میڈیا اسٹار نیوز فیچر وغیرہ

اخبارات: انقلاب، اورنگ آباد ٹائمز، اردو ٹائمز، سیاست، منصف، اعتماد، نقیب، دعوت، آبشار، راشٹریہ سہارا، اخبار مشرق اور آزاد ہند وغیرہ

م م شیخ : آپ کن کن رسالوں کی مجلس ادارت میں شامل رہے ہیں؟

عبدالودود: ماہنامہ اردو سائنس (نئی دہلی)، سائنس ریز (پٹنہ) اور ماہنامہ پھول ستارے (تیلنی پاڑہ: مغربی بنگال)

م م ش : آپ پر گوشہ کن کن رسالوں نے نکالے ہیں؟

عبدالودود: میرے اوپر گوشہ ماہنامہ گلشن اطفال، مالیگاؤں نے نکالا ہے۔

م م شیخ: آپ کے انعامات اور اعزازات کی فہرست کیا ہے؟

عبدالودود: مغربی بنگال کی جانب سے دوبار جب کہ یوپی اور بہار اردو اکادمی سے ایک ایک بار انعام مل چکا ہے۔ دیگر انعامات و اعزازات کی فہرست اس طرح ہے؟

انعامات و اعزازات:

شیروانی ایوارڈ برائے معلم 1987، نذیر احمد ایوارڈ 2013، علم دوست ایوارڈ، اخبار مشرق 2015، فیضان اشرف ایوارڈ برائے اردو 2015، ادبی منچ ایوارڈ 2015، اسمٰعیل میرٹھی ایوارڈ 2016، فروغ سائنس ایوارڈ 2017، سرسید احمد خان ایوارڈ 2017، مولانا آزاد ایجوکیشن ایوارڈ 2017، ڈاکٹر ایم او غنی لائف اچیومنٹ ایوارڈ 2017، اے پی جے عبدالکلام ایوارڈ 2018، توصیفی سند منجانب قومی اردو سائنس کانگریس برائے اردو زبان میں سائنس کے فروغ 2017، نشان سرسید ایوارڈ منجانب انجمن فروغ سائنس، علی گڑھ 2019

م م ش: نئی نسل کے سائنسی ادیبوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

عبدالودود: کل نہ پوچھا تو آج پوچھے گا
وقت اپنا حساب پوچھے گا
نونہالوں کو کیا دیا تو نے
بولتا یہ سماج پوچھے گا

م م ش : شکریہ۔صد شکریہ!!

عبدالودود: آپ کا بھی۔

■

Dr.M.M.Shaik
15, Moulana Azad Housing Society
Opposite Aulia Masjid
Roza Bagh , Aurangabad - 431001 (M.S)
Mob:9823784760

اُردو جوڑنے کا کام کرتی ہے توڑنے کا نہیں

عمران عاکف خان

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب : زبانیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ یہ ہماری تنگ نظری ہے کہ زبانیں دم توڑ رہی ہیں یا ان کا وجود آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ زبانوں کی موت ایک دن میں یا اچانک واقع نہیں ہوتی۔ ان کی پرورش، پرداخت اور آبیاری جب تک ہوتی رہے گی یہ زندہ رہیں گی اور اگر ان کی پرورش، ترویج واشاعت بند کردی جائے گی تو ان کا خاتمہ لازمی ہے۔ اگر یہی بات اُردو زبان پر لاگو کی جائے تو میرا ماننا ہے کہ اُردو زبان کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ایک عرصے سے سنتے آ رہے ہیں کہ اُردو زبان کا جنازہ نکل رہا ہے۔ جب کہ اُردو زبان کی جڑیں ہندستان بالخصوص برصغیر کے عوام کے قلوب وذہن میں اس قدر پیوست ہوچکی ہیں کہ انھیں اُکھاڑنا آسان کام نہیں۔ جب تک ایک بھی انسان اس دنیا میں موجود رہے گا تب تک زبانوں کا وجود بھی برقرار رہے گا۔

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے حکومتوں اور نامور اداروں کو آگے آنا ضروری ہے۔ لیکن جب تک عوامی سطح پر کام نہیں کیا جائے گا تب تک یہ ادارے بھی کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ یعنی زمینی سطح پر کام کرنا ناگزیر ہے نیز زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے اس کے رسم الخط کا تحفظ لازمی ہے۔ اگر صرف بول چال میں ہی زبان کا استعمال کیا جائے گا تو یہ اس کے لیے مضر ثابت ہوگا۔ جب تک رسم الخط کا استعمال نہیں ہوگا تب تک زبان کا فروغ ممکن نہیں۔ اس کے لیے موجودہ زمانے میں تکنیک کا سہارا لے کر نئی نسل اور بچوں کو رسم الخط سے روشناس کرایا جاسکتا ہے۔ آج سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے زمانے میں فیس بک، انسٹاگرام، وہاٹس ایپ، یوٹیوب، اسنیپ ٹیوب، ٹویٹر، اسکائپ، وغیرہ پر نئی نسل کے ساتھ قدیم نسل کے افراد بھی اپنی اپنی زبانوں میں اپنے خیالات کی مسلسل تشہیر کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبانوں کے فروغ میں تکنیک بھی معاون و مددگار ہوتی ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ رسائل اور جرائد بھی زبانوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

سوال: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: بالکل زبانوں کی موت سے انسانوں کے تشخص کا مسئلہ منسلک ہے۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ زبانوں کی موت سے وراثت بھی زمین دوز ہوجاتی ہے۔ زبانیں رابطے کا سب سے موثر وسیلہ ہیں۔ اپنی وراثت کے تحفظ کے لیے ہمیں عوام سے مخاطب ہونا پڑتا ہے۔ ہم اپنی وراثت کا تحفظ تبھی کر پائیں گے جب ہم اپنی زبان کو رابطے کی زبان بنائیں گے اور اپنے ہر ممکن امور اسی زبان میں انجام دیں گے۔

سوال: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: بالکل واقع ہوتے ہیں۔ اگر زمانے کے ساتھ زبان کا تال میل نہیں بٹھایا گیا تو وہ زبان ترقی کی راہ میں پچھڑ جائے گی۔ اب آپ دیکھیے کہ اسکول کی سطح پر طلبا کی زبان میں کس قدر انگریزی، ہندی، اردو اور عوامی سطح پر بولے جانے والے لفظوں کی آمیزش رہتی ہے لیکن جب یہ طلبہ اپنی درسی کتابوں کو پڑھتے ہیں تو انھیں اصطلاحی زبان میں وہ باتیں پڑھنی ہوتی ہیں جن سے اُن کا واسطہ دور دور تک نہیں ہوتا ہے۔ اگر کسی زبان میں سائنسی اور سماجی علوم کے مواد کو پیش کرنے کا مادہ نہیں ہے تو میری نظر میں وہ زبان، زبان نہیں محض بولی ہے۔ اب آپ کسی بھی علاقائی اخبار کو اٹھا لیجیے خواہ وہ کسی بھی زبان میں شائع ہوتا ہو اس میں ایسے الفاظ آپ کو مل جائیں گے جو ہماری مشترکہ تہذیب اور ثقافت کے امین ہیں۔ یہاں چند الفاظ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ جیسے پانی، ماں، کھانا، موسم، بیماری، دوا وغیرہ۔ ان الفاظ کو آپ سائنس یا سماجی علوم کے مواد میں شامل کیجیے کیا ان کی ہیئت اور اصطلاح میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ نہیں، بالکل نہیں بلکہ یہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر زبان میں تھوڑی سی رد و بدل کے ساتھ موجود ہیں۔ میرا اس ضمن میں ماننا ہے کہ سائنسی اور سماجی علوم کے مواد کے لیے عام فہم اور عوام کو سمجھ میں آنے والی اصطلاحات کا استعمال کیا جائے۔ ہمیں ایسی اصطلاحات سے پرہیز کرنا چاہیے جن کے مطالعے سے قباحت پیدا ہوتی ہو۔

سوال: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اردو کا مستقبل روشن وتابناک ہے۔ اردو ایک زندہ زبان اور ہر ہندستانی کی زبان ہے۔ ہاں! زبانوں میں مذہب کے نام پر تفریق پیدا کرنے والوں سے ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ اردو عوام کو جوڑنے کا کام کرتی ہے توڑنے کا نہیں۔ موجودہ وقت میں آپ دیکھیے کہ اردو کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اردو کو ہمیں تکنیک سے جوڑنا ہوگا۔ ایسے سافٹ ویئر بازار میں موجود ہیں جن کا استعمال اردو خواندگی کے لیے کیا جارہا ہے۔

سوال: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

جواب: اس کے لیے بنیادی سطح پر کام کرنا ہوگا۔ ہمیں ایسے اساتذہ اور طلبا تیار کرنے ہوں گے جو صحیح اُردو بولیں صحیح اُردو پڑھیں اور صحیح اُردو لکھیں۔ بگاڑ کی ایک وجہ مطالعے کی کمی بھی ہوتی ہے۔ جب تک ہمیں ذہنی خوراک نہیں ملے گی ہم اپنا ارتقا نہیں کر پائیں گے۔ اس کے لیے کتابیں سب سے کارآمد ذریعہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اخبارات، رسائل، دستاویزات، افسانے، ناول، سفر نامے، شعری مجموعے، تنقیدی و تحقیقی مضامین وغیرہ زبان کو بنانے اور سنوارنے کے سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان مطالعہ اپنی ضرورت کے تحت کرتا ہے۔ کسی کو کوئی مضمون لکھنا ہے یا کوئی حوالہ تلاش کرنا ہے تبھی کتابوں کا رخ کیا جاتا ہے۔ جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ روزانہ کا ہمارا معمول یہ ہو کہ کوئی نہ کوئی کتاب ہمارے مطالعے میں رہنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگیا تو

زبان کی سطح پر بگاڑ کے بجائے مثبت نتائج ہمارے سامنے رونما ہونے لگیں گے۔

سوال: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: نہیں ایسا نہیں ہے۔ اردو ادارے، تنظیمیں زبان کے ساتھ ساتھ ادب کو فروغ دینے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔ آپ کسی بھی اُردو رسالے یا اخبار کو دیکھ لیجیے اس میں موضوعات میں تنوع ملے گا۔ رہی بات کتابوں کی اشاعت کی تو ہر سال ملک گیر سطح پر ہزاروں کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ ان میں قومی اردو کونسل، نئی دہلی، مختلف ریاستوں کی اُردو اکادمیاں، راج بھاشا اداروں اور میموریل کمیٹیز وغیرہ کے مالی تعاون سے قومی سطح پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ان کے علاوہ کئی ایسے ادارے ہیں جن کے مالی تعاون سے مقامی سطح کے ادیب اپنی کتابیں شائع کراتے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو کتب کی اشاعت کے نجی ادارے بھی کتابیں شائع کرتے ہیں اس طرح سے عام حالات میں ملک بھر سے 5 سے 10 ہزار کتابوں کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔

سوال: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: بالکل پہنچتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ کلاسیکی ادب پر گفتگو کیے بغیر جدیدیت پر گفتگو کرنا بے سود ہے۔ نیز یہ بھی کہ کلاسیکی ادب کے بطن سے ہی جدید ادب نکلا ہے۔ آپ ایمان داری سے غور وخوض کیجیے کہ اردو ادب کے معماروں نے جس ادب کی بنیاد رکھی اسے ہم نے اپنی سہولت کے اعتبار سے ہی کلاسیکی اور جدیدیت کے زمرے میں نہیں رکھا۔ کیا نظیر میر، سودا، مصحفی، غالب، ذوق وغیرہ نے بھی اپنے متقدمین کی پیروی نہیں کی تھی۔ اگر ہم بھی اپنے معاصرین اور متقدمین ادبا وشعرا کی تخلیقات پر گفتگو نہیں کریں گے تو ادب کا سلسلہ کیسے آگے بڑھے گا۔ چراغ سے چراغ جلا کر ادب کی شمع روشن کی جاتی ہے۔ کلاسیکی ادب ہمارا اہم ادبی سرمایہ اور تاریخی دستاویز ہے۔ اس کی وجہ سے ہم جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت پر آج بات کر رہے ہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

جواب: جیسا کہ راجستھان کے متعلق عام خیال ہے کہ آزادی کے بعد اور نواح دہلی کے کتنے ہی ارباب قلم وقرطاس، ادبا وشعرا، ماہرین لسانیات وادبیات نے سرزمین راجستھان کا رخ کیا۔ یہاں اُردو اَدب کی بادِ بہاری چلی۔ شاہ نصیر، میر، غالب، ذوق، داغ، جگر، اقبال، سیماب اور دیگر اساتذۂ فن کے ہزاروں شاگردوں اور متوسلین کی کہکشاں یہاں جگمگاتی تھی، مگر اس کے بعد یہ بساط سمٹتی چلی گئی۔ بزرگ داغ مفارقت دیتے رہے ہیں اور ان کی جگہ خالی ہوتی رہی۔ اب لے دے کے اردو، اردو رواج، اردو ماحول بس جے پور، ٹونک اور اودے پور میں بچے ہیں یا راجستھان کے طول وعرض میں واقع کچھ اضلاع میں موجود ہیں۔ جنھیں اپنی شناخت کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح انھیں ملکی سطح پر کوئی مقام، ناموری یا شہرت نہیں مل پاتی۔ راجستھان میں بھی اس کے وسائل مفقود ہیں اور دوسرے خطوں کی ادبی انجمنوں کو اس کی پروا کم ہی ہوتی ہے۔ ایسے افراد جنھیں نظر انداز کیا گیا ہے یا جو مین اسٹریم میں شمولیت سے محروم ہیں ان میں سے چند نام یہ ہیں: شاہد پٹھان، شاہد جمالی، ظفر احمد پروا، بشیر احمد توقیر، شگور انور، چاند شہری، ڈی این فضا جو کالوی وغیرہ۔

سوال: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: میں چاہتا ہوں کہ اردو کے فروغ کے لیے بنیادی سطح پر دل سے کام کیا جائے۔ اگر ہم لوگوں نے بنیادی سطح پر طلبا کو اردو زبان سے روشناس کرا دیا تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ ہمیں اپنی دکانوں کے سائن بورڈ، شادی بیاہ کے کارڈ، سرکاری عمارتوں کے نام، بینکوں اور عدالتی حکم ناموں کو اردو زبان میں تحریر کرنے کی مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ عوامی سطح پر پبلک لائبریریوں میں اردو کے فروغ کے لیے مفت اردو کوچنگ سینٹر کھولے جائیں اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں اردو کمیٹی موجود ہو جو اردو اخبارات، کتب، رسائل اور دیگر امور کی فراہمی کے انتظام کرے۔

سوال: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟

جواب: جیسا کہ ماقبل میں ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہوتا ہے۔ رسم الخط کے بنا زبان کا وجود ممکن نہیں۔ حرف تہجی میں تبدیلی کی بات کرنے والوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جسم کے ایک حصے کو کاٹ کر دوسرے حصے میں لگا دینے سے جسم کی شناخت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اردو والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے رسم الخط میں ہی لکھیں، پڑھیں اور خط وکتابت کریں۔ اس کے لیے نونہالوں اور طلبہ کو اُردو حرف تہجی سے روشناس کرانے کے لیے سائنٹفک طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔

سوال: غیر اُردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

جواب: غیر اُردو حلقوں میں اردو کے فروغ دینے کے لیے فلم، ڈاکیومنٹری، نکڑ ناٹک، ڈراموں اور مشاعروں کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے تو ایسے کئی نامور ہندستانی صنعت کار ہیں جو ہر سال ملک اور بیرون ملک مشاعرے منعقد کراتے ہیں۔ اس طرح وہ اُردو کے اشعار کی چاشنی سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب تک زبانیں رابطے کا ذریعہ نہیں بنیں گی تب تک ہم اپنی بات بہتر طریقے سے دوسروں کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس روایت کا قلع قمع کرنا ہوگا کہ اُردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ انگریزی کے معاملے میں یہ روایت کہاں چلی جاتی ہے۔ انگریزی زبان پر سب لوگ کچھ نہ کچھ شد بد ضرور رکھتے ہیں۔ اگر کسی پنڈت نے اُردو زبان سیکھنے کی کوشش کی تو مقامی لوگوں کے ذہن میں طرح طرح کے خیال گردش کرنے لگتے ہیں۔ یہی حال مسلم علما کا ہے۔ ہمیں ایسا ماحول تیار کرنا ہوگا کہ تمام لوگ بلا تفریق مذہب وملت ایک دوسرے کی زبانیں سیکھیں۔ اس ضمن میں ہمیں مہاتما گاندھی کے ہندستانی کے نظریات کی جانب رخ کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا تھا کہ میری دلی خواہش ہے کہ ہندو اُردو اور مسلمان ہندی زبان سیکھیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں سینٹرل اسکولس، نوودے ودیالیوں اور دیگر کمیونٹی اسکولس میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب: جی یہاں تک تو اطمینان بخش بات ہے کہ راجستھان میں اردو اکادمی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور، اجمیر یونیورسٹی، ٹونک، کوٹہ، بھرت پور، دھول پور، سوائی مادھو پور، باراں، پالی، وغیرہ اضلاع میں متعدد گورنمنٹ کالجز اور سرکاری، متعدد اسکیموں کے تحت قائم شدہ اسکولوں، نوودے ودیالیوں اور کمیونٹی اسکولوں میں شعبہ ہائے اُردو قائم ہیں اور اُردو تدریس کے انتظامات موجود ہیں نیز ان میں طلبا وطالبات کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے جس سے راجستھان میں اُردو کے مستقبل کی تابناکی کی نوید ملتی ہے۔

■

Imran Akif Khan
5/4, Fiction Numa
Noor Nagar, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Email.: imranakifkhan@gmail.com

اردو غزل کا علامتی نظام

ساجد ممتاز

شعرا و ادبا اپنے خیالات و احساسات کے بہتر اظہار کے لیے ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لیے مؤثر سے مؤثر ترین طریقے اور ترسیل خیالات کے نئے نئے پہلو ایجاد کیے جائیں اور ان کو عملی زندگی میں استعمال کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ ادائے مطلب کے دوران ادب کا دامن بھی ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس کے لیے انھوں نے رمز و اشارہ اور کنایے کا سہارا لیا۔ مثلاً کبھی تشبیہ و استعارے کی شکل میں تو کبھی علامت کی صورت میں اور کبھی علم معانی و بدیع کی دوسری مختلف صنائع کے ذریعے اپنے خیالات کو پیش کیا۔ ان تمام خوبیوں کو برتنے کے پیچھے یہی جذبہ اور جوش کام کرتا رہتا ہے کہ ادائے خیالات کے نئے نئے سانچے مہیا ہوں جس سے سننے والے کے دل و دماغ میں اشیا اور محسوسات و جذبات کی صحیح تصویر کشی ہو سکے۔

اظہار کا بالواسطہ پیرایہ ادب کی ایک اہم خصوصیت ہے یعنی شاعر یا ادیب جو بات کہے اس سے دوسرے معنی مراد لیے جائیں۔ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل اور مجاز وغیرہ اس بالواسطہ اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ اظہار کی یہ اہم ترین صورتیں بہ ظاہر تو ایک دوسرے سے مشابہ نظر آتی ہیں لیکن حقیقتاً یہ ایک دوسرے سے منفرد ہیں۔ علامت بھی انھیں طریقۂ اظہار میں سے ایک مؤثر ترین طریقہ ہے۔ علمائے ادب اور شاعروں نے علامت کا استعمال بہت فصیح انداز میں کیا ہے۔ اس سے کلام میں وسعت پیدا ہوئی اور کلام اختصار کی سرحدوں سے نکل کر ایجاز کی وادیوں میں پہنچ گیا۔ معانی و مطالب کے نئے نئے غنچے کھلنے لگے۔ علامت کا لطف منتہا بھی یہی ہے کہ اس کے اشارے میں لطافت اور دلچسپی کوٹ کوٹ کر بھری ہو، شاعرانہ تخیل کو تیز رفتاری ملے، واقعے اور قصے میں چاشنی کے ساتھ ساتھ تجسس بھی ہو، کوزے میں سمندر بھی سمایا رہے اور باوجود ان خصوصیات کے فنی ضرورتوں اور تقاضوں سے اس کا دامن بھی خالی نہ ہونے پائے۔

علامت سے متعلق جب گفتگو ہوتی ہے تو ذہن میں لاشعوری طور پر یہ سوال رقص کرنے لگتا ہے کہ علامت کہتے کسے ہیں؟ علامت کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں زبان کے تخلیقی عناصر پر بحث کرتے ہوئے ادب کے ناقدین نے علائم کی مختلف تعریفیں اور توضیحیں کی ہیں۔ ان میں سے بیش تر تعریفیں اپنے آپ میں اتنی مبہم اور پیچیدہ ہیں کہ ان سے کوئی کامل نتیجہ نکالنا بہت مشکل ہے۔ اس کے باوجود ان سے علامت کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں علامت کی ایک جامع و مانع تعریف متعین کرنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔

انسانی فکر کی تاریخ میں علامت کا تصور بہت قدیم ہے۔ علامتی عمل نے اساطیر، لوک گیتوں و لوک کہانیوں، مذہب، سماجی رسومات اور تہذیب و تمدن کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

علامت کی تعریف کرتے ہوئے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''کوئی لفظ جب اپنے معنی کے علاوہ کسی وسیع اور تہہ دار معنی کو پیش کرے تو وہ علامت کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ گویا علامت شعری ہنر مندی سے زبان کے ایک مخصوص استعمال کے طریقے سے تشکیل پاتی ہے۔''

(بحوالہ ڈاکٹر نجمہ رحمانی، جدید غزل کی علامتیں: ص 18: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی: 2005)

علامت سے مراد وہ بیان ہے جس کے ذریعے جو کہا جائے اس سے کچھ الگ اور کچھ زیادہ معنی مراد لیے جائیں۔ علامت ہمارے ذہن کو معانی کی کئی جہتوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور اس کی یہی خوبی ہے کہ یہ ان میں سے ہر جہت کے لیے موزوں قرار پاتی ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کا خیال ہے کہ نظم یا علامت جو ایک قائم بالذات شے ہے جو شاعر اور قاری کے مابین رہتی ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کا رابطہ دونوں سے ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کا یہ رابطہ شاعر کے ساتھ بھی ویسا ہی ہو جیسا قاری کے ساتھ۔ نظم یا علامت شاعر کے مدعا کو ظاہر اور قاری کے ذہن کو (علامت کی طرف) منتقل تو کر سکتی ہے لیکن اس اظہار و انتقال میں مطابقت ہونا ضروری نہیں۔

علامت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر انیس اشفاق لکھتے ہیں:

''علامتی بیان میں جیسے جیسے ہم الفاظ اور ان کے انسلاکات کا تجزیہ کرتے جاتے ہیں ویسے ویسے وہ بیان وسیع المفہوم ہوتا جاتا ہے اور ہر تجربے کے بعد جہاں موضوع بیان میں تنوع پیدا ہے وہیں اس کا تاثر بھی مختلف ہو جاتا ہے۔''

(ڈاکٹر انیس اشفاق، اردو غزل میں علامت نگاری ص 97-96، اتر پردیش اردو اکادمی 1995)

آگے لکھتے ہیں:

''علامتی اسلوب کبھی مفہوم کو مختلف زاویوں سے پیش کرتا ہے اور کبھی بجائے خود کثیر المفہوم ہوتا ہے یعنی اس کا ہر لفظ معنی کا ذخیرہ ہوتا ہے اور ہر لفظ کے معنی دوسرے لفظ کے معنی سے مختلف لیکن متعلق ہوتے ہیں اور ہر لفظ مختلف مفاہیم کی ترجمانی میں قاری سے پورا تعاون کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر انیس اشفاق، اردو غزل میں علامت نگاری ص 102، اتر پردیش اردو اکادمی 1995)

چونکہ غزل ایجاز و اختصار کا فن ہے اس لیے علامتیں اس اختصار میں سحر کاری کا کام کرتی ہیں۔ غزل کے فن میں علامتوں کی اہمیت مسلم ہے اور اس میں عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً گل و بلبل سے پیدا علامت ہر دور میں مختلف رہی ہے اور لفظ 'سرخ' کبھی خوشی، قربانی اور خطرے کی علامت رہا ہے تو کبھی انقلاب کا ہم معنی ٹھہرا ہے۔ غزل کی قدیم علامتوں میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، ساقی و میخانہ وغیرہ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔

جس طرح اردو کی شعری اصناف فارسی ادب سے مستعار ہیں اسی طرح اولین اردو غزل کا علامتی نظام بھی فارسی غزل کے علامتی نظام سے متاثر نظر آتا ہے۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ وغیرہ فارسی غزل سے ہی اردو غزل میں علامت کی شکل میں شامل ہوئے۔ فارسی ادب میں ان الفاظ کو علامت کی منزل تک پہنچنے میں چند مراحل سے گزرنا پڑا جب کہ اردو ادب میں یہ الفاظ سیدھے طور پر ایک علامتی الفاظ کی حیثیت سے مگر ناپختہ حالت میں شامل ہوئے۔ ان علامتی الفاظ کو اردو غزل میں منتقل ہونے سے بہت قبل ہی فارسی غزل میں ان کی علامتی حیثیت مستحکم ہو چکی تھی لہٰذا اردو شعرا نے انھیں علامتی شکل میں جوں کا توں قبول کر لیا اور ان علامتی الفاظ کا استعمال سب سے زیادہ صنف غزل میں ہوا۔ گل و بلبل، آئینہ، شمع و پروانہ، صیاد، قفس، باغ وغیرہ جیسے الفاظ فارسی شاعری کی ابتدا سے ہی ملنے لگتے ہیں۔ لیکن اس وقت یہ الفاظ کسی خاص علامت کی شکل میں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ ایک عرصے تک یہ الفاظ محض منظروں کی عکاسی کے طور پر ہی اپنے اصل معنی و مفہوم میں استعمال ہوتے رہے۔ جیسے آئینہ خود کو دیکھنے، نکھارنے اور لازمۂ حسن کے طور پر استعمال ہوتا ہے، گل باغ کے حسن اور اس کی شادابی کو دوبالا کرتا ہے، باغ خوش نما اور خوب صورت منظر کو پیش کرتا ہے اور شمع صرف روشنی کا کام کرتی ہے اور محفل کی رونق میں اضافہ کرتی ہے۔ اس طرح شروع شروع یہ تمام الفاظ اکثر و بیش تر اپنے اصل معنی و مفہوم میں ہی استعمال ہوتے رہے۔ ان الفاظ میں چوں کہ علامتی قوت موجود تھی اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی علامتی معنویت کا ظہور ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ شاعر کو اپنے جذبات و احساسات کے لیے یہ پیرایۂ اظہار موزوں معلوم ہونے لگا۔ گل اپنے حسن شگفتگی اور خوشبو کی بنیاد پر محبوب سے مشابہ ہو گیا اور بلبل کی نغمہ سرائی آہ و زاری میں تبدیل ہو کر عاشق کا کردار ادا کرنے لگی۔ اس طرح گل و بلبل کا تلازمہ عاشق و معشوق کی علامت بن گیا۔ شمع پہلے صرف محفلوں کو روشن کرنے کا کام کرتی تھی لیکن بعد میں شعرا کو اس میں ایک قسم کے سوز و گداز کی نئی معنویت نظر آنے لگی۔ اب جو چراغ پہلے صرف محفلوں کو روشن کرنے کا کام کرتا تھا وہ اب غم کی نمائندگی بھی کرنے لگا۔ اب شمع کے اردگرد پروانے کے والہانہ طواف اور جاں فشانی نے بھی عاشق کی بے لوث اور پُر خلوص محبت کے ساتھ ساتھ اس کے ایثار و قربانی کی معنویت اختیار کرنے لگا۔ اس طرح شمع و پروانے کا تلازمہ عاشق و معشوق، سوز و گداز اور نور و ضیا کے مفاہیم ادا کرنے لگے۔ آئینہ جو پہلے صرف لازمۂ حسن تھا بعد میں اس نے بے پناہ علامتی معنویت اختیار کر لیا اور وہ فرد کے غیر محدود ذہنی و مادی تجربات اور احساسات و کیفیات کی عکاسی کرنے لگا۔ صوفی شعرا نے آئینے کو مختلف مفاہیم اور مسائل کی نمائندگی کے لیے استعمال کیا۔ باغ اور اس کے متعلقات کو شعرا پہلے صرف مناظر کی عکاسی کے طور پر ہی استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں یہ باغ دنیا کی علامت کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور اس کے متعلقات دنیوی ساز و سامان کے طور پر پیش ہونے لگے۔

اردو غزل کے علامتی نظام کی تشکیل پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً اس کا علامتی نظام حسن، عشق اور غم کے اردگرد ہی گھومتا ہے۔ عشق و محبت کے نتیجے میں پیدا شدہ ان جذبات و احساسات کے بالواسطہ اظہار کے لیے گل و بلبل اور شمع و پروانہ کا پیرایہ اپنی علامتی قوت کی وجہ سے ایک بہترین پیرایہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان پیرایوں کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا۔ مگر جیسے جیسے ان کے تلازمے زیادہ معنویت کے حامل ہوتے گئے ویسے ویسے ان کے دائرے میں بھی مزید وسعت پیدا ہونے لگی۔ اب یہ پیرائے اپنے متعلقات کے ساتھ حسن، عشق اور غم کے علاوہ دوسرے مفاہیم کی نمائندگی بھی کرنے لگے۔ مثلاً محفل میں شمع، پروانہ، شراب، کباب، پیالہ، مینا، صراحی، خُم، جُرعہ، نشہ، خمار، صبوحی، ساقی، مطرب، چنگ، ارغواں مضراب، پردہ اور ساز وغیرہ میں علامتی معنویت پیدا ہو گئی۔ اسی طرح باغ کے تلازمات میں سرو، قمری، گل و بلبل، صیاد، گلچیں، باغباں، آشیانہ، قفس، دام، دانہ، یاسمن، نسرین، نسترن، سوسن، خار وغیرہ دنیوی وقوعوں کے لیے علامتی تلازمات کا کام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ تمام تلازمات بالواسطہ طور پر مادی مسائل کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعات مسائل کی ترجمانی کرتے بھی نظر آنے لگے۔

یہ حقیقت ہے کہ تمام علامتیں پہلے استعاراتی اور تشبیہی پیرایوں میں ہی استعمال ہوتی ہیں اور پھر اپنی علامتی صلاحیت کی بنا پر یہی استعارے اور تشبیہیں علامتوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں اردو ادب کے ابتدائی شعرا کے یہاں فارسی شاعری کے تلازمے علامتی پیرائے سے زیادہ استعاراتی اور تشبیہی پیرائے میں نظر آتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں یہ تلازمے نیم علامتی مفہوم ادا کرنے میں کامیاب ضرور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان شعرا کے یہاں استعاراتی اور تشبیہی پیرائے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جس سے اردو شاعری پر فارسی روایت کے اثرات کے ساتھ ساتھ ابتدائی اردو شاعری کے علامتی نظام کا تجزیہ کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ دکنی شاعری بھی فارسی سے مستعار علامتوں کے استعمال سے اپنے علامتی نظام کو متاثر ہونے سے پاک نہ رکھ سکی۔ پھر بھی ان کے یہاں بعد کے شعرا کی مانند علامت کا وسیع استعمال نظر نہیں آتا۔ البتہ صوفیانہ مضامین کی عکاسی کرنے کی وجہ سے ان شعرا کے یہاں لفظِ آئینہ میں کثیر المعنویت پیدا ہو گئی ہے۔ اسی طرح شمع کے علامتی مفاہیم بھی فارسی کے روایتی مفہوم کی طرح وسیع مگر کسی حد تک مختلف ہو گئے۔ یہاں چند ایسے اشعار اور ان کے علامتی پیرائے کے مفاہیم کو پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ایسی مستعار علامتیں مستعمل ہیں۔

گر نہیں ہے خنجرِ بیدادِ خوباں کا شہید
دامن صد چاک گل کس واسطے پر خوں ہوا
درد منداں باغ میں ہرگز نہ جاویں اے ولی
گر نہ دیوے نالۂ بلبل سراغ عاشقی

(ولی دکنی)

صحنِ گلزار میں کیا کام ہے صحرائی کا
جائے گل حیف یہاں خارِ بیاباں نہ ہوا

(سراج اورنگ آبادی)

فصلِ خزاں میں بلبل ہے گل کا مرثیہ خواں
مرغ چمن ہیں جتنے سب ہیں جوابیوں میں

(سراج اورنگ آبادی)

مندرجہ بالا اشعار میں گل و بلبل اپنے دیگر متعلقات کے ساتھ مل کر ایک علامتی نظام کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بظاہر یہ الفاظ اور ان کے متعلقات عشقیہ مضامین کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھتے ہیں لیکن ان اشعار کے تجزیے سے جو مختلف مفاہیم اخذ ہوتے ہیں اس سے انسانی زندگی کے دوسرے معاملات کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے۔ یعنی ان اشعار میں مستعمل تمام تلازمے دنیا کی واردات کے لیے ایک علامتی پیرایہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ولی دکنی کا یہ شعر۔

گر نہیں ہے خنجر بیدادِ خوباں کا شہید
دامنِ صد چاک گل کس واسطے پُر خوں ہوا

اس شعر میں دو محبوب کا ذکر کیا گیا ہے۔ خوباں حقیقی محبوب کا ترجمان ہے اور گل مجازی محبوب کا اور حقیقی محبوب مجازی محبوب سے زیادہ حسین ہے۔ اس لیے مجازی محبوب حقیقی محبوب کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کی سفاکیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ شعر عشق کی عالمگیری کو ظاہر کرتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی حسین اشیا کو کوئی دوسری حسین تر اشیا مل جائے تو وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں ایک قسم کا استفہام بھی شامل ہے۔ یعنی اگر گل (مجازی محبوب)، خوباں (حقیقی محبوب) کے ظلم کا شکار نہیں ہے تو اس کا دامن صد چاک خون سے کیوں بھرا ہے؟ یہ سوال ذہن کو مختلف پہلوؤں کی طرف منتقل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیا یہ ظلم گلچیں نے کیا ہے یا چمن پر کسی اور آفت کا نزول ہوا ہے یا یہ کسی جنونی کا انتقام ہے؟ قاری کا ذہن ان سوالات کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے شعر میں ایک قسم کی دلچسپی کا پیدا ہونا لازمی بات ہے۔ یہ سوالات زندگی کے مختلف وقوعوں، ان کے نظریوں اور ان میں رونما ہونے والی مختلف تبدیلیوں کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے کہ ذہن کو ان سوالات کی طرف منتقل ہونے کے باعث جس طرح شعر میں حسن پیدا ہوا ہے اسی طرح یہ زندگی کے مختلف وقوعوں اور نظریوں کو بھی تبدیل کرتا جاتا ہے۔

صحنِ گلزار میں کیا کام ہے صحرائی کا
جائے گل حیف یہاں خارِ بیاباں نہ ہوا

اس شعر میں علامت اپنے اصل جوہر کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔ صحرا اور گلشن میں تضاد کا رشتہ ہے۔ صحرا پریشانی اور صعوبت کی علامت ہے اور گلشن آرائش اور مسرت کی۔ اس طرح یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہاں گلشن صحرائی کے لیے قفس بن گیا ہے۔

صحرائی کا اصل کام صحرا نوردی ہے اور صحرا میں صرف بنجر زمین اور خار ہوتے ہیں اور صحرائی انھیں خاروں کو دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ صحن گلزار پھولوں کا مسکن ہوتا ہے اور چوں کہ صحرائی پھولوں سے نامانوس ہے اس لیے صحن گلزار میں اسے پھولوں سے وہ خوشی اور مسرت نہیں حاصل ہو سکتی جو صحرا کے کانٹوں سے ہوتی ہے۔ صحرا نوردی میں ہر قدم پر صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ صحن گلزار محض آرام و سکون کی جگہ ہے۔ صحرائی چونکہ گلشن میں رہنے کے لیے مجبور ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ گلشن بھی بیاباں میں تبدیل ہو جائے۔

اس شعر میں صحرائی مشکل پسند اور متحرک انسان کی علامت ہے۔ خارِ بیاباں آلام و مصائب کی اور گل آرام و سکون کی علامت ہے یعنی سرگرم عمل رہنا ہی مشکل پسند انسان کی تسکین کا باعث ہے۔

فصلِ خزاں میں بلبل ہے گل کا مرثیہ خواں
مرغِ چمن ہیں جتنے سب ہیں جوابیوں میں

مرثیہ خوانی میں جوابی وہ شخص ہوتا ہے جو مرثیہ خواں کے ادا کردہ الفاظ کو اسی لے، سُر اور انداز میں دہراتا ہے۔

خزاں کے موسم میں پھول مرجھا جاتے ہیں یعنی ان کی موت واقع ہو جاتی ہے اور بلبل ان کی موت پر مرثیہ خوانی کرتا ہے۔ گل کی موت واقع ہونے سے تمام مرغانِ چمن غم زدہ ہیں لیکن ان کا یہ غم فغانِ بلبل کے مقابلے میں کم درجہ کا ہے۔ جس طرح جوابی اصل مرثیہ خواں کے مقابلے میں کم درجے کا ہوتا ہے۔

اس شعر کے علامتی مفہوم پر نظر کیا جائے تو فصلِ خزاں زوال کی علامت ہے، گل قدیم آثار کی نمائندگی کرتا ہے اور بلبل وقت کی علامت ہے۔ مرغِ چمن سے ذہن اہلِ دنیا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں کسی شئے کو ثبات نہیں ہے۔ ہر شئے زوال پزیر ہے اور وقت اس زوال پزیری کو نہ صرف محسوس کراتا ہے بلکہ خود بھی زوال کا ماتم کرتا ہے اور اہلِ دنیا کو بھی اس ماتم میں شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا دور سیاسی و سماجی اعتبار سے انتہائی تغیر کا دور تھا۔ ایک طرف اندرونی سازشیں دیمک کی مانند ملک کی جڑوں کو کمزور کر رہی تھیں تو دوسری طرف بیرونی حملوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ سرزمین ہند پر انسانی خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ دلّی کے قتل عام نے انسان کے دل و دماغ پر اتنا شدید، گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا کہ ایک زمانے تک یہ سانحہ لوگوں کو صدمے سے باہر نہ آنے دیا۔

ان حالات کا اثر معاشرے پر پڑنا لازمی تھا لہٰذا سماجی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور اس سے سماج بہت حد تک متاثر ہوا۔ اُس وقت دلّی کے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ ہر شخص زندگی کے ایک ایک پل کو آخری پل سمجھ کر اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش میں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا معاشرہ رنگینیوں میں ڈوب کر بیتے ہوئے اور آنے والے کل کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ صرف آج میں جینا چاہتے تھے۔ تمام کوششوں کے بعد بھی اس وقت کے شعرا و ادبا اپنے دل و دماغ پر جمے ہوئے حادثات کے گرد و غبار کو صاف کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان غزلوں میں اس وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات ہمیں علامتی پیرائے میں ملتے ہیں۔

یہ حسرت رہ گئی کن کن مزوں سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

(مظہر)

خزاں تک تو رہنے دے صیاد ہم کو
کہاں یہ چمن پھر کہاں آشیانہ

(تاباں)

بلبلو کیا کروگے چہک کر
گلستاں تو اجڑ چکا کب کا

(تاباں)

مذکورہ بالا اشعار کا تجزیہ اگر اسی دور کے سماجی و سیاسی پس منظر کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو ہر لفظ ایک علامتی پیرایہ اختیار کر لیتا ہے۔ جس طرح فیض کی شاعری میں گل و بلبل کو سیاسی علامت تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح اس عہد کے شعرا کے یہاں مستعمل علامتی الفاظ کو بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس عہد کے حالات بھی کم و بیش وہی تھے جو آزادی کے بعد ہند و پاک کے تھے۔ شاعر کسی وقوعے کے صرف لفظی پیکر دینے کا کام کرتا ہے۔ اس کے مفاہیم ہر قاری اپنے انداز سے اخذ کر سکتا ہے شرط یہ ہے کہ وہ اشعار میں مستعمل تلازمات کے لیے موزوں قرار پائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قاری کے ذہن میں کسی شعر کا ایک ہی مفہوم ہو۔ مفہوم اخذ کرنے میں قاری کے مزاج اور اس کے حالات کی مناسبت سے تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا کلاسیکی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اردو شاعری کی علامتیں فارسی ادب سے مستعار ضرور ہیں لیکن ان کا استعمال و اطلاق ہندوستانی سماج پر ہی ہوا ہے۔

گل و بلبل کے بعد اردو شاعری میں شمع و پروانہ اور آئینے کو علامتی پیرائے میں پیش کیا جانے لگا۔ یہ علامتیں اپنی معنی خیزی اور معنی آفرینی کی بنا پر شاعری میں بہت زیادہ مقبول اور مستعمل رہی ہیں۔

تھا ذوق سراج آتش دیدار میں جلنا
صد شکر کہ پروانے کا مقصود بر آیا
پروانے کو مگر نہیں ہے خوفِ جاں سراج
ناحق چلا ہے شعلۂ دیدار کی طرف

(سراج)

مذکورہ بالا دونوں اشعار میں پروانہ بندے کی علامت ہے اور آتشِ دیدار و شعلۂ دیدار خدا کی علامت ہے۔ قربِ الٰہی (آتش دیدار میں جلنا) بندے کا مقصود ہوتا ہے اسی لیے وہ خود کو خدا کی ذات میں گُم کر دینا چاہتا ہے۔ آتش

دیدار اور شعلۂ دیدار سے کائنات کے اسرار و رموز کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے اور اس طرح پروانہ ان اسرار و رموز کی جستجو میں سرگرداں رہنے والے شخص کی علامت ہے۔ اسرار و رموز کی تلاش و تحقیق میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ انسان اسی جستجو میں اپنی ہستی بھی فراموش کر دیتا ہے۔

صافی دل کا اور عالم ہے
عکسِ آئینہ جس پہ زنگ ہوا

(آبرو)

صافی دل سے مراد یہ ہے دل بالکل صاف و شفاف ہے۔ اس پر کسی قسم کا کوئی داغ، دھبہ یا نقش نہیں ہے۔ یعنی وہ اللہ کے علاوہ ہر شئے سے پاک ہے۔

عکس غیر مجسم اور مجرد شئے ہے۔ اس طرح شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ دل کا آئینہ اتنا صاف ستھرا اور روشن ہے کہ غیر مجسم شئے یعنی آئینے پر بننے والا عکس بھی اس کے لیے زنگ کا کام کرتا ہے۔

لفظی مفہوم سے قطع نظر اس شعر کے دوسرے نکات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ مادی آئینے کا عکس عارضی اور لمحاتی ہوتا ہے اور اس کا کوئی اپنا تاثر نہیں ہوتا۔ یہ عکس محض اسی وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک کوئی شخص اس کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ لیکن آئینۂ دل پر پڑنے والا عکس دیرپا اثر رکھتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ انسان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

دل خارجی اور مادی اشیا کے تاثرات کا گہوارہ ہے یعنی دل کے آئینے پر اشیا کی غیر مرئی مگر زیادہ وقت تک رہنے والی اور تاثراتی نقش گری ہوتی ہے اور اس کے بر عکس مادی آئینے پر محض مرئی اور لمحاتی۔

یہاں عکس خود بینی کی علامت ہے۔ خود بینی ہمیں اپنی ذات میں محدود اور قید کر دیتی ہے اور اپنی ذات کے علاوہ سبھی سے ہمارے رشتے ٹوٹ اور ہم خارجی اشیا کے مشاہدے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ خارجی اشیا کے مشاہدے سے ہی ہم زندگی کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ بیرونی مظاہر سے ہی ہمیں زندگی کو سمجھنے کا شعور ملتا ہے۔

اس طرح اس شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ہم میں خود بینی کا ذرا سا بھی خیال پیدا ہوا تو ہم اسرار کے مشاہدے سے محروم ہو جائیں گے۔ یعنی خود بینی (عکسِ آئینہ) ہمارے دل کے آئینے کو جو تمام تاثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور تمام اسرار کو ہم پر عیاں کرتا ہے، اس طرح میلا کر دے گی کہ حقیقتاً جس عکس کو دیکھنے کے لیے آئینۂ دل بنا ہے اب وہی اس میں صحیح طور پر نظر نہ آ سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ ہمارے ذریعے لیا گیا فیصلہ درست نہ ہوگا۔

اردو ادب کی اولین غزلوں کے علامتی نظام کا جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح اردو ادب کے شعری نظام نے فارسی کی تمام اصناف سخن اور ان سے متعلق تمام موضوعات کو قبول کیا ہے اسی طرح فارسی شاعری میں مستعمل علائم بھی اردو غزل میں داخل ہوئے ہیں۔ اردو غزل میں اس علامتی نظام کے منتقل ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی اردو شعرا فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے اس لیے انھیں ان علامتوں کو مختلف تلازموں کے ساتھ اردو غزل میں برتنے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فارسی شعرا کا اتباع کرتے ہوئے ابتدائی اردو شعرا ان علامتوں کے روایتی اور جدید تلازموں کے ایک ساتھ استعمال سے ایک وسیع مفہوم پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ابتدائی اردو غزل میں چوں کہ فارسی علامتیں اپنی موجودہ معنویت کے اعتبار سے ناکافی تھیں اس لیے نئی علامتوں کی تخلیق کے بجائے انھیں موجودہ علامتوں کی توسیع پر زیادہ زور دیا گیا۔ اخذ کی گئی علامتوں کے نئے نئے تلازمات اور مناسبات تلاش کیے گئے۔ ان تلازمات ومناسبات کی وجہ سے ایک طرف مستعار علامتوں کے معنوی امکانات کی توسیع ہوئی اور دوسری طرف شاعرانہ حدود میں بھی اضافہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوبیاتی اور موضوعاتی یکسوئی کے باوجود اردو شاعری معنی و مفہوم کے اعتبار سے فارسی شاعری سے بہت کچھ مختلف ہے۔

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول و معروف صنف ہے۔ مواد یا موضوع کو پیش کرنے میں جو اسلوب، انداز بیان اور طرز ادا اختیار کیا جاتا ہے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ علامت کو غزل کے ہر دور میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اردو غزل میں علامت کا استعمال مختلف زمانے میں مختلف معنی و مفہوم کے لیے ہوتا رہا ہے۔ ابتدا میں زیادہ تر علامتیں فارسی سے مستعار تھیں۔ ترقی پسند شعرا نے ان علائم کو غزل میں نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا۔ غرض غزل میں علامتیں کبھی مذہب سے آئیں تو کبھی روایات و تہذیب کے بعض مظاہر علامتوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک پرانی علامتیں کم و بیش قدیم معنی میں ہی استعمال ہوتی تھیں۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے نہ صرف قدیم علامات کو نئی معنویت دی بلکہ نئی اور بلیغ علامات سے اردو غزل کو متعارف کرایا۔ جیسے شاہین، ابلیس، مردِ مومن وغیرہ۔ شاہین کی علامت کو علامہ اقبال نے مردِ مومن کی مکمل علامت بتایا ہے یعنی وہ ایک خاص اونچائی پر پرواز کرتا ہے اور گھر نہیں بناتا۔ علامہ اقبال کی اس علامت پر اگرچہ اعتراضات بھی بہت ہوئے جن میں سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ شاہین میں ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا لہٰذا اسے مردِ مومن کی علامت بتانا کسی بھی نظریے سے درست اور مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ شاہین کے علاوہ اقبال نے شمع پروانہ، کہسار، گل و بلبل وغیرہ جیسی روایتی علامتوں کو بھی نئی معنویت بخشی۔

ملک کی آزادی کا مطالبہ بیسویں صدی کے اوائل سے جوش و خروش کے ساتھ ہونے لگا تھا۔ چوں کہ حکمراں طبقے کے ظلم و استحصال کا اظہار برائے راست خطرے کا باعث تھا۔ اس لیے یہ ماحول علامتوں کے استعمال کے لیے نہایت سازگار تھا۔ اس میں قفس، آشیاں، نشیمن، چمن، گلستان، صیاد، بلبل، صبا وغیرہ علامات نئی معنویت کے ساتھ غزل میں استعمال ہوئیں۔ 1947 کے بعد ان علامتوں کو نئی سماجی اور سیاسی معنویت بخشی گئی بالخصوص فیض احمد فیض نے علامتوں کے استعمال میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ فیض اور مخدوم محی الدین کے یہاں علامتوں کا استعمال زیادہ وسیع اور زیادہ عمیق ہے۔

انسانی زندگی کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی کیفیات نے غزل کے علامتی نظام کو ہر دور میں متاثر کیا ہے۔ جدید دور میں علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، اختر الایمان، کیفی اعظمی، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، منیر نیازی، زیب غوری، راجندر منچندا بانی، احمد مشتاق، ظفر اقبال، شہریار، عرفان صدیقی، افتخار عارف کے ساتھ ساتھ بشیر بدر نے بھی اپنی غزلوں میں علامتوں کا استعمال انتہائی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے جس سے ان کے انداز بیان میں مزید حسن اور کشش پیدا ہوگئی ہے۔ جو قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔

کتابیات

- اردو غزل میں علامت نگاری: ڈاکٹر انیس اشفاق
- جدید غزل کی علامتیں: ڈاکٹر تجمہ رحمانی
- دیوان آبرو: مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن
- دیوان تاباں: مرتبہ مولوی عبدالحق
- کلیات سراج: مرتبہ عبدالقادر سروری
- کلیات ولی: مرتبہ نورالحسن ہاشمی
- نئی علامت نگاری: سید محمد عقیل

Sajid Mumtaz
Ph.D, Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National University
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob.:9616227262

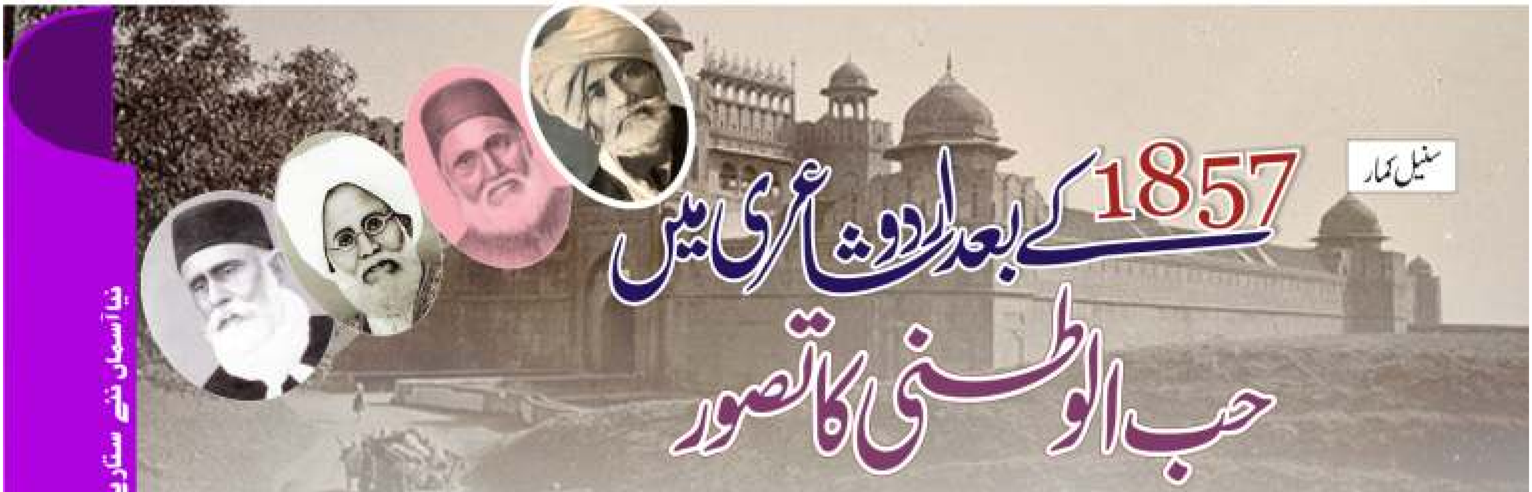

1857 کے بعد اردو شاعری میں حب الوطنی کا تصور

سنیل کمار

1857 کی بغاوت کے بعد ہندوستانیوں پر جو ظلم ڈھایا گیا اس سے ہندوستانیوں کے اندر وطنیت کا احساس پیدا ہوا۔ اس عہد کے مذہبی، سیاسی وسماجی ماحول سے شعرا وادبا بھی متاثر ہوئے اور قومیت ووطنیت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

اردو ادب میں قومی اصلاح کے ابتدائی نقوش علی گڑھ تحریک سے ملتے ہیں لیکن 1874 میں جب جدید اردو نظم کی بنیاد پڑی تو خواجہ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے جدید نظم نگاری کی بنیاد ڈال کر اردو شاعری کو نئے نئے موضوعات سے متعارف کرایا۔

اردو ادب میں قومی اور وطنی شاعری کا آغاز حالی اور آزاد سے ہوتا ہے۔ حالی اردو کے پہلے شاعر تھے جو ہندوستان کی سیاسی اتھل پتھل سے متاثر ہوئے اور جن کا دل ہندوستان کی غلامی اور بے بسی پر رویا۔ حالی کی زندگی پر سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کا کافی اثر تھا۔ اس اثر کے سبب حالی نے اصلاحی شاعری پر زور دیا۔ قیام لاہور کے دوران ان کی قومی و وطنی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دوران ان کی نظموں میں سماجی اصلاح اور حب الوطنی کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ حالی کے وطنی شعور پر قومی رنگ کی پرچھائیں زیادہ گہری ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔ انگریزوں نے اس دوران مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس سلوک نے مسلمانوں کے اندر بے چینی پیدا کر دی تھی۔ اس قنوطیت و بے چینی کو دور کرنے کے لیے سرسید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔ انھوں نے اس تحریک میں تمام مسلمانوں کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تلقین کی۔ سرسید کی اس تحریک کو بہت سے اردو شعرا وادبا کا ساتھ ملا۔ جن میں حالی، شبلی، نذیر احمد اور ذکاء اللہ جیسے لوگ شامل تھے۔ حالی کے متعلق منظر اعجاز لکھتے ہیں:

''حالی اس دور کے نہ صرف معمار بلکہ شعرا کے سرتاج بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کے دل ودماغ پر سرسید کے نقطہ نظر کا کافی اثر تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دور اندیشی سے اس راز کا انکشاف کیا کہ ہمیں ان خوبیوں کا پتہ چلانا اور ان پر عمل کرنا چاہیے جو یورپی قوموں کے عروج کا سبب ہیں اور دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ ہم روایتی اذہان اور زنگ آلود اسلحے سے حکمراں قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سرسید احمد اور حالی کی ترقی پسندی کا تمام تر راز انھیں دو نکتوں میں پوشیدہ ہے۔''

(منظر اعجاز، قومی وطنی شاعری کا منظرنامہ، مکتبہ انعکاس، مظفر پور، 2006، ص 32)

حالی کو 1857 کے بعد کے حالات اور سرسید احمد خاں کی جدوجہد کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب پرانی روش پر گامزن ہو کر شاعری کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے انھوں نے بے مقصدی پہلوؤں کو چھونے کے بجائے ایسے پہلوؤں کو چھونا ضروری سمجھا جو انسانی زندگی اور سماج کے لیے کارآمد تھے اور اسی جذبے کے ساتھ انھوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شرکت کر کے آزاد کے ساتھ اپنی آواز بلند کی۔ انجمن پنجاب کے جلسوں کے دوران حالی نے 'برکھا رت'، 'مناظرہ رحم و انصاف'، 'نشاط امید' اور 'حب وطن' جیسی نظموں کی تخلیق کی۔ حالی کی ان نظموں میں 'حب وطن' ایک ایسی نظم ہے جس میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ مثال کے طور پر پیش ہیں یہ اشعار

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسماں و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے مورد آلام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

حالی کی طرح آزاد نے بھی اپنی نظموں کے ذریعے جو پیغام ہندوستانیوں کو دیا اس پیغام نے ہندوستانیوں کے دلوں میں جوش پیدا کیا۔ آزاد کی شاعری کے حوالے سے نریندر ناتھ ورمنی لکھتے ہیں:

''آزاد کی شاعری نے وقت کے ساتھ ایک تحریک جیسی قومی شکل اختیار کر لی تھی اور ایک حد تک کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی کی وجہ سے آزاد نے جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈال کر اردو شاعری پر لاجواب احسان کیا۔ آزاد جدید شاعری کے معماروں میں سب سے آگے اس لیے بھی نظر آتے ہیں کہ جس دور میں زندگی کے تقاضے تبدیل ہو رہے تھے انھوں نے ادبی شعور، ادبی اقدار، عوامی احساسات اور انداز فکر کو حالات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کاروان زندگی اور ادب کو نئی نئی راہوں پر چلنے کی ترغیب دی۔''

(نریندر ناتھ ورمنی، اردو نظموں میں قومیت اور وطنیت، مالوہ کمپیوٹر، جون رسالہ اندور، 2001، ص 52)

مولانا محمد حسین آزاد نے اخلاقی، فطری، قومی اور وطنی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ آزاد کو اپنے وطن اور قوم سے اس قدر لگاؤ تھا کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو حق و انصاف، اتحاد و یکجہتی اور وطن پرستی کی جانب راغب کیا۔ ان کی ایک مثنوی 'حب وطن' کافی اہمیت رکھتی ہے۔

اے آفتاب حب وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظام دل زبر و زیر ہو رہا
کچھ ہو گیا زمانہ کا الٹا چلن یہاں
حب الوطن کے بدلے ہیں بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں کے داغ ہیں

محمد حسین آزاد نے قومیت اور قومی یکجہتی کے تصور کے استحکام کے لیے مختلف عناصر کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک محب وطن شاعر تھے اور وطنیت کے جذبے کے تحت نئی قومی ایکتا کو فروغ دینے کی انھوں نے مخلصانہ کاوش کی۔ آزاد کی قومی و وطنی نظموں میں اس عہد کے سیاسی و معاشرتی تصورات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آزاد نے 'حب وطن' کے علاوہ 'اولوالعزمی'، 'فتح افواج مشرق'، 'شب قدر' اور 'صبح امید' جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔

آزاد نے اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانیوں کے ذہنوں کی تربیت اور ان میں حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آزاد کا بیشتر کلام اخلاقی وقومی زمرے میں آتا ہے۔

اس روایت کو اس عہد میں پروان چڑھانے میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور دیگر شعرا کا بھی اہم رول رہا ہے۔ مولانا شبلی تو شاعر و ادیب ہونے کے

ساتھ ساتھ دانشور مفکر، معلم، مؤرخ، سوانح نگار اور مذہبی عالم بھی تھے۔ شبلی نے اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانیوں کو بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے اور مسلم لیگ سے دور رہنے کی تلقین کی۔ شبلی کی وطنی شاعری کو اس عہد کی سیاسی اتھل پتھل سے قوت حاصل ہوئی تھی۔ شبلی کے متعلق منظر اعجاز لکھتے ہیں:

''شبلی شروع ہی سے لیگ کے مخالف اور کانگریس کے حامی تھے۔ اس موقع کی نزاکت کے پیش نظر انھوں نے لیگ کے مقصد اور نقطۂ نظر کو بدلنے میں اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے نثری پیرایے سے بھی کام لیا۔ شبلی کی ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ لیگ اور کانگریس آزادی کی لڑائی میں متحد ہوگئی۔''

(منظر اعجاز، قومی و وطنی شاعری کا منظرنامہ، مکتبہ انعکاس، مظفر پور، ص 71)

شبلی نے آزادی کی جدوجہد پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں 'پہلی جنگ عظیم اور ہندوستان'، 'صبح امید'، 'علمائے زندانی'، 'آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم' اور 'خون کے چند قطرے' جیسی نظمیں شامل ہیں۔

شبلی نے اپنی نظموں میں انگریزوں کے مظالم اور ہندوستانی وترکی عوام کی مظلومیت کو بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر پیش ہے نظم 'چرخ گردوں' کے چند اشعار۔

تمھارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلاد مغربی کے یہ نئے قانون بھی دیکھے ہیں
لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسار شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینہ پر خوں بھی دیکھے ہیں

شبلی کا بیشتر کلام قومی، مذہبی، سیاسی، احتجاجی و اخلاقی شاعری پر مبنی ہے۔ ان کے یہاں بھی حالی و آزاد کے مانند وطنی شاعری کا دائرہ محدود ہے لیکن اس کے باوجود انھیں قومی شاعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔ چونکہ ان کی نظموں نے انگریز دشمنی کے جذبات کو جس قدر ابھارا تھا۔ وہ مشترکہ قومیت اور وسیع وطنیت کے شعور میں ایک نیا احساس پیدا کرتا تھا۔ شبلی کے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''شبلی کی سیاسی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے معرکوں اور ہنگاموں کو محدود مذہبی اور دینی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ وطنی اور قومی زاویے سے انھیں ایک بڑے سانچے کا جزو بنا کر دیکھتے تھے۔ شبلی اردو شاعری کو جدید ہندوستانی مسائل سے قریب تر لائے اور اس میں انھوں نے ہندوستانی تحریک آزادی کی دھڑکنیں سمو دیں۔ ان کی سیاسی نظموں نے پست ہمتی اور مغلوبیت کے غبار کو ہٹانے میں قابل قدر حصہ لیا۔''

(گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص 334)

شبلی نے اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانیوں کو ان کی غفلت، بے بسی اور بدحالی کا احساس دلایا اور آزادی کی جدوجہد کے لیے ذہنی فضا تیار کی۔

اسمٰعیل میرٹھی نے حالی کی جدید شاعری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے بھی آزاد اور حالی کی طرح روایتی شاعری سے انحراف کیا اور جدیدیت کو اپنایا۔ قومی اصلاح کے لیے انھوں نے اپنی نظموں میں اتحاد و اتفاق پر زور دیا۔

ان کی وطنی شاعری میں فطرت کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی موسموں، دریاؤں، پہاڑوں، نالوں اور ہندوستانی فضاؤں کی گونج سننے کو ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں 'گرمی کا موسم'، 'رات شفق'، 'برسات کی رات'، 'آزادی غنیمت ہے'، 'اتحاد' اور 'اچھا زمانہ آنے والا ہے' اہم ہیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے اپنی نظموں میں وطن کے منظر کو بخوبی بیان کیا ہے۔ فطرت کی حسین تصویر کھینچنا اور اسے مختلف صورتوں میں پیش کرنا ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ وطن کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندوستانی قوم کو بھی وطن کی جانب راغب کیا اور انگریزوں کے ظلم و جبر کو بھی اجاگر کیا۔ ہندوستانی قوم کی صورت حال کو دیکھ کر انھوں نے ایک نظم 'دانشمندی کی راہ' لکھی جس میں قوم کی بگڑی ہوئی صورت کو مخاطب کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار/ بہتے دریا کو پھر لانا دشوار
دشوار یہی مگر نہ اتنا/ جتنا بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی نظموں میں ہندوستانی دیہاتوں کے منظر کو بھی جس محبت و عقیدت سے بیان کیا ہے اس سے ان کی فطری شاعری کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ اس طرح کی عقیدت اور لگاؤ کا اظہار کر کے انھوں نے اردو شاعری میں دیہی نظم کی بنیاد ڈالی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی نظموں میں مختلف موضوعات کو برتا اور موضوعاتی نظموں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں۔ وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے بچوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ بچوں کی اخلاقی مذہبی اصلاح کے لیے انھوں نے جو نظمیں لکھی ان میں 'اسلم کی بلی'، 'ہماری گائے'، 'جگنو اور بچہ' کو دیکھیے تو مکالماتی طور پر اس نظم میں 'بچہ اور جگنو' کے عمل اور رد عمل کو ظاہر کیا گیا ہے جسے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ نظم 'بچہ اور جگنو' میں بچہ جگنو کی چمک سے متاثر ہو کر اسے پکڑتا ہے تو اس پر جگنو اپنے رد عمل کو اس طرح سے بیان کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

تو غمگین قیدی نے کی التجا
کہ چھوٹے شکاری مجھے کر رہا
خدا کے لیے چھوڑ دے چھوڑ دے
میری قید کے جال کو توڑ دے

اس مکالماتی انداز کی نظم میں اسمٰعیل میرٹھی نے جگنو اور بچہ کو انگریزی حکومت اور غلام ہندوستان کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی ایک اور نظم 'بارش کا پہلا قطرہ' میں بھی مکالماتی انداز اپنایا ہے اور اتحاد کو مرکزی خیال بنایا ہے۔ تصدیق کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔

ہر قطرے کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں یہ غریب قطرہ
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیا ناس

ان تمام قطروں کی مایوسی دیکھ کر ایک قطرہ ہمت اور دلیری سے کہتا ہے۔

بولا للکار کر کہ آؤ/ میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے کچھ احساں/ ڈالو مردہ زمین میں جاں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ/ دشوار ہے جی پہ کھیل جانا

مولانا اسمٰعیل نے یہاں اتحاد و ایثار کا جو تصور پیش کیا ہے وہ مختلف خصوصیات کے حامل کرداروں کے درمیان اتحاد کا تصور ہی نہیں ہے بلکہ ایک ہی خصوصیات کے حامل مختلف قطرات کے مابین اتحاد و اتفاق پر زور دیا ہے۔ اس نظم کو بھی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں قطروں کو ہندوستانیوں کے تناظر میں دیکھا ہے جو خوف زدہ ہیں۔ مولانا اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کا اظہار وہ نظم 'بارش کا پہلا قطرہ' کے آخر کے چار مصرعوں میں کرتے ہیں۔

اے صاحبو! قوم کی خبر لو — قطروں کا سا اتفاق کر لو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری — چل نکلیں گی کشتیاں تمھاری

مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی نظموں کے وسیلے سے آزادی کی جدوجہد کو اور تیز کیا اور ہندوستانیوں کو آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے لیے مائل کیا اور اردو شاعری میں اہم مقام بنایا۔

قومی و وطنی شاعری کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے میں جن دیگر شعرا نے اس عہد میں اپنی خدمات انجام دیں ان میں اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، ظفر علی خان، حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، لال چند فلک، عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی، چکبست اور سرور جہاں آبادی جیسے شعرا کے نام شامل ہیں۔

■

Sunil Kumar
Room No. 115, Jhelum, JNU,
New Delhi-110067
Phone No. 8082675182
Email: sk9971644727@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

دامان مریم (سچی کہانیاں)

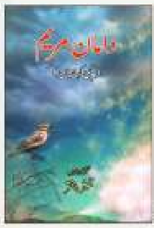

مصنف: محمد حسن، تحقیق وترتیب: جمیل اختر

صفحات: 192، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: منزہ قیوم، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سماج میں ظاہری طور پر جو کچھ ہے وہ سب تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے لیکن کچھ ایسی پوشیدہ باتیں ضرور ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب بھی ہوسکتی تھیں یا یہ نہیں بھی ہوسکتی تھیں تو یہ ساری تصویریں اور سماج سے جڑی باقی باتیں بھی کہانیوں میں ہمیں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ زیر نظر کہانیاں بھی ہمارے اسی سماج سے جڑی ہوئی ہیں جس میں ہم اپنی زندگیاں جی رہے ہیں یہ کہانیاں ایک انسان کی چاہے وہ عورت ہو یا مرد دونوں کی انفرادی اور اجتماعی شبیہ ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ 'دامان مریم' میں سچی کہانیاں شامل ہیں۔ ہر کہانی میں شروع سے آخر تک قاری تذبذب میں رہتا ہے اور کہانی کے آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کسی نہ کسی خوشی کی امید رکھتا ہے لیکن یا تو منزل ہی نہیں ملتی یا زندگی ہر موڑ پر اپنا فیصلہ بدل دیتی ہے۔ یوں تو زندگی میں انسان کو ہر موڑ پر منزل کی ضرورت بہرحال رہتی ہے لیکن زندگی اتنا وقت کسی کو نہیں دیتی کہ ہر موڑ کو منزل کر دے۔ 'دامان مریم' (سچی کہانیاں) میں تاریخی کہانیاں جیسے، دامان مریم، عذابوں کے سفیر، دامن کی آگ، آنکھ مچولی، فسانہ داد، شاعر محفل وفا ہندوستان کا پاکستان دوست، ایک فرضی سازش باری گر، نانا میاں وغیرہ کہانیاں شامل ہیں جو زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو کو اجاگر کرتی ہیں۔ کتاب میں شامل افسانہ 'تاریک گوشے' ایک ایسا افسانہ ہے جو حقیقت پر مبنی ہے جس کے بیشتر کردار حقیقی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس میں زندگی کا ہر پہلو کتنا خوبصورت نظر آتا ہے، انسان خواب بنتا ہے اور بعد میں اپنے آپ میں ہی کہیں کھو جاتا ہے۔ اس کہانی میں پہلے زندگی کے خوابوں کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے، یہاں صرف گزرتے وقت کا ایک پہلو دیکھیے:

''وقت یوں ہی گزرتا رہا اب اسے محمود کی یاد کبھی نہیں آتی تھی اور اگر خود محمود بھی اب قید سے نکل آتا تو وہ اس کا خیر مقدم اسی سرد مہری اور خاموشی سے کرتی، جذبات کو اس نے جس کامیابی سے راکھ میں چھپا دیا تھا اب اسی کامیابی سے ان کا باہر آنا ممکن نہیں رہا تھا''

یہ کہانی ریحانہ کی زندگی کے اردگرد گھومتی ہے۔ ریحانہ کہانی کا مرکزی کردار ہے اور ایک عورت کی سماجی اور نفسیاتی الجھنوں کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کہانی عورت کی محبت کو بھرپور طور سے دکھاتی ہے کہ کس طرح ایک عورت زندگی بھر ایک ہی احساس سے جڑی رہتی ہے وہ بھلے ہی اس دنیا میں نہ ہو مگر وہ ہمیشہ کے لیے اس کے تن اور من میں بسا رہتا ہے اور اس کی روح میں سرایت کر چکا ہوتا ہے۔ اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں ایسی ہیں جنھیں ایک بار ضرور پڑھنا چاہیے۔ 'دامان مریم' جو کتاب کا عنوان بھی ہے، بہت ہی کمال کی کہانی ہے اس میں عام لوگوں کی زندگی کے نشیب وفراز کو حقیقت پسندانہ انداز میں اس طرح دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح مذہبی اور سیاسی رہنما ہر دور میں محض اپنے ذاتی مفاد، حرص، لالچ اور ہوس کی خاطر عوام کا بے دریغ استعمال کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح 'دامن کی آگ' بھی ایک ایسی کہانی ہے جس میں ہمارے سماج کے انتہائی گھناؤنے واقعات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک آرٹسٹ نہ صرف ماضی میں بلکہ نئے زمانے میں بھی ان لوگوں کے سامنے صرف ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے جن کے ہاتھ اقتدار کی باگ ڈور ہے۔ کوئی آرٹسٹ اگر اپنے آرٹ کے بل بوتے پر نام اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہو تو اقتدار میں بیٹھے لوگ یہ بات ہضم نہیں کر پاتے کہ ان کے اثر ورسوخ اور ان کو حاکم تسلیم کیے بغیر کوئی کیسے کسی منصب تک پہنچ سکتا ہے اپنی اس ہوس کو وہ اپنا حق سمجھتے ہیں اور آرٹسٹ اور فنکار ہمیشہ سے ان لوگوں کے ہاتھوں کس طرح پستے آئے ہیں یہ اس کہانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایک اور اہم افسانہ 'آنکھ مچولی' ہے۔ یہ انسانی فطرت پر مبنی ایک نہایت ہی شاندار کہانی ہے۔ اس کہانی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سرمایہ دارانہ نظام لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔

جو انسان ایک وقت کی روٹی پر راضی تھا اور قناعت کی زندگی بسر کر رہا تھا اس کو بھی کس طرح عیاری اور چالاکی سے کچھ لوگوں نے دغاباز اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا دکھا دیا۔ سرمایہ دار کس طرح سے عوام کا استحصال کرتے ہیں اور کس طرح دھیرے دھیرے ان میں یہ لالچ پیدا کرتے ہیں کہ ان کی ضرورتیں بہت ہیں اور ان کو وہ خود پورا کریں گے اور اس کے لیے استعمال بھی ان ہی لوگوں کو کیا جاتا ہے، ان سب واقعات کی منظر کشی اس کہانی میں بخوبی کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں شامل کچھ کہانیاں تاریخی بھی ہیں اور کچھ اصلاحی بھی۔ کتاب کے مقدمے میں جمیل اختر نے محمد حسن کے تعلق سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ''محمد حسن کی تمام کہانیاں سچے واقعات پر مبنی ہیں تخیلاتی نہیں ہیں اسی لیے انھوں نے اسے 'سچی کہانیاں' کا عنوان دیا ہے اور اسی عنوان کے تحت یہ کہانیاں شائع بھی ہوئی ہیں۔''

مذکورہ افسانوں کے علاوہ اس میں اور بھی بہت سے افسانے ہیں جن میں زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کہانیوں کے علاوہ اس میں تین خاکے بھی شامل ہیں جن میں حلیم صاحب، فکر کی دوسری موت، اور زندگی نامہ ہیں۔ ان کہانیوں اور خاکوں کو پڑھ کر محمد حسن کی افسانہ نگاری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب دیدہ زیب ہے اور ہر اعتبار سے مناسب ہے۔ امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

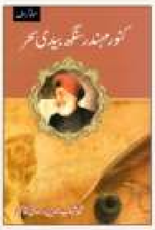

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (مونوگراف)

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

صفحات: 135، قیمت: 85 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: نثار حسن علامہ اقبال اسکول میانسرائے سنبھل (یوپی)

قومی اردو کونسل، جہاں ادبا و شعرا کی تصنیفات و تخلیقات کو اشاعت کے لیے مالی تعاون سے نوازتا ہے وہیں قابلِ ذکر قلم کاروں کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے مونوگراف لکھوانے کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کونسل کے ڈائریکٹر صاحب کے اس اعتراف سے بخوبی ہو جاتی ہے جو انھوں نے اسی کتاب میں شامل اپنے 'پیش لفظ' میں تحریر کیا ہے:

''اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے، تاکہ نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادیبوں کا سوانحی خاکہ بھی پیش کیا جا سکے اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔'' (پیش لفظ کتاب ہذا)

اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ جو دراصل بیدی صاحب کا مونوگراف ہے۔ موصوف دہلی پولس کے اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ ہی اردو کے مایۂ ناز ادیب و شاعر بھی تھے۔ یہ مونوگراف محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی نے تحریر کیا ہے۔ اس میں سحر صاحب کی شخصیت کے ساتھ ان کی حیات و خدمات کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا آغاز 'ابتدائیہ' سے ہوتا ہے۔ جس میں رحمانی صاحب نے مونوگراف کا مختصر سا تعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کے اصل متن کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کو چار حصوں پر منقسم کیا گیا ہے: (1) سوانح و شخصیت (2) ادبی و تخلیقی سفر (3) بیدی کی شاعری (4) انتخابِ نثر و نظم۔ ان عنوانات پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ہر اس عنوان کا احاطہ کر لیا گیا ہے جو کسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔ اس کے پہلے ہی حصے 'سوانح و شخصیت' میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے اہم بیدی صاحب کا نسب نامہ ہے۔ جس کے ذریعے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ بیدی صاحب سکھ مذہب کے بانی اور پہلے گرو، بابا گرونانک جی کی سولھویں پشت میں ہیں۔ اس کے بعد تعلیم، ملازمت، عادات و اطوار، ان کے کارنامے، تلامذہ اور ان کے تعلق سے لوگوں کے تاثرات وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مونوگراف کے اس حصے میں وہ تمام معلومات فراہم کر دی گئی ہیں جن سے بیدی صاحب کی شخصیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

مونوگراف کا دوسرا حصہ 'ادبی و تخلیقی سفر' کے عنوان سے ہے۔ اس میں بیدی صاحب کے ادبی و تخلیقی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ہی موصوف کی خودنوشت سوانح حیات 'یادوں کا جشن' کا ذکر کیا گیا ہے۔ خود ان کی سوانح حیات ہونے کی وجہ سے یادوں کا جشن کافی مستند کتاب ہے۔ جس کے مطالعے سے قاری کے ذہن پر بیدی کی شخصیت کے اعلیٰ نقوش مرتسم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد 'کلیاتِ سحر' کا تعارف ہے۔ جو ان کی شاعری کا عمدہ ذخیرہ ہے۔ اس مونوگراف کے شاعری والے حصے میں اس کتاب سے بھی کافی مواد پیش کیا گیا ہے۔ بیدی اگرچہ غزل کے شاعر ہیں اور انھوں نے عشقیہ شاعری میں کافی نام حاصل کیا ہے، اس کے ساتھ ہی آپ کے مراثی بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے مختلف سماجی و سیاسی رہنماؤں کے انتقال پر مرثیے لکھے ہیں۔ بیدی صاحب شاعری کے ساتھ نثر میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ نثر کی دیگر اصناف کے ساتھ طنز و مزاح میں بھی آپ کا زبردست کام ہے۔ خصوصی طور پر ان کے لطائف بہت مشہور ہیں۔ ایک ناظمِ مشاعرہ کی حیثیت سے 'لطیفہ گوئی' میں آپ کو خاص مہارت حاصل تھی۔ اس مونوگراف میں آپ کے لطیفے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بیدی کے 'مکتوبات' پر بھی لکھا گیا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ 'بیدی کی شاعری' پر ہے۔ جس میں ان کی عشقیہ شاعری، مزاحیہ شاعری، مذہبی شاعری اور بیدی کے مراثی کے نام سے ان کی شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مونوگراف کے تیسرے حصے میں ہی ان کی 'فلم سازی' پر بھی لکھا گیا ہے اور اسی حصے میں ہی ان کی منظومات کا علمی محاسبہ و تجزیہ بھی کیا گیا ہے اور ان میں نظموں کے موضوعات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ ان کی نظموں کے اخلاقی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جس پر اس حصے کا اختتام ہوتا ہے۔ کتاب کے اگلے گوشے میں بیدی کی نثر و نظم کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس مونوگراف میں آپ کی شاعری پر اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، مگر اس حصے میں آپ کا منتخب کلام شامل کیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود بیدی کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہے۔ اور مونوگراف کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس کے ہر حصے کے آخر میں حوالہ جات بھی دیے گئے ہیں۔ جو بیشتر بیدی صاحب کی کتابوں یادوں کا جشن اور کلیاتِ سحر سے لیے گئے ہیں۔ اس طرح خود ان کی تصانیف کو ماخذ بنائے جانے کی وجہ سے اس مونوگراف کا پایۂ استناد بہت بلند ہو گیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159

E-mail:.ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاعری

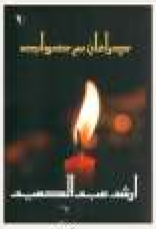

چراغاں سر خواب

شاعر: ارشد عبدالحمید
صفحات: 112، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: استفسار پبلی کیشنز، جے پور، راجستھان
مبصر: خالد محمود، B-20، جسولہ، نئی دہلی۔ 11025

ارشد عبدالحمید کو اپنی تہذیب و معاشرت اور تہذیبی سروکار سے بہت لگاؤ ہے۔ یہی لگاؤ انھیں اپنے عروج و زوال کی کہانی سناتا ہے۔ کبھی ہنساتا ہے، کبھی رلاتا ہے، کبھی غصہ دلاتا ہے۔ بالآخر وہ طنز کے اشعار میں دل کا غبار نکال لیتے ہیں مگر بزرگوں کی عظمت اور احترام اور چھوٹوں کی شفقت پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ اشعار پیش ہیں۔

دیے کو سامنا مہتاب کی مثال کا تھا — مرے بزرگ نہ ہوتے تو میں کمال کا تھا
میری مٹی مرے اسلاف کی زائیدہ ہے — اور مجھے اپنی طرف میرے خلف کھینچتے ہیں
ٹونک ہمارے ساتھ تھا سنگ ادھر بھی تھا لکھنؤ — کام کی بات نہ ہو سکی آپ جناب بہت ہوئی

ارشد عبدالحمید کو خواب سے بڑی رغبت ہے۔ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا محض نام ہی 'چراغاں سر خواب' نہیں رکھا، مجموعے کے اندر بھی خواب بکھرے پڑے ہیں۔ 'چراغاں سر خواب' کی کل 31 غزلوں میں 23 مرتبہ خواب کا استعمال ہوا ہے۔ مگر ان کے خواب اکہرے یا عمومی خواب نہیں ہیں۔ نہ یہ خواب شیریں ہیں جو اک جھلک دکھانے کے بعد کروٹ دلا کر چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ خواب ہیں جو خواب زدہ کو بے خواب کر دیتے ہیں اور وہ خواب بھی ہیں جنھیں ہم جاگتی آنکھوں کے خواب کہتے ہیں۔

ارشد عبدالحمید کے خواب کثیر الابعاد ہیں۔ انھوں نے خواب کے مختلف گوشوں کو روشن کرتے ہوئے خواب کی حقیقت بیان کی ہے یہاں تک کہ اپنی ایک پوری غزل ہی خواب کے نام وقف کر دی ہے۔ ان کے مجموعے کا نام 'چراغاں سر خواب' اسی غزل سے ماخوذ ہے۔ خواب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نور امکان کا ہو جیسے نمایاں سر خواب — صرف احساس ہے یا ہے یہ چراغاں سر خواب
دل و نگاہ کو بے تاب دیکھنے کے لیے — جہاں میں آئے ہیں ہم خواب دیکھنے کے لیے
یہ رختِ خواب نہ ہوتا تو مر گئے ہوتے — یہی ہے چھاؤں ہماری یہی سرائے سفر

ارشد عبدالحمید کی شاعری کا لہجہ طنزِ بلیغ سے عبارت ہے۔ ہر بڑی شاعری میں طنز کی آمیزش ہوتی ہے۔ ارشد کی نظموں کا جزوِ اعظم بھی طنز ہے۔ اس لہجے میں وہ ہر قسم کی ناانصافی اور استحصال کے خلاف تخلیقی احتجاج کا ہنر آزماتے ہیں۔ یہ طرز خاص اگرچہ ان کی نظموں میں زیادہ شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے تاہم انھوں نے غزل کی مخصوص اشاراتی زبان میں بھی اس نوع کے بلند پایہ اشعار تخلیق کیے ہیں۔

ان کے کلام کی ایک اور خوبی شادابی ہے جو قاری کے مزاج کو بوجھل پن اور کلام کی قرأت کو بے لطفی سے نجات دلاتی ہے۔ ان کی فطری خوش خوئی نے انھیں مایوس کن صورت حال کو بھی خوش دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ قبول کرنے اور حزن و ملال کے مضامین میں شگفتہ اندازِ بیان اختیار کرنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

تنگ آئے جو زمیں سے تو نکل جائیں گے — ہم نے اک کوٹھی فلک پر بھی بنائی ہوئی ہے
یہ عشرتوں کی فراوانی زر کی ارزانی — بنے ہیں سب مجھے کمیاب دیکھنے کے لیے
دریا میں کسی وقت بھی اٹھ سکتی ہیں لہریں — پانی سے جو ڈرتے ہیں وہ کشتی سے اتر جائیں

ایسے بہت سے بلکہ بیشتر اشعار ہیں جو طنزیہ اسلوب کی نمائندگی کرتے ہیں اور ارشد عبدالحمید کی شناخت کا حوالہ ہیں۔ انھیں کے درمیان زہر میں بجھی ہوئی ایک ایسی غزل بھی شامل کتاب ہے جو واشگاف لہجے میں معاشرے کے بے حس اور خود غرض افراد کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں۔ غزل یہ ہے۔

خلوص کے سینے سے لگ کر سو رہو سب ٹھیک ہے — صبح ہو جائے تو شکر رب کرو سب ٹھیک ہے
اپنی تسکین انا سب سے ضروری چیز ہے — اک قصیدہ روز خود پر ہی لکھو سب ٹھیک ہے

'چراغاں سر خواب' میں نظموں کی تعداد صرف تیرہ ہے جن کے عناوین یہ ہیں: لوتم بھی گئے، مرے خوابوں میں رعشہ ہو گیا ہے، ہجر کی تجدید، مجھے معصومیت پر نظم لکھنی ہے، بے چاری خاموشی، ایک بھٹکتی ہوئی نظم، بہت شکریہ، وہ مری آوارگی کا آخری اتوار تھا، دوپٹے کا پھول، مٹی میں تیرا مجرم ہوں، سفر، ابھی کچھ بھی نہیں ہوگا اور یہ ہوا میرے گل و برگ سے کیا چاہتی ہے۔

جس طرح ان عنوانات میں انوکھا پن ہے (جو جدید اور نئی نظموں کے لیے نئی بات نہیں) مگر یہ انوکھا پن ان کے اندازِ تخلیق میں بھی نمایاں ہے۔ اس انوکھے پن یا انفرادیت کے متعدد پہلو ہیں۔ زبان کی سطح پر لفظیات و تراکیب، تشبیہ و استعارہ، رعایت و مناسبت یعنی بدیع و بیان کی جملہ صورتوں کا استعمال اور اس میں نئے تجربات کی شمولیت ارشد عبدالحمید کا ایک ایسا امتیازی وصف ہے جس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی نظمیں چست مصرعوں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے غزلوں کی مانند روانی اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کا آہنگ صحتِ قرأت کی شرط کے ساتھ قاری کے لہجے میں خود بخود ترنم پیدا کر دیتا ہے۔

ارشد عبدالحمید کی نظموں میں ان کا وہی رنگِ تغزل بھی سرایت کر چکا ہے جو ان کی تہذیبی وراثت کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جدید نظموں کے مصرعے بھی اس قدر مترنم اور رواں دواں ہوتے ہیں کہ ان میں کھردرا پن تو کجا کہیں سکتے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً کرونا سے جاں بحق ہونے والے ادیبوں کے نام ایک اندوہناک نظم 'یہ ہوا میرے گل و برگ سے کیا چاہتی ہے' کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجیے اور ان کے الفاظ و تراکیب کی بندشوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھیے۔

ایک شاخ اور گری / اور اک سایۂ ادراک سے محروم ہوا صحنِ سخن / ہم پہ اک اور درِ فکر و نظر بند ہوا / ہم پہ اک اور ستم دستِ ہوا نے ڈھایا / ایک شاخ اور گری

ارشد عبدالحمید کی ہر نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اس پر طنز کے سائے بتدریج مصرع بہ مصرع گہرے ہوتے جاتے ہیں اور اختتام کو پہنچتے پہنچتے سیاہ لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کی ایک اور بہت اچھی نظم 'مرے خوابوں میں رعشہ ہو گیا ہے' کا پروفیسر جمال حسین نے بہت اچھا تجزیہ کیا ہے جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ میں اس نظم کو تہذیب کا نوحہ سمجھتا ہوں۔

یہ مجموعہ اپنے وسیع تر معنوں میں فن شعر کو نئی پرواز دینے کے مترادف ہے۔ میں اس بلند پایہ مجموعے کا استقبال کرتا ہوں۔

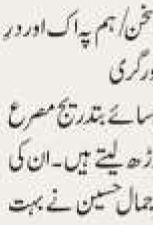

انداز بیاں اور

شاعر: مہتاب انور، ترتیب و تزئین: سعید فردوسی مرحوم
صفحات: 144، قیمت: 200 روپے
مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی، B-63/S-2، ڈی ایل ایف کالونی صاحب آباد، ضلع غازی آباد، یوپی

مہتاب انور ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، ان کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، الفاظ کے برمحل استعمال پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور فن عروض کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں۔ شاعری قدرت کا ایک ودیعت کردہ تحفہ

ہوتی ہے جب تک یہ عطا قدرت کی طرف سے نہیں ہوتی تب تک اچھی شاعری وجود میں نہیں آتی۔ مہتاب انور کو بھی رب کریم نے اس صلاحیت سے نوازا ہے اور وہ اس میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

مہتاب انور کی شاعری کا سفر چار دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اس سفر میں انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو غزلیں کہی ہیں۔ نعت، نظم اور قطعات بھی لکھے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھرتی کے اشعار کم ہی نظر آتے ہیں زیادہ تر اشعار سیدھے دل میں اتر جانے والے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار جو قاری کو چونکا دیتے ہیں۔

اک نظر تری طرف اے چشم تر دیکھے گا کون　　ہر طرف ساون ہے یہ پانی کا گھر دیکھے گا کون
میں بچا لایا ہوں شہرِ سنگ سے شیشہ مگر　　زخم جو آئے ہیں میرے جسم پر دیکھے گا کون

مہتاب انور کی غزلوں میں صرف عشق و عاشقی کی باتیں ہی نہیں بلکہ عصری حسیت بھی ہے اور تہذیبی قدروں کے زوال کا شکوہ بھی۔ وہ سماجی ناہمواریوں پر طنز بھی کرتے ہیں اور زمانے کی ستم ظریفیوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ بڑی سادگی سے اپنے خیال کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔

مہتاب انور کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات بھی ہیں۔ انھوں نے جو سماج میں دیکھا اسے شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کر دیا۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی آسان راہوں پر چلنے کے قائل نہیں یا یوں کہا جائے کہ وہ سہل پسند نہیں بلکہ مشکل راہوں کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ مشکل راستے انسان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ دیکھیے یہ اشعار

اس طرح قرینے سے یہ بچھا بچھا پتھر　　حوصلہ بڑھاتا ہے بن کے راستہ پتھر
اونچی اونچی دیواریں برج ہوں یا میناریں　　کاش اہمیت ان سے اپنی پوچھتا پتھر

کائنات میں کوئی ایسا انسان نہیں جسے کوئی غم نہ ہو لیکن ہر کسی کا غم الگ طرح کا ہوتا ہے اور یہ بات بھی دیکھی گئی ہے کہ انسان جب غم سہتا ہے تو اسے اپنا غم زیادہ لگتا ہے اور دوسرے کا غم کم محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے شاعروں نے غم کے موضوع کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ مہتاب انور کا خیال ہے کہ جس نے اس غم کو پالا نہیں، اس کی حیات میں اُجالا نہیں ہو سکتا۔

غم کو میری طرح جس نے پالا نہیں　　بزمِ ہستی میں اس کی اجالا نہیں

مہتاب انور نے حیات و کائنات کے مختلف مسائل کو غزل کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان کی شاعری میں تہذیبی اقدار کی پامالی کا کرب بھی ہے، زمانے کی بدحالی کا نوحہ بھی، خود غرضی اور ریاکاری کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے۔ انھوں نے جہاں اپنے دل و دماغ کے معاملات کی بہترین ترجمانی کی ہے وہیں سماجی مسائل کو بھی شعری پیکر میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں۔

خود غرض، مطلبی ماحول سے کٹ جاتا ہے　　بھاؤ بازار میں اس شخص کا گھٹ جاتا ہے
جیسے ہی بغض و حسد ہوتا ہے اس میں داخل　　ایک آنگن کئی دیوار میں بٹ جاتا ہے

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مہتاب انور کی شاعری مؤثر ہے۔ متنوع موضوعات کو بخوبی شعری زبان عطا کی ہے۔ انھوں نے بڑی سادگی سے اپنے دل کی بات کہی ہے اور سماجی بدحالی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے ان کا انداز دل میں اتر جانے والا ہے۔ سادہ اسلوب اور پر کشش بیان باذوق قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ امید ہے کہ مہتاب انور نے جس طرح مشاعروں میں اپنے منفرد لہجے کی بدولت ایک الگ شناخت بنائی ہے اسی طرح ان کا یہ پہلا مجموعہ 'انداز بیاں' بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

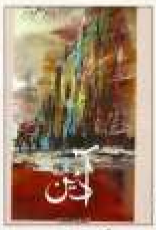

آذین

شاعر: ڈاکٹر معظم عزم
صفحات: 184، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: کے پی ایس پرکاش، دہلی
مبصر: صدر عالم گوہر، مقام و پوسٹ: پرسولیا، ضلع مدھوبنی 847226 (بہار)

'آذین' ڈاکٹر معظم عزم کا شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اپنے نام کی وجہ سے ہی چرچے میں رہا۔ اصل میں 'آذین' لفظ کم مستعمل ہے۔ اس کا استعمال شاذ و نادر ہی لوگ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی لغات میں اس لفظ کا معنی نہیں ہے۔ آذین اصل میں فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تزئین، سجاوٹ کے ہیں۔ یہ واقعہ صاحب کتاب ڈاکٹر معظم عزم کے ساتھ بھی پیش آیا اس لیے انھوں نے کتاب کے پیش لفظ میں اس لفظ کی تشریح کر دی ہے۔ پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں۔ آذین پلکوں کی نہیں آنسوؤں کی، آرائش محفلوں کی نہیں غموں کی، زیبائش جسم کی نہیں درد کی، سجاوٹ پھولوں کی نہیں غموں کی۔ اس طرح انھیں اپنی کتاب کے نام کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر معظم عزم شاعری بہت دنوں سے کر رہے ہیں لیکن کتابی صورت میں 'آذین' پہلی کتاب ہے۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظم بھی گاہے گاہے کہتے رہے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی ابتدا ایک نظم سے کی ہے جس کا عنوان ہے 'یاالٰہی یاالٰہی' اس نظم کا ایک بند دیکھیے۔

یاالٰہی یاالٰہی / چاند کے دریا سے بھر دے / رات کی خالی صراحی / یاالٰہی یاالٰہی

معظم عزم کے شعری مجموعے 'آذین' کا دیباچہ ڈاکٹر رفیق اعظم، سابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی، فارسی یونیورسٹی، پٹنہ نے لکھا ہے۔ وہ معظم عزم کے بارے میں لکھتے ہیں:

معظم عزم یاس، ناامیدی اور دل برداشتگی کے دور سے گزرے ہیں، لیکن وہ اس کے اندھیرے میں گم ہو کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ تاریکی کی دنیا سے ابھر کر آئے ہیں اور عزم پیہم کے ساتھ عزم کو واپس لے کر گھر آئے ہیں۔ ان کا یہ شعر اس بات کی واضح ترجمانی کرتا ہے۔

ناکامی کے دروازے سے　　عزم پیہم گھر لے آئے

معظم عزم کا شعری شوق پرانا ہے۔ وہ بہت دنوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ شاعری کے میدان میں جو چیز سب سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتی ہے، وہ ہے غزل، غزل کا دیوانہ ہر کوئی ہے۔ اردو کو سب سے زیادہ غزل کے لیے جانا جاتا ہے۔ غزل کی بات جب بھی آتی ہے تو میر و غالب کا ذکر آتا ہے۔ میر و غالب کے اشعار لوگوں کی زبان پر آجاتے ہیں۔ معظم عزم بھی غزل کے اثر سے نہیں بچ سکے۔ غزل کے لفظوں کے اسیر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مجموعہ کلام 'آذین' میں ہمیں غزلیں بھی نظر آتی ہیں۔ غزلوں میں معظم عزم نے نہ صرف پیار، محبت اور عشق کے مضامین باندھے ہیں بلکہ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کا بھی ذکر کیا ہے۔ چند اشعار دیکھیں۔

بے خطا رہ کے بھی الزام لیا ہے میں نے　　اس طرح دل سے بہت کام لیا ہے میں نے
دشمن تو سارے بچ گئے میں زد میں آ گیا　　اے دوستوں تمھارا نشانہ بھی خوب تھا
سانس گھٹتی ہو وہاں شرم کو چھوڑا جائے　　زندگی کے لیے ہر رسم کو توڑا جائے
جس میں خودداری پہ آنچ آنے کا ڈر ہوتا ہے　　مشورہ دل کا ہے اس رزم کو چھوڑا جائے

عزم کی غزلوں میں غم جاناں بھی جا بہ جا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک محبت بھرا دل عزم بھی رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اپنی غزلوں میں وہ اپنے دل کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

دیکھ ترے انتظار میں　　صدیاں کھڑی ہیں قطار میں
اک نظر کا سرور کافی ہے　　میں کبھی دربدر نہیں ہوتا

عزم نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے اور اچھی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ نظم کی وسعت کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ نظموں میں چند نظمیں یہ ہیں جن کے عنوان سے ہی نظموں کی خوبصورتی کا پتہ چلتا ہے۔ تجھے دل دیا، زندگی حسین ہے، کیا ہے یہ جذبہ، تجزیہ، وارفتگی، معجزہ، منزل خوباں وغیرہ۔

عزم کی نظموں کے چند بند

زندگی کے ورق پر سیاہی گری/ اور سارے فسانے کہیں کھو گئے/ آسماں بھی وہی
ہے زمیں بھی وہی/ یہ ستارے مگر اجنبی ہو گئے (فسانے کہیں کھو گئے)

ماں! ابھی تجھ سے میں ناراض نہیں ہو سکتا/ پھر مجھے حد سے تجاوز کا یہ حق بھی تو نہیں/
رونق زیست بھی تو نے لٹا دی مجھ پر/ اتنی دلدار و کرم پاش شفق بھی تو نہیں (ماں)

جل ترنگ شوخ طرح دار چوڑیاں/ دلنواز ہاتھوں میں شاہکار چوڑیاں

(چوڑیاں)

معظم عزم ایک نئی سوچ کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک تر و تازگی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کا انداز بیان متاثر کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ معظم عزم کے اس شعری مجموعے 'آذین' کا خیر مقدم کیا جائے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

خودنوشت

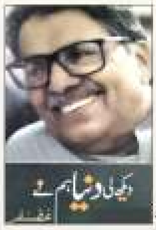

دیکھ لی دنیا ہم نے

مصنف: غضنفر علی

صفحات: 336، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: صغیر افراہیم، پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

'چتر لیکھا' کو ریکھا چتر کرنے والا فنکار جب یہ کہے کہ 'دیکھ لی دُنیا ہم نے' تو مسرت و شادمانی کے ساتھ حیرت و استعجاب کے بھی در وا ہوتے ہیں۔ زندگی کے سر ورق کا کتابی چہرہ، عملی زندگی میں بھی ہر دم مُسکراتا، خوشیاں بکھیرتا رہتا ہے۔ چھا جانے اور گھر کر لینے والا یہ چہرہ تو وبائی ایام (کووڈ 19) کے نفسا نفسی والے ماحول میں بھی تازہ دم رہا ہے۔ نئی نسل کے ماہر ڈاکٹروں کے مابین شب و روز بسر کرنے والے غضنفر دوسروں کے دُکھ درد میں شریک رہے ہیں، محض دلجوئی نہیں، مداوا کرتے ہوئے، تبھی تو یہ ادیب و فنکار محسن و مربی کہلایا ہے۔ اس بے حد ترقی یافتہ دُنیا میں ایسے بے لوث خدمت خلق کرنے والے تخلیق کار کم ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ مذکورہ خودنوشت کا یہ اہم سوال ہے، جو اس جانب بھی توجہ مبذول کراتا ہے کہ غضنفر کی اس مثالی تربیت میں اگر اُن کے والد محترم کی نگہبانی شامل ہے تو ڈاکٹر شہنا اور ڈاکٹر کامران کی پرورش و پرداخت میں مصنف نے بھی وہی روایت نبھائی ہے اور روایت کی ان دونوں کڑیوں کو ہر اعتبار سے پائیداری عطا کرنے والے نکھرے کا نام ہے، بشریٰ جس کے بغیر 'غضنفر' ادھورا ہے۔

ان روشن ستاروں کی کہکشاں کا مرکز و محور، خوشیاں بانٹتا، بکھیرتا ہے تو کتاب، کتابی چہرہ اور عنوان قاری کے ذہن پر دستک دیتا ہے، تجسس کو مہمیز کرتا ہے اور یہی گرید یکسوئی اور دلجمعی سے قرأت پر اُکساتی ہے۔ اس خودنوشت سوانح میں محبوبیت، نرگسیت ہے۔ آپ بیتی کو جگ بیتی میں تحلیل کرنے کا موثر انداز ہے۔ پیش کش کے اس فنکارانہ اظہار میں نہ تو زمانے کا خوف ہے اور نہ ہی احباب کی ناراضگی کا ڈر، نیز فنکار نے اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کا بھی کوئی جتن نہیں کیا ہے۔ اس بے باکی کی بنا پر روداد زندگی کے سفر کی حقیقت تخلیقی شکل میں جلوہ گر ہے۔

67 برس کے غضنفر 45 سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کی سرگرم علمی اور ادبی زندگی اس امر پر گواہ ہے کہ وہ ہمارے عہد کے ممتاز فکشن نگار، بلند پایہ خاکہ نویس اور معروف شاعر ہیں۔ درس و تدریس کے عمل میں بھی انھوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور اب خودنوشت سوانح 'دیکھ لی دنیا ہم نے' اُن کے ادبی تناظر و تفکر کی غماز ہے۔ سابقہ فن پاروں کی طرح غضنفر نے اسمیں بھی جدت و ندرت سے کام لیا ہے۔ 336 صفحات پر مشتمل اس تخلیق میں خاکہ، مرقع اور قلمی تصویر کی خوبیوں کو اس طرح ہم آمیز کیا ہے کہ چرند و پرند، حیوانات و نباتات اور در و دیوار بے جان اور ساکت نہیں بلکہ متحرک تصویروں کی شکل اختیار کرتے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مثلاً اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سولن (ہماچل پردیش) میں محض امر سنگھ نگاری ہی نہیں خمار آلود فضا اور سُرمئی اجالا بھی سرگوشیاں کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور یہی احساس ماضی کے در وا کرتا ہے۔ وابستہ یادوں کے دوش پر وقت گزر جاتا ہے، اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے حسین و طویل یادوں کا سلسلہ اور اس سلسلہ کے تمام نشیب و فراز کے لمس کو بھی قاری محسوس کر لیتا ہے۔ یہ قصہ کو بیان کرنے کا وہ ہنر ہے جس سے غضنفر بخوبی واقف ہیں۔

پہاڑوں کے فطری حسن اور نشیب و فراز کا منظر بدلتا ہے تو باغات کی بستی اور گومتی کا کنارا اُبھرتا ہے۔ وہاں کی لطافت، نزاکت اور شرافت کے سائے میں گنبدوں، محرابوں اور میناروں کا ذکر رومانس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چار باغ، قیصر باغ، شاہ نجف، فرنگی محل کے ساتھ مدن موہن مالویہ مارگ اور اس سے وابستہ ادبی ہلچل کی روداد ہی نہیں، تعبیر و تفسیر بھی آپ بیتی میں سمٹ آئی ہے، جس میں تہذیب کے مٹنے کا کرب بھی ہے۔ اس کرب جاں کو آپ بھی ملاحظہ کریں:

''مجھے کہیں بھی وہ لکھنؤ نہیں ملا جو میرے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ حضرت گنج میں صرف گنج رہ گیا تھا۔ قیصر باغ کیسر باغ ہو گیا تھا۔ امام باڑے گرد سے اٹ گئے تھے۔ بھول بھلیوں کی سرنگیں بند ہو گئی تھیں۔ بھول بھلیوں میں ہونے والا کھیل رک گیا تھا۔ امین آباد کی شام اداس پڑی تھی، قیصر باغ کی خوشبو ہوا ہو چکی تھی، نشاط گنج سے انبساط غائب تھی۔ ڈالی گنج کی ڈالی پھولوں سے خالی تھی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی''۔ (ص 219)

'دیکھ لی دنیا ہم نے' میں شخصیت چاہے بُوم فادر، احمد سورتی کی ہو، یا شہریار کی، ایسی مستحکم ہے کہ مشفقانہ شفقتیں صاف جھلکتی ہیں۔ یونس اسلم، رشید قریشی اور سعید الدین مینائی سے قربت ہے، محض شناسائی نہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی عبدالستار، نادر علی خاں اور سید محمد امین کے بیان میں محض سیرت نہیں، خارجی پہلوؤں تک رسائی ہے۔ خد و خال اور عادات و اطوار کا اظہار پر لطف انداز میں ہے۔ انھوں نے محض چہرہ بشرہ، رہن سہن اور طور طریق کو ہی نہیں ابھارا ہے بلکہ تہہ دار پہلوؤں سے بھی قاری کو اشاروں اشاروں میں واقف کرا دیا ہے۔ حقیقت اور تخیل کے توسط سے کہیں کہیں واقعہ میں حدود و اربعہ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وقت اور مقام کے ساتھ کرداروں کا رنگ و روپ، شخصی جھلکیاں، خواہشیں، آرزوئیں، نفسیاتی کیفیات اور برتاؤ بھی اجاگر ہوتا ہے۔ فضا و ماحول کی عکاسی ایک فطرت شناس کی طرح کی ہے۔ ہر جملے سے خلوص، محبت اور اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ احباب علی گڑھ کے ہوں یا کسی اور شہر کے، نہ بیجا تعریف، نہ غیر مناسب تنقید۔ جہاں جہاں طنز و مزاح در آیا ہے وہ بھی بے تکلفی کی دلیل ہے۔

غضنفر کی اس آپ بیتی میں ہوش سنبھالنے سے دورِ حاضر تک کی جھلکیوں میں چاہے وہ خود ہوں یا دیگر اشخاص قصہ، ہر اچھے برے پہلو کی خوبیوں اور کمزوریوں کو افسانوی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اس رنگ آمیزی میں خود کلامی بھی ہے اور استفہامیہ لہجہ بھی۔ ایک منظر کے بعد دوسرے منظر میں ربط ہے۔ سرشتِ جنوں کی ہو، حصول علم کی یا دورانِ

ملازمت کی، سبھی کے بیان میں تاثر، تخیل اور تفکر کو ہم آمیز کر دیا ہے۔

غضنفر کی اس دیکھی بھالی دنیا میں نہ تو شہر نگار خانہ چین ہے اور نہ اوراق مصور کی بستی مگر بستی مگر آثار اور افکار اس کے گواہ ہیں کہ اپنوں کی یہ بستی، بستے بستے بستی ہے، جس کے نقش و نگار کو منعکس کرنے میں غضنفر نے کمال ہنرمندی سے کام لیا ہے۔

تحقیق و تنقید

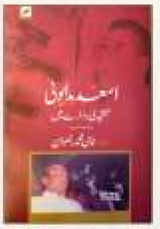

اسعد بدایونی تنقیدی دائرے میں

مرتب: خان محمد رضوان

صفحات: 467، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: راشد جمال فاروقی، C-6، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی 25

1980 کی دہائی کے اہم ترین شعرا میں اسعد بدایونی ایسا نام ہے، جس کا ذکر کیے بغیر اردو شاعری کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ اسعد بدایونی نے مواد، ڈکشن اور لہجے میں اپنی ایک علیحدہ چھاپ چھوڑی ہے۔ اس کی ہر غزل ہر لحاظ سے اسی کی ہے کہ جسے دور سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اسعد بدایونی انتہائی معتبر، منفرد اور ممتاز شاعر ہے۔ محض پینتالیس سال کی عمر میں اس نے جو سرمایۂ ادب چھوڑا ہے اس پر لکھا جاتا رہے گا لیکن ان کے سعادت مند شاگرد خان محمد رضوان نے اب تک تین کتابیں ان کے بارے میں لکھ کر اپنی سعادت مندی اور اسعد فہمی کا بیّن ثبوت فراہم کیا ہے۔ زیر نظر کتاب 'اسعد بدایونی تنقیدی دائرے میں' سے قبل 'اسعد بدایونی بحیثیت شاعر' اور 'جدیدیت کا مغنی: اسعد بدایونی' جیسی اہم کتب کے ذریعہ خان رضوان اسعد بدایونی کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل گفتگو کر کے ادب میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔

467 صفحات کی اس ضخیم کتاب کو عرشیہ پبلی کیشنز نے اپنے روایتی انداز سے نہایت خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مضمون 'حرف چند' کتاب کا اولین مضمون ہے جو اسعد فہمی کا دروازہ وا کرتا ہے۔ مرتب کے پاس اسعد مرحوم کی بابت کہنے کے لیے اتنا وافر مواد موجود ہے کہ 39 صفحات پر محیط طویل تر مقدمہ نہایت دلچسپ، مفید، معلوماتی اور تفصیلی ہونے کی وجہ سے مطالعہ کا اورجی کرتا ہے۔ اس مقدمہ میں خان رضوان کی سلیس زبان، رواں تذکرہ اور برجستہ پیرایۂ اظہار کی شگفتگی قاری کو باندھے رہنے میں کامیاب ہے۔ اس مقدمے کو نظر انداز کر کے آپ پوری کتاب سے انصاف نہیں کرسکیں گے۔ علمی خسارے میں رہیں گے سو الگ۔ ایک کامیاب وکیل کی طرح مرتب نے اپنے مقدمے کی زبردست پیروی کرنے کے لیے اسے چھ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں لفظ 'مقدمہ' کی وضاحت موجود ہے۔ جو طویل تو ہے لیکن علمی گفتگو کے درجے میں آتی ہے۔ پھر شعر کے متن کے شاعر اور قاری پر اثر انداز ہونے کی جو مختلف شکلیں ممکن ہیں ان پر مزے کی گفتگو کی گئی ہے۔ مقدمے کے تیسرے حصے میں جدید غزل میں اسعد کے مقام کے تعین اور شاعری کے علاوہ صحافت، ادارت، طنزیہ شاعری اور ان کی نظموں کے تعلق سے معلومات فراہم کی گئی ہیں، مقدمے کے چوتھے حصے میں خان محمد رضوان نے مضامین کی فراہمی میں ہونے والی مشکلات کا ذکر اور کچھ کرم فرما حضرات کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اس شدید صدمے کا تذکرہ بھی ہے، جس کے تحت اسعد کی بے وقت موت نے خان محمد رضوان کو نیم پاگل بنا دیا تھا۔ اور اسعد پر تحقیقی، تنقیدی کام کرنے کی تحریک بخشی تھی۔ مقدمے کے پانچویں حصے میں زیر تبصرہ کتاب کے عالم وجود میں آنے کی وجوہات بیان کی گئی ہیں اور چھٹے حصے میں مضمون نگار کے تعلق سے ذاتی، تاثراتی اور ادبی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ مقدمے کا مجموعی تاثر نہایت خوشگوار کیفیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ عام طور پر مقدمہ ایک مختصر سرسری اور ہلکی پھلکی تحریر کی شکل میں رائج ہے، لیکن خان محمد رضوان نے نہایت دل جمعی سے اپنا مقدمہ قائم کیا ہے۔ اسعد بدایونی کے دو اہم مضامین 'نئی غزل کا مزاج' اور 'نئی غزل میں اسالیب کا تنوع' شامل کر کے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ مضامین اسعد کی تنقیدی صلاحیتوں اور علمی بصیرت کی گواہی بھی دیتے ہیں۔

ہم عصر شعرا کے بہترین اشعار سے مزین یہ مضامین اس جدید غزل کے خدوخال اجاگر کرتے ہیں جس کی نمائندگی اسعد بدایونی کرتے ہیں۔ توصیف تبسم نے اسعد کے آخری غیر مطبوعہ شعری کلام سے بحث کی ہے۔ 'ورائے شعر' کے نام سے اسعد نے اپنا آخری مجموعہ کلام مرتب کر لیا تھا جس میں تہتر غزلیں ہیں نظم کوئی نہیں ہے۔ اسعد نے غزل کا جو لہجہ ایجاد کیا تھا اس کی نمائندگی یہ تہتر غزلیں کرتی ہیں۔ موت کی آہٹ سننے والے حساس شاعر کی یہ غزلیں شاعری کا اہم خزانہ ہیں۔ توصیف تبسم (پاکستان) نے اسعد کے اس غیر مطبوعہ کلام کے رگ و پے میں اتر کر جو مضمون رقم کیا ہے وہ اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہوگا۔ پروفیسر اصغر عباس اسعد کے استاد اور پروفیسر شہپر رسول ان کے ہم جماعت رہے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے اپنے طور پر، اپنے اپنے زاویے اور نظریے سے اسعد کو دیکھا اور دکھایا ہے۔ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ابرار رحمانی، راشد جمال فاروقی، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر شمس بدایونی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر عبد الحمید، تسلیم غوری، ڈاکٹر راشد انور راشد، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ذکاء الدین، شایاں، مشتاق، ڈاکٹر علاء الدین خان، ڈاکٹر قیصر زماں قیصر، ڈاکٹر احمد امتیاز، محمد معراج الدین اور عمران عظیم وغیرہم نے اسعد بدایونی کی زندگی اور ان کے فن کے تمام گوشوں کو منور کرنے والے مضامین سے اس کتاب کی اہمیت میں خاطر خواہ اضافے کیے ہیں۔ ان عالمانہ مضامین کے مطالعے کے بعد اسعد کی شخصیت اور ان کی شاعری کے تعلق سے تقریباً ہر اہم بات دائرہ تحریر میں آگئی ہے۔ تاکہ سند رہے اور وقتِ تحقیق و تنقید کام آئے۔ ان مضامین کا انتخاب بھی قابل داد ہے۔ اسعد بدایونی کی شناخت ایک منفرد اور یکتا غزل گو کے طور پر کی جاتی رہی ہے۔ ان کی نظموں پر بہت کم بات کی جاتی ہے۔ خان رضوان نے اس طرف خاص توجہ کی اور کتاب کے آخری حصے میں اسعد کی نظمیں شامل کر کے بڑا مستحسن کام کیا ہے۔ خصوصی طور پر اس جدت طرازی کے لیے خان رضوان کو مبارک باد دی جانی چاہیے۔ 'گزشتہ کل کا سبق'، 'شام زنگار'، 'پاگل ہوائیں'، 'حیرتوں کے سلسلے'، 'جب لمس کے سورج بجھ جائیں'، 'یہی بہت ہے'، جیسی نایاب اور خوبصورت نظمیں قاری کے ادبی ذائقے کو سہ دھارتی ہیں اور اس کی شعری صلاحیتوں کا مزید اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اسعد نے نظموں کے ساتھ بھی اتنا ہی انصاف کیا ہے۔ لطافت، تازگی، شگفتگی اور حزن و ملال کے تمام شیڈ متوازن طور پر ان نظموں میں گھل مل گئے ہیں۔

کتاب کے فلیپ پر خان رضوان کے والد محترم محمد علیم الدین خان صاحب کی نیک خواہشات کو شامل کر کے مرتب نے بالکل نئی روایت کی ابتدا کی ہے۔ جو ایک شروعات ہوسکتی ہے۔ آخری سر ورق پر اسعد بدایونی کے ہم جماعت پروفیسر شہپر رسول کے تاثرات درج ہیں جن میں اسعد کے شعری رویے کا ذکر بھی ہے اور خان رضوان کے علمی کارناموں کی توصیف بھی۔ زیر تبصرہ کتاب کی قیمت چار سو پچاس روپے ہے۔ اسعد شناسی میں اس اہم کتاب کا مطالعہ ضرور مددگار ثابت ہوگا۔ شوخ سرخ رنگ میں جاذب نظر سر ورق سے سجی یہ کتاب شائقین ادب کی ذاتی لائبریری کی زینت، وقعت اور وقار میں اضافے کا باعث ہوگی۔

اشتیاق سعید کے افسانے اور اہل قلم کے تجزیے

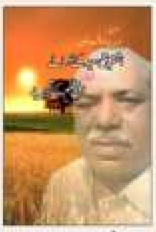

مرتبہ: زرینہ الماس
صفحات: 216، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی
مبصر: رفیق جعفر، رنجیت سنگھ کالونی، مقابل: تالونالبند گلی، پونے (مہاراشٹر)

غازی پور کی ہونہار، ادب شناس جواں سال قلم کار زرینہ الماس نے مشہور افسانہ نگار اشتیاق سعید کے منتخب افسانوں پر اہل قلم کے تجزیوں کی کتاب شائع کروا کے مستحسن قدم اُٹھایا ہے! میری نظر میں افسانہ نگار کے لیے یہ ضروری تھا کیونکہ افسانوں کی دُنیا میں اشتیاق سعید نے اپنی شناخت بنالی ہے... جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا کیسا اور کس طرح کا کام ہے مگر تجزیوں سے اور بھی ان کا افسانوی فن روشن ہوگا...! زرینہ الماس جو کہ خود مصنف کی قلم کاری سے متاثر ہیں، اس لیے بھی انھوں نے یہ کام موثر ڈھنگ سے کیا ہے۔ 'باتوں سے بنی باتیں' زرینہ کا ایک طویل مضمون شروعات میں شائع ہوا ہے۔ یہ اشتیاق سعید کی شخصیت اور فن کے کئی انکشافات قاری کے روبرو کر کے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ محترمہ نے ایک افسانے کا تجزیہ کر کے ادب شناسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

216 صفحات کی اس کتاب میں 15 افسانوں کے ساتھ تجزیے بھی شامل ہیں۔ تجزیہ نگاروں نے احسن طریقے سے افسانوں کو سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کچھ تجزیوں کا رنگ گہرا اور کچھ کا پھیکا ہے۔

اشتیاق سعید نے آٹھویں دہائی سے اپنا قلمی سفر اشتیاق سیفی اور اشتیاق زخمی کے ناموں سے شروع کیا پھر نویں دہائی کے وسط میں 'خرام' کانپور میں ان کا ایک افسانہ پڑھ کر مرحوم مشتاق مومن ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر آئے اور کافی حوصلہ افزائی کی ساتھ ہی نام پر اعتراض جتایا۔ انھیں کی ایما پر اشتیاق نے اپنے نام سے زخمی ہٹا کر والد محترم کا نام سعید جوڑ کر اشتیاق سعید کے نام سے لکھنے لگے۔ یہ نام کافی راس آیا اور بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ آج یہ نام عصری افسانے کا ایک اہم نام جانا مانا جاتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ان کے ہم عصر قلم کار محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر عشرت بیتاب، محمد حسین پرکار، ایس ایم عباس، ڈاکٹر عظیم راہی، ڈاکٹر اے جے مالوی، انور مرزا، عبدالباری ایم کے جاوید ندیم، معراج احمد معراج، ڈاکٹر فرقان سنبھلی، ڈاکٹر غضنفر اقبال، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ظہیر حسن ظہیر اور زرینہ الماس نے تجزیے لکھ کر عصری افسانے کے ایک اہم افسانہ نگار کے قلمی سفر کا اعتراف کیا... داد اور دعا سے نوازا!

میرا بھی جی چاہتا ہے کہ خوب لکھوں لیکن تبصرے کی محدودیت اس کی اجازت نہیں دیتی پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ اشتیاق سعید نے افسانے کی ہیئت میں بھی تجربے کیے۔ موضوعات میں بھی ماضی اور حال کے کسی افسانہ نگار کی تقلید کیے بغیر زندگی اور زمین کے مسائل کو سچائی کے ساتھ پیش کیا اور یہ بھی سچ ہے کہ اشتیاق سعید نے افسانے میں گاؤں کو نئی زندگی دی کیونکہ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی آج بھی گاؤں میں رہتی ہے۔ اس حقیقت کو سامنے لاکر اشتیاق سعید نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کو نہ صرف آئینہ دکھایا بلکہ انھیں حقیقت سے فراریت اور سچائی سے مُنہ موڑنے پر اپنے افسانوں کی کمان سے طنز کے تیر برسائے ہیں۔

میں اس کتاب کی اشاعت پر مرتبہ زرینہ الماس کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

فکشن

ٹوٹتی سرحدیں

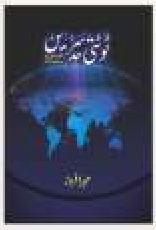

مصنفہ: مہر افروز
صفحات: 142، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: جنوری: 2021
ناشر: تریاق انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن ممبئی
مبصر: رئیس احمد شاہ، ریسرچ اسکالر، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

مہر افروز ایک ذہین اور اعلی تعلیم یافتہ افسانہ نگار ہیں جو عالمی سطح پر بھی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہیں۔ آپ نے افسانہ نگاری اور بلاگ نگاری کے علاوہ رسالہ 'خرمن' کی ادارت کے توسط سے بھی اپنی صحافتی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

'ٹوٹی سرحدیں' مہر افروز کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ زیر نظر مجموعے میں ادھوری عورت، دہشت گرد، کٹی پتنگ، ٹوٹتی سرحدیں، استاد، کچا گوشت، پل صراط، بھکوٹے، پھانگنی، جھوٹا سچ، بلی، بے چہرہ، سپنوں کے قاتل، By My Valentine، اور زندگی چل پڑی، ماں کی بولی، تعبیر تو، طلسماتی ٹوپیاں، ٹفن باکس، چتما ایکسپریس، بھگوان اور 'بدلاؤ' بالترتیب شامل ہیں۔ زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ میں کل 22 افسانے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مہر افروز کا پیش لفظ اور پرویز شہریار کا بیک ٹائٹل پر فلیپ بھی شامل ہے جس میں مہر افروز کے افسانوں کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غنی غیور، قیصر نذیر خاور، پروفیسر یونس حسن خان، پروفیسر نیامت علی مرتضائی اور ڈاکٹر مقصود حسینی نے بھی اس افسانوی مجموعے پر اظہار خیال فرمایا ہے۔

مہر افروز چونکہ معاشرتی اصلاح کی مشعل بردار ہیں، وہ اپنے افسانے انسانی سماج میں پائے جانے والے گمبھیر مسائل کی طرف توجہ دلانے کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ ان کا دردِ دل ان کے افسانوں کی زبان سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ کس قدر انسان کی خیر خواہ ہیں۔ وہ خیالستان کی دنیا سے اجتناب کرتی ہیں اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے گلی کوچوں سے گزرتی ہوئی خاردار بلند سرحدوں کو بھی عبور کرتی ہیں۔ ان کا حقیقت پسندانہ انداز ان کے افسانوں کی اہمیت کو چار چاند لگا دیتا ہے یہ افسانے ادب لطیف کا لطف بھی دیتے ہیں اور اصلاحی خطبے کی کمی بھی پوری کرتے ہیں۔ ان اخلاقی قدروں کی پامالی، ڈیجیٹل ترقی سے مادہ پرستی کا عروج اور تہذیبوں کا زوال، رشوت، بے حسی، بے ضمیری کا سماج میں اضافہ، مذہبی، علاقائی، نسلی اور سیاسی تعصب اور دشمنی وغیرہ جیسے موضوعات پر افسانوں کا تانا بانا بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانوں کے متعلق پرویز شہریار لکھتے ہیں "مہر افروز کے افسانوں میں ہر چند کہ براہ راست پند و نصیحت سے احتراز ملتا ہے تاہم ان کے افسانوں کے بین السطور میں بہ نظر غائر دیکھا جائے تو کہیں نہ کہیں تشکیل معاشرہ اور تعمیر اخلاق کا عنصر مضمر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے افسانے کے بیشتر موضوعات ایک دم نئے تو نہیں کہے جا سکتے لیکن ان میں نسائی حسیت اور عصری شعور کی آمیزش سے جس طرح کی فضا آفرینی کی جاتی ہے، وہ یقیناً انوکھی اور قابل تحسین ہوتی ہے۔"

مہر افروز کا بیانیہ بہت سلیس اور رواں ہے۔ افسانے کی زبان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ زبان شستہ اور آسان استعمال کی گئی ہے۔

زیر نظر افسانوں کے مجموعے میں شامل افسانوں کے عنوانات بھی پرکشش ہیں مثلاً ٹوٹتی سرحدیں، کٹی پتنگ، کچا گوشت، ادھوری عورت، طلسماتی ٹوپیاں وغیرہ۔ دو ملکوں کے درمیان قایم سرحدوں اور ان سرحدوں کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کے جذبات کی ترجمانی افسانہ 'ٹوٹتی سرحدیں' میں نظر آتی ہے۔ افسانہ 'کٹی پتنگ' میں مہر افروز

تمثیلی انداز سے دختران مشرق سے مکالمہ کرتی ہیں کہ مغرب کی نقل میں ازحد آزادی کی خواہش انھیں گندے نالے میں خس وخاشاک کی طرح بہالے جائے گی۔ لہذا آزادی کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہوا کے دوش پر اڑنے کی آرزو میں اپنی زمین کی کھردری سچائیوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔ افسانہ 'کچا گوشت' میں طوائفوں کی زندگی کے جاندار مرقعے اور تصویریں ملتی ہیں نیز ان کی محرومیوں اور المیوں کے ساتھ ان کی فطرت سمیت ان کے ایثار، قربانی اور رواداری کے جذبات کے مختلف حوالوں کو سمجھنے اور جاننے کا موقع ملتا ہے۔ مہر افروز نے اپنے افسانوں میں افسانے کے ضروری اجزا کا استعمال بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

افسانہ 'کھوٹے' میں سماج میں پھیلی برائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات وحادثات کو بالکل سادہ بیانیہ اور سلیس زبان میں کہانی کا رنگ دیا ہے۔ ان کہانیوں میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ عبرت اور نصیحت کے عناصر بھی پوشیدہ ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہیں کہ ان کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں۔ وہ موضوع کو برتنے کا ہنر جانتی ہیں اور موضوع کی ضرورتوں کے مطابق افسانوی کرداروں کے خدوخال اجاگر کرنے کا سلیقہ بھی انھیں آتا ہے۔

مجموعی طور پر 'ٹوٹتی سرحدیں' اردو افسانوں کے ذخیرے میں ایک مستحسن اضافہ کہا جاسکتا ہے۔

مرحلے محبت کے

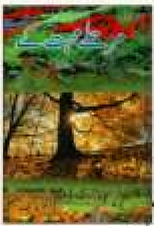

مصنف: عاکف سنبھلی

صفحات: 288، قیمت: 177 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: کتابی دنیا، ترجمان گیٹ، دہلی

مبصر: زنیرہ سنبل، 10180، گلی گندھک والی، آزاد مارکیٹ، دہلی 6

آج اردو ناول نگاری کا سفر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا عرصہ... سلسلہ ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہوکر شرر، مرزا رسوا، پریم چند، قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ زیر تبصرہ ناول 'مرحلے محبت کے' بھی اسی تخلیقی سفر کا ایک نشان ہے۔ ڈاکٹر عاکف سنبھلی کا نام تخلیق وتحقیق کے حوالے سے خاصا معروف ہے۔ وہ نظم ونثر دونوں کے ماہر اور پوری طرح اردو زبان وتہذیب کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔

اس ناول کو مصنف نے خود ہی کیمپس ناول قرار دیا ہے اور اس کا میدان عمل ہندوستان کی مایہ ناز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا باوقار ادارہ ہے۔ یہاں ایک شریفانہ محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے اور اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ کہانی کے دونوں اہم کردار سنبل اور التمش علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے طلبا ہیں اور یوپی کے شریف اور خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فیملی کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ والدہ تو نرم مزاج اور شفیق تھیں ہی والد صاحب بھی متحمل مزاج، ملنسار اور خوش طبع تھے۔ غرض کہ یہ اچھا اور معقول گھرانہ تھا۔ اس لیے شہر میں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شیخ صالح محمد عبداللہ ایک کامیاب بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی، تعلیمی اور سماجی وادبی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ رفاہی اداروں میں وقت دیتے، ان کی سرپرستی کرتے، کمزور اور مستحق لوگوں کی دل کھول کر امداد کرتے۔

دوسری طرف سنبل بھی سہارنپور شہر کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والی اور باحیا دوشیزہ ہے جو اتفاقاً التمش سے شعبۂ اردو کے باہر ٹکرا جاتی ہے۔

''اوسط درجہ کا خوشحال گھرانہ تھا۔ والد کا نام محمد عبدالرزاق تھا، والدہ کا نام زینت افروز، بہن کا نام ماہ رخ تابندہ، دو بھائی آفاق محمد رزاق اور شایان محمد رزاق تھے۔ سنبل نے گریجویشن تو اپنے ہی شہر سے کیا تھا، اب پوسٹ گریجویشن کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئی تھی۔ گھر کا ماحول قدرے مذہبی تھا، اس لیے انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو منتخب کیا تھا۔''

کہانی کی ابتدا یونیورسٹی میں داخلوں کے درمیان تعارف سے ہوتی ہے، چونکہ دونوں کے مزاج اور ذہن کافی یکساں ہیں اس لیے آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔

''سچ بتاؤ سنبل! جو کچھ تم نے مجھ سے کہا یہ دل کی آواز ہے؟ یا پھر بے دلی سے ادا کیے ہوئے چند جملے؟''

وہ خاموش ہوگئی۔ وفور حیا سے اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ باہر بارش ہورہی تھی۔ سبھی لوگ جاچکے تھے۔ ریڈنگ حال میں پوری طرح سناٹا ہوچکا تھا۔''

شعر وشاعری کی فضا، دوستی سے محبت میں تبدیل ہونے کے عمل، یونیورسٹی کے خوشگوار اور صاف ستھرے ماحول کی عکاسی اور اردو تہذیب کی تصویریں اس ناول میں صفحہ در صفحہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کہانی میں اس وقت بحران پیدا ہوتا ہے۔ جب التمش اور سنبل دونوں کی ایم اے کی تعلیم مکمل ہوجاتی ہے اور دونوں کے اپنے اپنے وطن واپس لوٹنے کا وقت آجاتا ہے۔ سنبل کا وطن سہارنپور ہے۔ جہاں اس کے والد کا بزنس ہے۔ دوسری التمش مرادآباد سے تعلق رکھتا ہے جہاں اس کا پیتل (Brass) کا کاروبار ہے۔

''سنبل یونیورسٹی سے گھر آگئی تھی۔ یہ دوسرا موقع تھا، جب وہ علی گڑھ سے سہارنپور آئی تھی۔ یوں تو پہلے بھی اس کو وہاں کی یاد آئی تھی، مگر اس مرتبہ اس کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ وہاں کے اساتذہ، ساتھی، کلاس روم کی باتیں، بالخصوص فرح اور التمش کی باتیں تو اس کو بہت ہی یاد آتی تھیں۔ التمش کی یاد نے اس کو بے چین وبے قرار کررکھا تھا۔ رہ رہ کر اس کی باتیں اور یادیں اس کو تڑپا جاتیں۔ اس کا پیار بھرا چہرہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا۔''

دونوں طرف خاندانی عزت اور وقار کا سوال ہے۔ اس لیے دونوں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی خوشی یا ارمان باقی نہیں ہے لیکن دونوں اپنی آرزوؤں کو خاندانی وقار پر قربان کردیتے ہیں کیونکہ ان کے گھرانوں میں ماحول اس قدر دقیانوسی ہے کہ اعلی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی تو ہے لیکن اپنی مرضی سے شریک حیات بنانے کی آزادی نہیں ہے۔

''التمش تمھیں ہمارے یہاں کا ماحول معلوم نہیں۔ شادی کے تعلق سے لڑکی کا زبان کھولنا یا کچھ بھی معلوم کرنا ہمارے یہاں معیوب سمجھ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی پریشانی ہے کہ میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں مگر گھر کی عزت کے لیے اپنی زبان نہیں کھول سکتی۔ اپنی دنیا اجڑتی ہوئی دیکھ سکتی ہوں مگر صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کرسکتی۔''

''اس نے ایک سانس میں یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں''

تاہم ناول کے آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ دولہا دلہن یہی دونوں ہیں اور اس طرح ناول کا خاتمہ خوشگوار ہوتا ہے۔ یہ ناول علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پرانی فضا میں لکھا گیا ہے اور پرانی تہذیب اور اردو کلچر کی یاد تازہ کردیتا ہے۔ بڑے شہروں کے باشندوں کو یہ ناول دقیانوسی محسوس ہوسکتا ہے لیکن یوپی کے کلچر کی حقیقی عکاسی ضرور کرتا ہے۔

مضامین

مطالعہ شعار

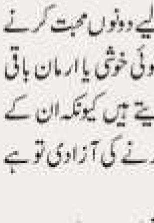

مصنف: حافظ کرناٹکی

صفحات: 292، قیمت: 300 روپے، اشاعت: فروری 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: عظمت النساء، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر امجد حسین حافظ کرناٹکی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا لیکن وہ

بچوں کے ادیب کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ حافظ کرناٹکی نے بچوں کے لیے بہت ہی عمدہ نظمیں، غزلیں اور کہانیاں تخلیق کیں۔ وہ بچوں کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ غزل اور رباعی گو بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نثر نگار اور بہترین نقاد بھی ہیں۔ اب تک حافظ کرناٹکی کی تقریباً 94 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں زیادہ تر کتابیں بچوں کے ادب سے متعلق ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'مطالعہ شعاز' حافظ کرناٹکی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس کو انھوں نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ 'سراج ومنهاج' ہے اس میں سات مضامین شامل ہیں: (1) نعتیہ شاعری کے تقاضے (2) نعتیہ شاعری... ہم عصر صورت حال (3) ابرار کرت پوری کی نعت گوئی کا اختصاصی مزاج (4) ڈاکٹر شاداب ذکی کی نعتیہ شاعری کے تشکیلی عناصر (5) ماہِ رمضان کی تکمیل اور عید کی سچی خوشی (6) الحاج غفار شاہ مرحوم کی سیرت شناسی (7) نیر ربانی کے عالمانہ مکالموں پر طائرانہ نظر۔ اس باب میں مصنف نے نعتیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بہت ہی اہم نکات واضح کیے ہیں۔

دوسرا حصہ 'باغ اطفال' ہے۔ یہ حصہ چھ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں مصنف نے ادب اطفال کے مفاہیم، مقاصد اور تناظر پر تفصیلی بحث کی ہے، علاوہ ازیں بچوں کے شاعر شوکت پردیسی، عبدالرحیم نشتر اور ظہیر عرفان کا مختصر تعارف اور ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ ادب اطفال کی تخلیق سے متعلق حافظ کرناٹکی لکھتے ہیں:

''بچوں کے لیے جو کتابیں لکھی جائیں ان میں بچوں کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم، ان کی نفسی تربیت، ان کے عقائد کی پختگی اور ان کے تخیل کی پرواز کا بھرپور خیال رکھا جائے، کیونکہ کتاب اپنے مواد کی صفائی اور افادیت کے اعتبار سے جتنی مفید ہوتی ہے۔ اپنے مواد کی خرابی کی وجہ سے اتنی نقصان دہ بھی ہوتی ہے۔''

تیسرا حصہ 'نخل آرزو' ہے۔ اس میں تیرہ مضامین شامل ہیں۔ اس باب میں مصنف نے نوید ملک کی نظم 'ہواؤں کے قبیلے' اور محمد سراج الدین کی کتاب 'سو عظیم مسلم سائنسداں' پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ضیا کرناٹکی، احمر جلیسری، مقبول منظر، صابر فخرالدین، سید نفیس دسنوی، الحاج ایم، اے، حمید عکسی، عبدالمتین جامی، تاج الدین شاہد کی شاعری پر مفصل گفتگو کی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر شبینہ طلعت کے ناقدانہ پہلوؤں سے عمدہ بحث کی ہے۔

چوتھا باب 'سراج منیر' سے منسوب ہے۔ اس میں ایک مضمون 'علامہ اقبال' شامل ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں شاعر مشرق علامہ اقبال کے خاندان کا مختصر تعارف کراتے ہوئے اقبال کی تعلیم، ابتدائی شاعری، حب الوطنی اور ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لیا ہے۔

پانچواں حصہ 'روشن چراغ' ہے۔ اس میں چار مضامین شامل ہیں (1) ہندوستان کی جدید تعلیم کا سچا نقیب... بابائے تعلیم ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (2) الامین رتنا ڈاکٹر سبحان شریف (3) سید محبوب علی صاحب... عزم واستقلال کی روشن مثال (4) اک آفتاب علم ہوا ہے غروب آج۔

چھٹا حصہ 'ادراک واحساس' ہے۔ اس میں بھی چار مضامین شامل ہیں۔ (1) عید کی سچی خوشی (2) جشن پچاس سالہ ہے یہ الامین کا (3) ریاست کا اہم ترین اخبار، روزنامہ سالار (4) اساتذہ کی شخصیت و ذمہ داری اور اردو اسکولوں کی ترقی۔ اس باب میں مصنف نے رمضان کے مہینہ کی برکتوں کو بیان کیا ہے ساتھ ہی رمضان کے تینوں عشروں کی بنیادی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اور عید کی حقیقی مسرتیں حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اس کے علاوہ محمود ایاز کے جاری کردہ اخبار 'روزنامہ سالار' کی انفرادیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ حافظ کرناٹکی نے اساتذہ کی شخصیت اور ان کی ذمہ داریوں کی طرف چند اشارے کیے ہیں ساتھ ہی اسکولوں کی ترقی کے لیے بعض اقدامات بھی بتائے ہیں۔ اس باب کا یہ مضمون بہت ہی اہم ہے۔ ظاہر ہے کہ بچے مستقبل کے معمار ہوتے ہیں اس لیے انھیں بہترین تعلیم سے آراستہ کرنا بڑوں کا فرض ہوتا ہے۔ بچوں کی شخصیت سنوارنے میں ہمارے اساتذہ کا اہم رول ہوتا ہے۔ ایک اچھا استاد کیسا ہونا چاہیے حافظ صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اچھا استاذ وہ ہوتا ہے جس کے آس پاس علم کی روشنی پھیلی رہتی ہے۔ ان کے علم، حلم اور ان کی شخصیت کی بے غرضی کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ استاذ کی شخصیت میں بہر حال ایسی کشش ہونی چاہیے کہ بچے ہی نہیں ان کے والدین اور سماج کے دوسرے لوگ بھی ان کے پاس کھنچے چلے آئیں۔''

ساتواں اور آخری حصہ 'خطبات' ہے۔ اس میں چار خطبے شامل ہیں، جو حافظ صاحب نے الگ الگ مقامات پر مختلف مواقع پر دیے۔ (1) سالانہ جلسہ مدرسہ مدینۃ العلوم (2) الامین یوم اردو (3) اردو مزاح نگاری اور دوماہی ظرافت (4) بموقع تقسیم انعامات۔

کل ملا کر 'مطالعہ شعاز' بہترین اور معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ امید ہے کہ حافظ کرناٹکی کی یہ کتاب بھی دیگر تصانیف کی طرح ادبی حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

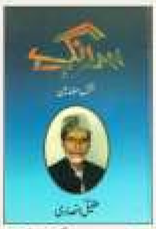

سب رنگ (منتخب مضامین)

مصنف: طفیل انصاری

صفحات: 312، قیمت: 187 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: سید تنویر حسن نقوی، محلہ کشتیان، امروہہ

سب رنگ، جناب طفیل احمد انصاری کے مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے اس میں چار ابواب میں مضامین کو تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب میں 8 مضامین ہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں: شاہ محمد عبدالعلیم آسی (حیات وفن) شاہ تیم الحسن غبار جونپوری، راجہ ہری ہردت دوبے رنگین جونپوری، شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی، یادگار داغ، متین مچھلی شہری، ہادی مچھلی شہری پر ایک نظر، فدائی جونپوری، اختر واسطی جونپوری۔

باب دوم میں بھی 8 مضامین ہیں ان کے عناوین یہ ہیں: عظیم آباد اور حفیظ جونپوری، شاد عظیم آبادی اور حفیظ جونپوری، رنگ میر اور حفیظ جونپوری، اردو غزل گو شعرا میں حفیظ جونپوری کا مقام، شفیق جونپوری کی قومی شاعری، شفیق جونپوری، شخصیت اور فن (تبصرہ)، عزیز ربانی جونپوری، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی (حیات وفن)

اسی طرح تیسرے باب میں جو 8 مضامین شامل ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں: اردو شاعری میں تضمین، اشعار کی بازگشت، برمحل اشعار اور ان کے ماخذ، پیراہن گل کا شاعر، اثر انصاری، یاد آتے ہیں.....شوکت پردیسی، خوش فکر وخوش گفتار شاعر، معصوم انصاری، مختار عاشقی کی نعتیہ شاعری، گلستان رحمت کا شاعر رحمت مچھلی شہری

باب چہارم میں بھی 9 مضامین شامل ہیں اور ان کے عناوین یہ ہیں: سید محمد مہدی جونپوری بانی مہدویت تحریک، مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری، سر شاہ محمد سلیمان، ایس ایم عباسی (افسانہ نگار ادیب وشاعر) مرے ہمدم، محمد خلیل البیلا فن کار، محمد جمشید تعلیمی نکات پر ایک نظر، وامق جونپوری، شخص اور شاعر۔

سب رس کے بعض مضامین نادر معلومات کا عمدہ خزینہ ہیں اور ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب طفیل احمد انصاری نے اس موضوع پر اچھا مطالعہ کیا ہے۔ دوسرے سب رس کے تمام ہی مضامین کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس میں طفیل احمد صاحب

نے پوری طرح سادگی اور عجز وانکساری سے کام لیا ہے۔ بعض ناقدین کی طرح کہیں بھی اپنی علمیت اور وسیع مطالعہ کا رعب نہیں جھاڑا ہے۔ ان کی ساری باتیں ان کے دل سے نکلی ہوئی ہیں، اس لیے قاری کو پوری طرح متاثر کرتی ہیں۔

سب رس کے اکثر مضامین کے بعد طفیل انصاری صاحب نے مضامین کے حوالوں یعنی ماخذ کی جو نشاندہی کی ہے اس سے نہ صرف ان کے وسیع تر مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ کچھ لکھنے سے پہلے اس موضوع کے تمام ماخذ و مصادر کا بغور مطالعہ کیا جائے پھر اپنی رائے مثبت انداز میں پیش کی جائے، تبھی مضمون یا مقالہ کا صحیح معنوں میں حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس منصب کو جناب طفیل احمد انصاری نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ مولانا کرامت علی جون پوری اور حفیظ جون پوری وغیرہ مقالات اسی بات کی واضح دلیل ہیں۔

سب رس کے اکثر مضامین سے جون پور کا بھی اچھا تعارف ہمیں حاصل ہو جاتا ہے۔ طفیل احمد انصاری نے یہ تمام ہی مضامین مختلف اوقات میں لکھے ہیں، اس وجہ سے جہاں جہاں جون پوری فن کاروں کا تذکرہ ہے اس کی تمہید میں جون پور کا تعارف موجود ہے، اس لیے جونپور کے تعارف میں سب رنگ میں تکرار ہے جو ایک مجبوری ہے۔

محترم طفیل احمد انصاری صاحب کے اس مجموعہ مضامین 'سب رنگ' سے جونپور کی ادبی، صحافتی اور دیگر فنون لطیفہ پر اچھی معلومات حاصل ہوتی ہے اور جونپور کی ادبی حیثیت نکھر کر آتی ہے۔ راقم الحروف کے مطابق طفیل احمد انصاری صاحب کا یہ صرف اہل جون پور پر ہی احسان نہیں ہے بلکہ اردو ادب میں بھی ان کا یہ کارنامہ ایک دستاویزی حیثیت کا حامل رہے گا۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ محترم طفیل احمد انصاری صاحب پیشے کے اعتبار سے اردو کے آدمی نہیں بلکہ سائنس کے استاذ ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک سائنس کے استاذ نے اردو زبان وادب کی اتنی خوبصورت خدمت انجام دی۔ میں محترم طفیل احمد انصاری صاحب کے لیے پروفیسر عبدالحق صاحب کی رائے کی تصدیق کرتے ہوئے اپنی بات پوری کرتا ہوں۔ محترم پروفیسر عبدالحق صاحب کی رائے ملاحظہ ہو:

شاہان شرقی کے مرکزی شہر جون پور کی علمی و ادبی شخصیات اور متعلقات پر نظر رکھنے والے طفیل احمد انصاری جیسے لوگ نایاب ہیں۔ ان کے مشاغل مختلف اور مزاج متنوع ہے، وہ شہر کے مقامی کالج میں سائنس کی درسیات سے وابستہ رہے مگر تحریر و تالیف تمام تر تخلیق کے لیے وقف رکھی۔ جون پور اور نواح کے ادیب و شاعر اور اکابرین دانش کی خدمات کا تجزیہ ان کے حسن تحریر کا عنوان رہے۔

خاکے

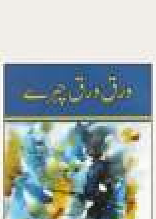

ورق ورق چہرے

مصنف: منظور وقار

صفحات: 304، قیمت: 186 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: ڈاکٹر خالدہ بیگم

صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ ڈگری کالج گلبرگہ (کرناٹک)

دکن کے معروف مزاح نگار و خاکہ نگار جناب منظور وقار کے لکھے ہوئے 50 طلائی خاکوں کا مجموعہ 'ورق ورق چہرے' شائع ہو کر اتنی ساری معتبر ادبی شخصیات کی سیرت اور انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے نقوش کو قارئین کے دلوں پر ثبت کر رہا ہے۔

اس کتاب کے مضامین کو چار عنوانات کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ 'انتساب' منظور وقار نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کے نام کر کے ان سے اپنی محبت کا خوب اظہار کیا ہے۔

کتاب کا پہلا عنوان 'ترتیب' ہے جس میں پہلا نام پروفیسر مقبول احمد مقبول کا ہے جنھوں نے دو رباعیوں کے ذریعے منظور وقار کے فن کی خصوصیات کو بیان کر کے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

منظور وقار کے یہ جو خاکے ہیں دلچسپ زبان میں حسین نقشے ہیں
تصویر ابھرتی ہے ہر اک خاکے سے گویا یہ سب 'ورق ورق چہرے' ہیں

ڈاکٹر انیس صدیقی نے منظور وقار سے اپنی دلی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سادگی، شرافت، ان کی خاکہ نگاری کی خصوصیات کو بہترین انداز میں پیش کر کے 'ورق ورق چہرے' پر تبصرہ نگاری کا فریضہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے منظور وقار کو 'خاکوں کا معجز' قرار دیا ہے۔ کتاب کے پچھلے ورق پر مشہور ادیب دانشور جناب وہاب عندلیب صاحب کے تاثرات کو پیش کیا گیا ہے جس میں انھوں نے منظور وقار کو برق رفتار قلمکار اور پر لطف خاکہ نگار قرار دیا ہے۔

منظور وقار پر ڈاکٹر غضنفر اقبال کا لکھا ہوا مضمون 'فنافی الادب' منظور وقار کی پوری زندگی ان کی شخصیت اور ان کے فن کی خصوصیات کو بحسن وخوبی اجاگر کرتا ہے۔ واجد اختر صدیقی صاحب نے منظور وقار کی خاکہ نگاری پر مختلف مشاہیر ادب کے تاثرات کو 'مشاہیر کی سوچ ترنگ' کے عنوان سے پیش کیا ہے جس میں منظور کے لکھے ہوئے مشہور خاکوں پر 16 مشاہیر ادب کے قلمی تاثرات ملتے ہیں جو ان کے فن خاکہ نگاری کی اہمیت کو متعین کرتے ہیں۔

دوسرا عنوان 'آفتاب ہیں ہم لوگ' ہے جس کے تحت منظور وقار نے اپنے قریبی 29 صحافی، ادیبوں و شعرا پر جو بقید حیات ہیں 'خاکے لکھے ہیں۔ پہلا خاکہ دکن کی معروف علمی و ادبی شخصیت ڈاکٹر وہاب عندلیب پر ملتا ہے۔

ڈاکٹر وہاب عندلیب صاحب پر لکھا ہوا یہ سوانحی خاکہ انکے متعلق مکمل معلومات فراہم کرتا ہے۔ منظور وقار نے شگفتہ الفاظ میں اردو کی ایک قد آور شخصیت کی ایسی دلآویز تصویر بنائی ہے جو بے مثال ہے۔ پروفیسر حمید سہروردی پر لکھا ہوا منظور وقار کا خاکہ نہ صرف ان کی شخصیت بلکہ ان کی پسندیدہ چیزوں کے علاوہ کتابوں کے ذوق، ان کی افسانہ نگاری کے وسیع کینوس کو ابھارتا ہے۔ اس خاکے میں غضنفر اقبال کو چلتے پھرتے اور حمید سہروردی کو کتب و رسائل کے درمیان مطالعہ میں غرق دیکھ سکتے ہیں۔ خاکہ نگار کا یہ کہنا بجا ہے کہ: ''حمید سہروردی افسانوی کائنات کے اس شہنشاہ کا نام ہے جس کی سلطنت کو زوال نہیں'' (45)

اردو کے ممتاز صحافی، جدید شاعر و کالم نگار حامد اکمل پر لکھا ہوا منظور وقار کا خاکہ حامد اکمل کی صحافتی و ادبی زندگی کا بھر پور احاطہ کرتا ہے اسکو پڑھ کر حامد اکمل کی ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جس میں وہ انتھک محنت کرنے والے صحافی اور اپنے ادبی دوستوں کی مہمان نوازی کرنے والے مخلص دوست کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ یہ خاکہ حامد اکمل کی ہر دل عزیز شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال جنھوں نے برسوں اپنے رسالے 'شگوفہ' کے ذریعے اردو میں طنز و مزاح کے مضامین میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی دیرینہ صحافتی خدمات کا اعتراف منظور وقار نے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال پر خاکہ لکھ کر کیا ہے۔ یہ خاکہ ایک مکتوب کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ 'شگوفہ' کے خصوصی شماروں اور جن شخصیات پر نمبر نکالے گئے ہیں ان کی ساری تفصیلات اس خاکے کے ذریعہ سے بہم پہنچائی گئی ہیں۔

ڈاکٹر جلیل تنویر پر لکھا ہوا منظور وقار صاحب کا خاکہ ان کی پوری شخصیت اور ادبی کارناموں سے متعارف کرواتا ہے ساتھ ہی پرانے دور کے سرکاری دفاتر کے فرنیچر کی حالت زار کی بھی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔

منظور وقار کا بہت ہی شگفتہ انداز میں پروفیسر عبدالحمید اکبر پر لکھا ہوا خاکہ پروفیسر صاحب کے وسعت مطالعہ، مختلف محفلوں کی نوعیت سے لباس کے انتخاب، ان کی نعت خوانی، علمی و ادبی مصروفیات کے علاوہ خاکہ نگار کے متعلق بھی کافی معلومات فراہم کرتا

ہے۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر کی ہمہ جہت صلاحیتوں کے اعتبار سے خاکہ نگار نے انھیں چلتی پھرتی منی یونیورسٹی کا خطاب دیا ہے۔

بے باک ادیب وصحافی عزیز اللہ سرمست جنھوں نے گلبرگہ سے ’روزنامہ بھمنی نیوز‘ نکال کر اپنی ایک علیحدہ شناخت بنائی ہے۔ اب کے بی این ٹائمز کے مدیر کی حیثیت سے مقبول عام ہیں۔ منظور وقار نے ان پر خاکہ لکھ کر ان کی دیانتدارانہ صحافت، ان کی محنت اور ذہانت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

منظور وقار نے اردو کے خاموش خدمت گزار ڈاکٹر انیس صدیقی پر جو خاکہ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے انھیں انیس صدیقی کی فعال ادبی شخصیت، ان کی صحافتی اور ادبی خدمات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ منظور وقار نے اردو کے ایک متحرک قلم کار، محاسبہ نگار، اردو ادب کی کئی اہم شخصیات کے فن کے مختلف گوشوں کو کتابی شکل میں منظر عام پر لانے والے کئی کتابوں کے مرتب ڈاکٹر غضنفر اقبال پر خاکہ لکھ کر ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔

’ورق ورق چہرے‘ کے دوسرے حصے میں ’فسانہ ہیں ہم لوگ‘ عنوان کے تحت 21 مرحوم ادبی شخصیات کے خاکے ملتے ہیں۔ جن میں سے پہلا خاکہ مجتبیٰ حسین پر ملتا ہے۔ منظور وقار نے مجتبیٰ حسین کو بجا طور پر طنز و مزاح کا تاج محل قرار دیا ہے۔

پروفیسر لئیق صلاح پر لکھے ہوئے خاکے میں استاذی محترم کی شخصیت اور ان کی خاکہ نگاری کے نقوش کو شگفتہ انداز میں اجاگر کرکے ان کے قلم کی فنکارانہ چابکدستی کی مثالیں بھی پیش ہیں۔ منظور وقار کی کتاب کا آخری باب ’لاجواب ہیں ہم لوگ‘ ہے۔ جس میں مشاہیر ادب کے مختصر خاکے انھوں نے پیش کیے ہیں چند مثالیں حاضر ہیں ملاحظہ کیجیے:

’’ابن صفی: ابن صفی تو چلے گئے ہمارے درمیان فریدی، عمران اور حمید چھوڑ گئے۔‘‘ (ص 293)

مشتاق احمد یوسفی: ’’مقبول ترین مزاح نگار۔ عرف لفظوں اور محاوروں کا سمندر‘‘ (ص 294)

شمس الرحمٰن فاروقی: ’’اردو ادب کا ایفل ٹاور‘‘ (ص 295)

لئیق صلاح: ’’ملکہ طنز و مزاح جنکی تحریروں میں طنز و مزاح کے موتی ستاروں کی طرح جگمگاتے ہیں‘‘ (ص 299)

یہ مختصر ترین خاکے منظور وقار کے مشاہدات اور ان کی قیافہ شناسی کا بین ثبوت ہیں۔ یہ منفرد انداز انھیں خاکہ نگاری کے فن کی بلندیوں تک ضرور پہنچا دے گا۔

رسائل و جرائد

سہ ماہی ’دبستان ہمالہ‘ ڈائجسٹ

ترتیب وتہذیب: فاروق مضطر

اکتوبر تا دسمبر 2021

رابطہ: وارڈ 9، ہمالین کیمپس

راجوری (جموں) 185131، موبائل نمبر: 9419184689

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی۔ 25

’دبستانِ ہمالہ‘ نے مختصر عرصے میں جو ہمالیائی بلندی طے کی ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے۔ یہ فاروق مضطر کے عشق وجنون کا ثمرہ ہے کہ مجلاتی صحافت کے باب میں اسے بہت جلد شناخت مل گئی۔ یہ مجلّہ اتنا جاذب اور دیدہ زیب ہے کہ پہلی نظر میں ہی اس کا عکس ذہن میں نقش ہو جاتا ہے۔ پیشکش اور مشمولات دونوں ہی متاثر کن ہیں۔ اردو اور انگریزی سیکشن میں مضامین کا انتخاب مدیران اور مرتبین: فاروق مضطر، شہریار، طارق علی میر کے حسن ذوق کا ثبوت ہے۔ اس مجلّہ کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ ’ادبیات ہمالہ‘ کے عنوان سے ایک بیش قیمت گوشہ ہے جس سے جموں کشمیر جیسی زرخیز سرزمین سے تعلق رکھنے والے ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور فنکاروں کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اکتوبر-دسمبر 2021 کے شمارے میں مہاتما گاندھی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، ماسٹر رام چندر اور دلیپ کمار کے حوالے سے اہم تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ یہ وہ شخصیات ہیں جو ہمارے لیے مثال اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں، خاص طور پر موہن داس کرم چند گاندھی کی مثالی شخصیت اور ان کا طرز فکر ہمارے لیے قابل تقلید ہے۔ ’مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تاریخی تقریر‘ بھی اس مجلّے کا حصہ ہے۔ میزائل مین آف انڈیا بھارت رتن ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام (سابق صدر جمہوریہ ہند) پر بھی ایک بیش قیمت تحریر شامل ہے جس سے ان کی شخصیت کے بہت سے اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ اے پی جے عبدالکلام کے جو اقوال زریں ہیں وہ ہمیں روشنی اور راستہ بھی دکھاتے ہیں۔ ماسٹر رام چندر کا تعلق دلی کالج سے تھا۔ ان کی شخصیت بھی غیر معمولی تھی۔ انگریزی سیکشن میں ان پر ایک وقیع مضمون شامل ہے اور اس مضمون کی ضرورت یوں بھی تھی کہ ہماری نسل یا ہمارا عہد ماسٹر رام چندر جیسی عبقری شخصیت کو فراموش کرتا جا رہا ہے۔ انگریزی سیکشن میں شہنشاہ جذبات دلیپ کمار پر بھی ایک مضمون شامل کیا گیا ہے جس میں کشمیر اور دلیپ کمار کے حوالے سے قیمتی معلومات درج ہیں۔ ادبیات ہمالہ کا گوشہ اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ اس سے ہمیں اس علاقے سے تعلق رکھنے والی بہت سی شخصیتوں کے آثار وافکار سے آگہی ہوتی ہے۔ اس شمارے میں پرتپال سنگھ بیتاب، مظفر ایرج، خورشید بسمل کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان مقتدر شخصیات کے تعلق سے مشاہیر ادب کے مختصر تاثرات بھی ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب ایک اچھے شاعر ہیں، خاص طور پر نظم کے باب میں ان کا نام نمایاں ہے۔ ان کی بہت ساری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ گو کہ وہ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروسز سے وابستہ رہے ہیں پھر بھی تخلیق سے ان کا رشتہ قائم رہا۔ مظفر ایرج بھی ایک منفرد لب ولہجے کے شاعر تھے جو سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے مگر ابجد، انکسار، ثبات، دل کتاب جیسے شعری مجموعوں سے انھوں نے ادبی حلقے میں اپنی الگ پہچان قائم کی۔ خورشید بسمل بھی ایک اچھے شاعر ہیں۔ ’ابرنیساں‘ ان کا شعری مجموعہ ہے۔ ان کے تعلق سے حامدی کاشمیری، ایاز رسول نازکی، پروفیسر ظہورالدین کے مختصر تاثرات کے علاوہ جاوید انور کی تحریر شامل ہے جس سے ان کی شخصیت کے اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

’فکر صحت‘ کے عنوان سے ڈاکٹر نذیر مشتاق کا ایک مضمون ’ڈپریشن‘ کے حوالے سے ہے۔ اس مضمون کی اہمیت اور معنویت ہمارے عہد میں اس لیے بھی زیادہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں بہت سے افراد ڈپریشن کے شکار ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی زندگی بے رنگ، بے کیف سی ہوگئی ہے۔ اعجاز الحق نے تجسس، ذوق، زبان، تنقید اور آزادی کے تعلق سے بہت ہی اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ جس کے اندر یہ پانچ عناصر ہوتے ہیں وہ سائنسداں بن سکتا ہے۔ مولانا وحیدالدین خان جیسی جینئس شخصیت کے حوالے سے اردو اور انگریزی سیکشن میں کئی اہم تحریریں ہیں جن سے مولانا وحیدالدین خان کے تعمیری ذہن اور مثبت طرز فکر کا پتہ چلتا ہے۔ مجموعی طور پر ’دبستانِ ہمالہ‘ ایک مختلف اور منفرد نوعیت کا مجلّہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مجلاتی صحافت کے باب میں یہ رسالہ زریں تاریخ رقم کرنے میں کامیاب ہوگا۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

نئے سال میں نئے عزائم کے ساتھ قومی اردو کونسل فروغِ اردو کی سرگرمیاں جاری رکھے گی: شیخ عقیل احمد

سال نو پر قومی اردو کونسل میں تہنیتی پروگرام، مالیگاؤں اردو کتاب میلے کے کامیاب انعقاد پر اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید اور معاون عملہ کی پذیرائی

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں نئے سال کی مناسبت سے ایک تہنیتی پروگرام کا انعقاد ہوا جس میں خطاب کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے تمام عملہ کو نئے سال کی مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ’سال گذشتہ‘ کورونا اور دیگر کئی چیلنجز سے گھرا رہا اس کے باوجود کونسل کی تمام سرگرمیاں حسب سابق جاری رہیں اور فروغ اردو کے لیے ہماری تمام اسکیمیں چلتی رہیں، جس کے لیے تمام اسٹاف خصوصی طور پر لائق ستائش ہیں۔ شیخ عقیل نے کہا کہ نئے سال کی شروعات میں اومیکرون نامی کورونا کے ویریئنٹ نے ہمارے سامنے نئے خطرات پیدا کردیے ہیں مگر اس سے گھبرانے کے بجائے نئے عزائم اور منصوبوں کے ساتھ ہم نئے سال کی شروعات کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارا کارواں اسی طرح اردو زبان و ادب کی ترقی اور اس کی ترویج کے لیے سرگرم رہے گا۔ اس موقعے پر مالیگاؤں میں کونسل کے چوبیسویں قومی اردو کتاب میلے کے کامیاب انعقاد پر انھوں نے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر و میلہ انچارج اجمل سعید اور میلے کے دیگر اسٹاف کو گلدستہ پیش کرکے مبارکباد دی اور کہا کہ میلے کے انعقاد سے قبل ناگفتہ بہ حالات تھے چنانچہ میلے کی پہلی مجوزہ تاریخیں ملتوی کرنی پڑی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ دوسری تاریخوں میں بھی میلے کا انعقاد نہیں ہو پائے گا مگر وزارت تعلیم اور مالیگاؤں کی مقامی انتظامیہ کی مدد سے ہم مالیگاؤں میں تاریخ ساز کتاب میلہ کروانے میں کامیاب رہے، جس میں مالیگاؤں کے علاوہ مہاراشٹر، گجرات، تلنگانہ، کرناٹک وغیرہ سے لاکھوں کی تعداد میں شائقین کتب نے شرکت کی اور کروڑوں روپے کی کتابیں خریدیں۔ انھوں نے کہا کہ مالیگاؤں کتاب میلے کی اس کامیابی میں وہاں کی انتظامیہ اور میلہ کمیٹی کے ساتھ اجمل سعید صاحب کا اہم رول ہے جنھوں نے اس میلے کی کامیابی کے ساتھ انعقاد کے لیے رات دن ایک کرکے

محنت کی، جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور مالیگاؤں قومی اردو کتاب میلہ 2021 اب تک کا کونسل کا سب سے کامیاب میلہ ثابت ہوا ہے۔ میلہ انچارج و اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید نے بھی ڈائرکٹر کونسل، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، مالیگاؤں میلہ انتظامیہ اور اپنے معاون اسٹاف کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) کمل سنگھ اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی نے بھی کتاب میلے کے کامیاب انعقاد پر اجمل سعید اور ان کے معاونین کو تہنیت پیش کی اور تمام عملے کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 جنوری 2022

قومی اردو کونسل میں ڈاکٹر تقی عابدی کی تین کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں کنیڈا میں مقیم معروف ادیب و محقق ڈاکٹر تقی عابدی کی تین کتابوں 'کلیاتِ فراق کامل'، 'مطالعۂ رباعیات فراق گورکھپوری'، 'بالمکند بے صبر' کا کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد، معروف افسانہ

نگار شموئل احمد اور مشہور شاعر ملک زادہ جاوید کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر شیخ عقیل احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی کو مبارکباد پیش کی اور ان کی ادبی و تحقیقی خدمات کا تعارف کروایا اور کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی رات دن تحریر و تحقیق میں سرگرم رہتے ہیں اور لگاتار ان کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اسی سلسلے کی ان کی یہ تین کتابیں ہیں۔ وہ جس موضوع پر لکھنا چاہتے ہیں اس پر ہر پہلو سے تحقیق کرتے ہیں، پھر لکھنا شروع کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ادب کے کسی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، ہر موضوع پر قابل قدر تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے۔ وہ جس موضوع پر کام کرتے ہیں اس کے ماہر بن جاتے ہیں، یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے۔ یہ دنیا بھر میں اردو ادب کے سفیر بھی ہیں، جہاں بھی اردو پر بات ہوتی ہے وہاں ان کا کسی نہ کسی حوالے سے تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ یہ میرے لیے شرف کی بات ہے کہ اردو کے اتنے بڑے ادیب و مصنف کی تین کتابوں کے اجرا کا موقع ملا۔ شموئل احمد نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی تنقیدی بصیرت کا میں ایک عرصے سے قائل ہوں۔ ان کے دل میں اردو کا درد ہے، وہ اسے پوری دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔ میں ان کتابوں کی اشاعت پر انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ ملک زادہ جاوید نے تقی عابدی کی ادبی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی نئی بستیوں میں کوئی بھی ادبی مجلس تقی عابدی کے ذکر سے خالی نہیں رہتی۔ یہ میرے لیے خوشی کا مقام ہے کہ ان کی تین کتابوں کے اجرا کی تقریب میں شمولیت کا موقع ملا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی کونسل، دیگر مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور تینوں کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو اکیسویں صدی کے ترقیاتی دور میں محفوظ رکھنے اور فروغ دینے کے لیے بڑوں کے تجربات سے استفادہ ضروری ہے، اسی طرح نئے اسکالرز اور محققین کے لیے ضروری ہے قدیم ادبا و شعرا کی باقیات کی تحقیق و تجزیے پر خاص توجہ دیں اور انھیں منظر عام پر لانے کی فکر کریں۔ انھوں نے اپنی مرتبہ کلیاتِ فراق کامل سے سامعین کو منتخب اشعار بھی سنائے اور فراق کے شعری و ادبی امتیازات پر بھی روشنی ڈالی۔ اسی طرح غالب کے شاگرد بالمکند بے صبر کی ادبی خدمات پر بھی گفتگو کی۔

اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ندیم احمد اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر احمد امتیاز نے بھی ڈاکٹر عابدی کو مبارکباد پیش کی۔ تقریب میں کونسل کا عملہ بھی شریک رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 دسمبر 2021

اردو ڈپلومہ ہولڈرز کو دیے گئے سرٹیفکیٹ

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اردو زبان میں ایک سالہ ڈپلومہ کے سرٹیفکیٹس جی سی ٹی اردو اکیڈمی کے کسرول واقع اردو اسٹڈی سینٹر میں طلبہ و طالبات میں تقسیم کیے گئے۔ سیشن 21-2020 میں اردو زبان میں ڈپلومہ پاس کرنے والے 78 طلبہ نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو یادگاری نشانات بھی دیے گئے۔ مہمان خصوصی ضیاء الرحمٰن ڈائرکٹر آکسفورڈ پبلک اسکول نے کہا کہ اردو ایک بہترین زبان ہے جسے سیکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس میں بہت مٹھاس ہے۔ اسٹڈی سینٹر کی انچارج نیلوفر صدیقی نے بتایا کہ سیشن 21-2020 میں 26 طلبہ اور 52 طالبات نے اردو زبان میں ڈپلومہ کیا ہے، جنھیں آج سند دی گئی ہے۔ اسٹڈی سینٹر کی استانیوں کو بھی ان کی خدمات پر یادگاری نشانات سے نوازا گیا۔ پروگرام میں شارف حسین، تنظیم شاستری، نشاں، گلشن، رابعہ وغیرہ نے تعاون کیا۔ صدارت معراج خالد نے اور نظامت شاہویز اقبال نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جنوری 2021

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

قومی اردو کونسل و یوپی اردو اکادمی کا مشترکہ پروگرام

لکھنؤ: لکھنؤ کے ادب اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کی شہرت پوری دنیا میں ہے۔ لکھنؤ کے نوابوں نے دیگر فنون کے علاوہ شعروادب کی خاص سرپرستی کی جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ رہن سہن، لباس وطعام کے معاملات میں بے حد نفاست پسند اور شعرو

ادب کے دلدادہ بن گئے۔ یہاں کے ادب و ثقافت کے صرف اطراف کے لوگ ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر خطے کے لوگ بھی ہمیشہ گرویدہ رہے ہیں۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یہاں یوپی اردو اکادمی کے آڈیٹوریم میں کہیں۔ وہ قومی اردو کونسل اور اترپردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد ادبی و ثقافتی پروگرام، تمثیلی مشاعرے اور چہار بیت کے افتتاحی سیشن سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل اور یوپی اردو اکادمی دونوں کے مقاصد ایک ہیں۔ دونوں کا مقصد اردو ادب اور ہندوستانی ثقافت کا فروغ ہے۔ انھوں نے یوپی اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد اس پروگرام کے لیے چیئرمین اکادمی، سکریٹری و دیگر ارکان کی ستائش کی۔ اس سے قبل خلیل الرحمن ایڈوکیٹ نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ لفظ ترسیل کا ذریعہ ہے۔ الفاظ کے ذریعے قاری کے ذہن تک معانی کی رسائی ہوتی ہے۔ انھوں نے اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی اور سنسکرت کی ادبیات کے اہم ثقافتی نقوش کے حوالے بھی دیے۔ بطور خاص عربی اور ایرانی شاعری کے ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے میگھ دوت کے ثقافتی ورثے کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب سماج سے جو روشنی کشید کرتا ہے اس کے اظہار کی ایک صورت ثقافت بھی ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے ثقافتی بیانیہ اور اردو ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ موضوع ہمارے ادب، تاریخ اور وجود سب سے عبارت ہے کیونکہ ثقافت ہماری زندگی کی مختلف صورتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ افتتاحی سیشن کی صدارت صدر یوپی اردو اکادمی چودھری کیف الوریٰ نے کی۔ بطور مہمانان اعزازی سکریٹری یوپی اردو اکادمی زہیر بن صغیر، ڈاکٹر ماہ طلعت، ڈاکٹر رضوانہ، نجے مشرا شوق، ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی نے شرکت کی۔ نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ محسن خاں نے شکریہ ادا کیا۔ دوسرے سیشن میں تمثیلی مشاعرہ ہوا جسے ڈاکٹر سعید علم نے تحریر کیا تھا۔ مشاعرے میں ڈائرکٹر ڈاکٹر سعید عالم نے بطور ناظم مشاعرہ اکبر الہ آبادی کا کردار ادا کیا۔ 'اکبر الہ آبادی' کی نظامت میں منعقدہ تمثیلی مشاعرہ نے مرحوم شعرا کو مجسم کردیا اور سامعین دم بخود ہوکر محظوظ ہوتے رہے۔ علامہ اقبال، جگر مرادآبادی، نازش پرتاپ گڑھی، دشینت کمار، سبھدرا کماری، مہادیوی ورما، مجاز، دنکر، سمترا نندن پنت، چکبست وغیرہ کو اداکاروں نے سامعین کے سامنے مجسم پیش کردیا۔ تیسرے سیشن میں چہار بیت کا پروگرام ہوا جسے رامپور اکھاڑہ نے پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' 23 دسمبر 2021

ڈاکٹر رش اختر: حیات و ادبی خدمات

رانچی: جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی میں 19 دسمبر بروز اتوار ہوٹل دی کین میں یک روزہ سمینار بہ عنوان 'ڈاکٹر رش اختر: حیات و ادبی خدمات' کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے مالی تعاون سے کریٹیو میشن، جھارکھنڈ کے زیر اہتمام ہوا جس کے مہمان خصوصی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر رش اختر ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جن کا سفر ڈورنڈہ کالج رانچی کے لیکچرر سے شروع ہوکر رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تک رہا۔ انھوں نے بہت ساری اردو ادب کی کتابیں لکھیں۔ سمینار کی صدارت

رانچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر انوار احمد خان نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں اپنے سینئر ڈاکٹر رش اختر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس تقریب کے مہمان اعزازی کوڈرما کے سابق ڈی ڈی سی جناب حسیب اختر و رانچی کے ڈپٹی ایس پی نوشاد عالم تھے۔ نظامت کے فرائض سمینار کے روح رواں شاعر نصیر افسر نے بخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر راجدھانی رانچی کے شاعر، مضمون نگار، افسانہ نگار، جناب نصیر افسر و سماجی خدمت گار حسیب اختر کو بدست مہمان خصوصی لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ سمینار میں رانچی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کلیروی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ سمینار دو حصوں میں تقسیم تھا۔ پہلا حصہ افتتاحی سیشن تو دوسرا تکنیکی سیشن تھا۔ تکنیکی سیشن کی صدارت رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر کہکشاں پروین نے کی۔ ڈاکٹر مقبول منظر (گڑھوا)، ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل (ہزاری باغ)، جناب امتیاز غدر (دھنباد)، ڈاکٹر عالمگیر ساحل (رانچی)،

جناب کامیشور پرساد سریواشتو (رانچی)، جناب شیدائی (صاحب گنج)، جناب ہدایت اللہ و جناب دانش ایاز (رانچی) نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے پیغام کو جناب دانش ایاز صاحب نے تمام حاضرین کو پڑھ کر سنایا۔ اخیر میں کوی ایٹومیشن جھارکھنڈ رانچی کی سکریٹری محترمہ محمودہ تبسم نے مہمان خصوصی، مہمان اعزازی، صدر محفل اور تمام مقالہ نگار وشہر رانچی کے معزز حاضرین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ فاروقی تنظیم، رانچی، 20 دسمبر 2021

اُردو قصیدہ نگاری میں سودا کا مقام و مرتبہ

جموں و کشمیر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے نظامتِ فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر میں حامدی کاشمیری یادگاری سالانہ اُردو توسیعی خطبہ بعنوان 'اُردو قصیدہ نگاری میں سودا کا مقام و مرتبہ' کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں نامور ناقدین اساتذہ کرام، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات نے حصہ لیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر نذیر احمد ملک نے

کی۔ پروفیسر فاروق احمد مسعودی (ڈین علمی امور، جامعہ کشمیر) بحیثیت مہمان ذی وقار پروگرام میں موجود رہے۔ مہمانِ اعزازی کے طور پر پروفیسر قدوس جاوید آن لائن موڈ میں شاملِ محفل رہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر الطاف انجم نے سرانجام دیے۔ اس کے علاوہ مختلف شعبہ جات سے ادبی ذوق رکھنے والے اساتذہ صاحبان، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات نے بھی اس پروگرام میں شرکت کی۔ نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے ناظمِ اعلیٰ پروفیسر طارق احمد چستی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرکے پروگرام میں شریک تمام خواتین وحضرات کا استقبال کرنے کے ساتھ ساتھ نامور استاد اور محقق پروفیسر نسیم احمد جنھیں اس آن لائن توسیعی خطبے کے لیے مدعو کیا گیا تھا اُن کا بھی والہانہ استقبال کیا۔ اس کے بعد پروفیسر فاروق احمد مسعودی (ڈین علمی امور، جامعہ کشمیر) نے سامعین وحاضرین کو اپنے افتتاحی کلمات سے نوازا۔ توسیعی خطبے کے مقرر پروفیسر نسیم احمد کا تعلق بنارس ہندو یونیورسٹی سے رہا ہے۔ ظہور احمد گنائی (ریسرچ اسکالر) نے مہمان مقرر کا مفصل تعارف کرایا۔ پروفیسر نسیم نے اپنی عالمانہ مہارت اور بصیرت سے اس موضوع پر مدلل بحث کی جس سے تمام شرکا، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات مستفید ہوئے۔ پروفیسر نذیر احمد ملک نے صدارتی خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے پروگرام کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر زور دیا کہ آئندہ ایسے کلاسیکی موضوعات پر بحث ومباحثے ہونے چاہئیں تاکہ آنے والی نسل اپنی کلاسیکی اصناف سے روشناس ہوسکے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر الطاف انجم نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر، اردو ڈائرکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف کشمیر، 21 دسمبر 2021

اکبرالہ آبادی کی ادبی خدمات

نئی دھلی: الائیڈ وومن ویلفیئر ایجوکیشن سوسائٹی کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مشترکہ تعاون سے فاطمہ بارات گھر موجپور میں اکبرالہ آبادی کی ادبی خدمات پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت حاجی محمد صغیر اور نظامت محمد نعیم انصاری نے کی۔ شمع افروزی مفتی سہیل احمد قاسمی، سید ریاض الحسن، ڈاکٹر ایم کیو نیر شکیل احمد، محمد ناصر اور پروگرام کے کنوینر نفیس احمد نے کی۔ اکبرالہ آبادی کی ادبی خدمات پر ایک کتابچے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ باغ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر سید ریاض الحسن نے کہا کہ اردو شعرا کے نام سے ان کی اردو خدمات کے اعتراف میں تقریبات کا انعقاد جگہ جگہ ہونا چاہیے جن میں نسل نو کی شرکت کو یقینی بنایا جائے تاکہ ان کی دلچسپی بھی اردو لکھنے پڑھنے میں ہو اور اسی کا نام اردو کی ترویج وترقی ہے۔ نفیس احمد نے کہا کہ اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے انگریزی تہذیب اور حکومت کو اپنی ظریفانہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم نے عزم کیا ہے کہ اردو کی ترویج وترقی کے لیے اردو شعرا پر ان کی اردو خدمات کے اعتراف میں سیمینار کے انعقاد کا سلسلہ شروع کریں گے جس میں طلبہ وطالبات کی شرکت کو یقینی بنا کر ان کی تعلیمی کارکردگی پر حوصلہ افزائی کی جائے گی انھوں نے کہا کہ ہماری سوسائٹی کے تحت مستحقین کا ہر ممکن تعاون کیا جاتا ہے اور خاص طور پر غریب بچوں کی تعلیم وتربیت اور ان کی ہر ممکن خیر خواہی کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ایم کیو نیر اور ڈاکٹر اعجاز انصاری، ڈاکٹر سرفراز، شکرار حسین، ڈاکٹر ایم آر خان اور حافظ کوثر علی نے بھی اکبرالہ آبادی اور ان کی ادبی خدمات پر مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 دسمبر 2021

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

ادب معاشرے کی فکر و روایت کا جزوِ لاینفک ہے: نائب صدر

نئی دہلی: نائب صدر ایم وینکیا نائیڈو نے اظہار رائے کی آزادی کا ذمے داری سے استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے دوسروں کے

عقیدے یا جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچنی چاہیے۔ نائب صدر جمہوریہ نے ہفتے کے روز ساہتیہ اکادمی آڈیٹوریم میں بھارتیہ گیان پیٹھ کی 33ویں مورتی دیوی ایوارڈ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوامی تقاریر میں الفاظ کی شائستگی کی پیروی کی جانی چاہیے۔ ادیبوں اور مفکرین سے معاشرے میں فکری گفتگو کی توقع کی جاتی ہے۔ اس سے تنازعہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ ہندی کے نامور مصنف وشوناتھ پرساد تیواری کو ان کے شاندار کام 'آستی اور بھاوتی' کے لیے اس سال کے مورتی دیوی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اس موقعے پر مسٹر نائیڈو نے ادیبوں اور مفکرین کو قوم کا فکری مرکز قرار دیا اور کہا کہ وہ اسے اپنے تخلیقی نظریات اور ادب سے مالا مال کرتے ہیں۔ انھوں نے 'لفظ' اور 'زبان' کو انسانی تاریخ کی اہم ترین ایجاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ ادب معاشرے کی فکر و روایت کا جزو لاینفک ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک سماج جتنا زیادہ مہذب ہوگا، اس کی زبان اتنی ہی بہتر ہوگی۔ سماج جتنا بیدار ہوگا، اس کا ادب اتنا ہی وسیع ہوگا۔ ملک کے وسیع لسانی تنوع کی تعریف کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے اسے ہندوستان کی قومی طاقت قرار دیا جس نے ثقافتی اتحاد کو مضبوط کیا ہے۔ مسٹر نائیڈو نے ہندوستانی زبانوں کے درمیان رابطے بڑھانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ سبھی کو دوسری ہندوستانی زبانوں کے کچھ مخصوص الفاظ، محاورے اور مبارکبادیاں سیکھنی چاہئیں۔ انھوں نے اسے ملک کے لسانی اور جذباتی اتحاد کے لیے یہ کوشش قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہر ہندوستانی زبان 'قومی زبان' ہے اور قومی میڈیا کو تمام ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب کو مناسب جگہ دینی چاہیے۔ انھوں نے ادیبوں سے ملک میں ثقافت کے ذریعے اخلاقی خوبیوں کو زندہ کرنے کی اپیل کی۔ مذہب کے معنی بتاتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ دھرم دھرم نہیں ہے، بلکہ یہ ہم سب کا فرض ہے۔ انھوں نے کہا ''اگر کوئی اپنے فرائض ایمانداری سے ادا کر رہا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں محب وطن ہے''

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 دسمبر 2021

کتاب پڑھنے کے جذبے کو فروغ دینے کی ضرورت: وزیر اعظم

نئی دہلی: وزیراعظم نریندر مودی نے ڈیجیٹل دور میں لوگوں کی اسکرین کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان میں بھی کتابوں کی طرف لوگوں کی دلچسپی بڑھانے پر زور دیتے

ہوئے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ سال 2022 میں اپنی پسند کی پانچ کتابیں خریدیں اور اس پر تبادلہ خیال کریں تا کہ دوسروں کو کتابوں کی طرف راغب کیا جاسکے۔

مسٹر مودی نے آل انڈیا ریڈیو پر اپنے ماہانہ پروگرام 'من کی بات' میں لوگوں سے یہ اپیل کی۔ تلنگانہ سے تعلق رکھنے والے 84 سالہ ڈاکٹر کوریلا وٹھلا چاریہ کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وٹھلا چاریہ کی بچپن سے ہی خواہش تھی کہ وہ ایک بڑی لائبریری کھولیں۔ ملک تب غلام تھا، کچھ حالات ایسے تھے کہ بچپن کا خواب پھر خواب ہی رہ گیا۔ وقت کے ساتھ وٹھلا چاریہ لیکچرار بن گئے، تیلگو زبان کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور انھوں نے بہت ساری کتابیں بھی تخلیق کیں۔ 7-6 سال پہلے انھوں نے ایک بار پھر اپنا خواب پورا کرنا شروع کیا۔ انھوں نے لائبریری کا آغاز اپنی کتابوں سے کیا۔ اپنی زندگی کی کمائی اس میں لگا دی۔ آہستہ آہستہ لوگ اس میں شامل ہو کر حصہ ڈالنے لگے۔ یا دادری بھوانا گیری ضلع کے رمنا پیٹ ڈویژن کی اس لائبریری میں تقریباً 2 لاکھ کتابیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وٹھلا چاریہ جی کہتے ہیں کہ پڑھائی کے سلسلے میں جتنی مشکلات کا سامنا انھیں کرنا پڑا۔ اس کا سامنا کسی اور کو نہیں کرنا چاہیے۔ وہ آج یہ دیکھ کر بہت خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ طلبا کی ایک بڑی تعداد اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ ان کی کوششوں سے متاثر ہو کر دوسرے کئی گاؤں کے لوگ بھی کتابیں اکٹھی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ہندوستان بہت سی غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال ہے، جن کی تخلیقی صلاحیت دوسروں کو کچھ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ وٹھلا چاریہ جی اس کی ایک مثال ہیں کہ جب آپ کے خوابوں کو پورا کرنے کی بات آتی ہے تو عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 دسمبر 2021

اردو میں سوانح اور سفرنامہ نگاری

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام دو روزہ بین الاقوامی ویبینار بعنوان 'اردو میں سوانح اور سفرنامہ نگاری' منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پاکستان کے ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر تحسین فراقی نے کہا کہ اردو میں سفرنامہ نگاری کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ 'عجائبات فرنگ' نہ صرف اردو کا پہلا سفرنامہ ہے بلکہ سفرنامہ کے تقاضوں کو بڑی حد تک پورا بھی کرتا ہے۔ اس سفرنامے میں معلومات کا اتنا خزانہ ہے کہ کئی زاویوں سے اس کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔ معروف تاریخ داں پروفیسر ہربنس مکھیا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سفرنامہ یا سوانح نگاری میں میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہم تاریخ کی ایسی باتوں کا پتہ لگا لیتے ہیں، جو درباری تاریخ میں نہیں ملتی۔

افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ایک ایسے موضوع پر مذاکرہ کیا جس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں دی جاتی۔ اس اجلاس کی مہمان خصوصی ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے کہا کہ سفرنامہ میری دلچسپی کا موضوع ہے، میں ان دنوں غالب کے سفر کلکتہ کو نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ہمارے یہاں سفر وسیلہ ظفر کا رجحان بہت پہلے سے موجود ہے۔ سوانح اور سفرنامہ غیر افسانوی اصناف میں ایسی صنفیں ہیں جنھیں حقیقی معنوں میں بین العلومی اصناف کہا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ان اصناف پر ہماری توجہ کم ہی گئی ہے، لہٰذا ہم نے یہ فیصلہ کیا ان اصناف پر ان افراد سے لکھنے کی فرمائش کی جائے، جو اس کا استحقاق رکھتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس کے بعد 'فن سوانح نگاری' پر دو اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی، اس اجلاس میں پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر نسیم الدین فریس اور ڈاکٹر معید رشیدی نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر سراج اجملی اور ڈاکٹر مشرف علی نے مقالات پیش کیے۔ 5 دسمبر کو 'سفرنامہ' کے موضوع پر تین اجلاس منعقد ہوئے۔ اس دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر انور پاشا نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر شافع قدوائی اور ڈاکٹر ثروت خان نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر یعقوب یاور نے کی، اس میں پروفیسر ابن کنول، پروفیسر مظہر احمد اور نظیر احمد گنائی نے مقالات پیش کیے۔ آخری اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی اور اس میں ڈاکٹر یحییٰ نشیط، ڈاکٹر جمیل اختر اور ڈاکٹر امتیاز احمد نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 دسمبر 2021

دھلی

تھنکنگ وِد غالب

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پروفیسر الطاف انجم اور پروفیسر امت بسولے کی انگریزی کتاب تھنکنگ وِد غالب پر ایک آن لائن مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر الطاف انجم ممتاز ماہر اقتصادیات ہیں، پروفیسر امت بسولے عظیم پریم جی یونیورسٹی بنگلور میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ دونوں کی مشترکہ تصنیف 'تھنکنگ وِد غالب' جورولی بک دہلی سے شائع ہوئی ہے، ان دنوں علمی حلقوں میں بہت مقبول ہو رہی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ اس آن لائن مذاکرے میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر ہربنس مکھیا نے کتاب کے علمی اور فکری پہلوؤں پر گفتگو فرمائی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب کی شاعری میں ہمیں ہر شے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ وہ سیدھی اور حتمی بات نہ خود کہتے ہیں اور نا کسی کی کہی بات پر یقین کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ غالب کی شاعری کی عصری معنویت کو ان دونوں مصنفین نے جس طرح سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس سے ہماری بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ پروفیسر ہربنس مکھیا نے کہا کہ غالب کا مزاج سوال کرنے کا ہے، سوال کرنا اور سوال پوچھنا الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ غالب سوال پوچھتے نہیں بلکہ کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہی غالب کی شاعری کا حاوی رجحان ہے اور اس موضوع پر کتاب میں دلچسپ اور معلوماتی گفتگو ملتی ہے۔ ہمیں پروفیسر الطاف انجم اور پروفیسر امت بسولے کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ ان کی وجہ سے ایک عمدہ کتاب ہمارے مطالعے میں آئی۔ پروفیسر الطاف انجم نے کہا کہ غالب کی شاعری زندگی کے مختلف موقعوں پر ہمارا ساتھ دیتی ہے لیکن شرط یہ ہے ہم بھی ان کی شاعری کو اپنی زندگی میں وہ مقام دیں جس کی وہ مستحق ہے۔ پروفیسر امت بسولے نے کہا کہ غالب کی شاعری میں جرأت مندی مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ وہ ہمارے عہد میں اگر یہی باتیں کرتے تو شاید لوگوں کے لیے اسے برداشت کرنا مشکل ہوتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ پروفیسر الطاف انجم اور پروفیسر امت بسولے کا میدان بظاہر ادب نہیں ہے لیکن انھوں نے غالب کو جس وسیع اور نئے تناظر میں دیکھا ہے وہ بہت غیر معمولی اور قابل ستائش ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 دسمبر 2021

جدید عربی شاعری

نئی دھلی: جدید عربی شاعری کے نئے رجحانات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، عربوں نے مغربی ادبیات سے جتنا کسب فیض کیا ہے، اس کی مثال دیگر زبانوں میں نہیں ملتی، عربی شاعری زندگی کی توانائیوں اور رعنائیوں سے بھرپور ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام شعبے کے سیمنار ہال میں منعقدہ 'جدید عربی شاعری' کے موضوع پر منعقدہ توسیعی خطبہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر فوزان احمد نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ عربی شاعری میں اقدار حیات، سماجی زندگی کی عکاسی، حقیقت نگاری، انسان دوستی اور حب الوطنی جیسے موضوعات بکثرت موجود ہیں، جدید دور کے شعرا میں شامل محمود سامی البارودی، احمد شوقی، عبدالرحمٰن شکری، حافظ ابراہیم، خلیل مطران، نزار قبانی وغیرہ نے اپنی شاعری میں نئے رجحانات پیش کیے، جن سے عربی شاعری کو نئی سمت و رفتار ملی۔ انھوں نے جدید شعرا کی درجہ بندی کرتے ہوئے ان کے کلام میں پائے جانے والے فنی محاسن پر بھی بالتفصیل روشنی ڈالی۔ تقریب کی نظامت شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے سینئر استاد پروفیسر سید حسنین اختر نے کی، انھوں نے اردو اور عربی شاعری میں پائے جانے والے مشترکہ رجحانات کا تقابل کرتے ہوئے جدید عربی شاعری میں پائی جانے والی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ خطبہ کے موضوع اور مہمان خطیب کا تعارف صدر شعبہ پروفیسر نعیم الحسن اثری نے کرایا، توسیعی خطبے کی صدارت پروفیسر نجمہ رحمانی صدر شعبۂ اردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں موضوع کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے موضوعات پر لیکچرز ہونے چاہئیں، کیونکہ ان سے افکار و نظریات کی نئی

جہات سے آشنائی ہوتی ہے، اور دیگر زبانوں کے قیمتی ورثے سے استفادے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو ڈی یو کے پروفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شعبہ کے استاد ڈاکٹر محمد اکرم کے کلمات تشکر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ اس موقعے پر شعبۂ عربی ڈی یو کے اساتذہ ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر اصغر محمد، ڈاکٹر ظفیر الدین (شعبۂ عربی ذاکر حسین، دہلی کالج) کے علاوہ شعبہ کے گیسٹ اساتذہ و ریسرچ اسکالرس موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 دسمبر 2021

سعدی خوانی ثقافتی وفنی فیسٹول

نئی دھلی: ایران کلچرل ہاؤس نئی دہلی میں دوسرے سعدی خوانی ثقافتی وفنی فیسٹول کے موقعے پر ایک پروقار تقریب بشکل مسابقہ منعقد ہوئی، جس میں شیخ سعدی کی شاعری اور ان کے احوال و کوائف کو 'ویڈیو' کے ذریعے بیان کرنے والی شخصیات کا انتخاب کر کے انھیں اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر محمد علی ربانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ میری خواہش ہے کہ زبان فارسی کی تعلیم ہندوستان کے ہر مدرسہ میں شروع کی جائے، اس تعلق سے ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کی جانب سے جو ممکن ہوگا وہ مدد کی جائے گی۔ انھوں نے اس سلسلہ میں دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد سے بھی گذارش کی۔ انھوں نے شیخ سعدی کے احوال و کوائف پر مفصل روشنی ڈالی اور کہا کہ سعدی ہر زمانے میں علمی اعتبار سے تازگی بخش شاعر گزرے ہیں۔ ان کی دو کتابیں گلستاں و بوستاں بہت مشہور ہیں۔ شیخ سعدی کے کلام میں عشق و محبت اور باہمی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مرکز تحقیقات کے ڈائرکٹر شکر الٰہی نے کہا کہ سعدی ایک ایسا شاعر ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر ملک کے لیے علمی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس موقعے پر مدرسہ عالیہ فتح پوری کے شیخ الحدیث مولانا مسلم قاسمی، صدر جمعیۃ علما دہلی، مولانا جلال الدین قاسمی مدرسہ مہندیان، مولانا ظفر الدین مدرسہ عبدالرب اور مولانا جمیل احمد ٹونک، مولانا علی زادہ موسوی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض مولانا مہدی باقر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2021

خالد محمود، خالد جاوید اور عبدالنصیب کے اعزاز میں نشست

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اتر پردیش اردو اکادمی کے انعام یافتہ وابستگان جامعہ کے اعزاز میں تہنیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ یوپی اردو اکادمی نے سال 2020 کے ایوارڈز کا اعلان کر دیا ہے جس میں شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ عہد حاضر کے ممتاز فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید کو فکشن ایوارڈ ایک لاکھ روپے، جامعہ وائس چانسلر کے سکریٹری و معروف ترجمہ نگار ڈاکٹر عبدالنصیب خاں کو ترجمہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے اور شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد، بزرگ ادیب و شاعر پروفیسر خالد محمود کو ان کی کتاب 'نقوش معنی' پر پچیس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا ہے۔ صدارتی کلمات میں صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ حق بہ حق دار رسید کا محاورہ ان تینوں انعام یافتگان پر صادق آتا ہے۔ مہمان خصوصی ڈین فیکلٹی برائے انسانی علوم والسنہ پروفیسر محمد اسدالدین نے ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے دلی خوشی کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر انعام یافتگان کی خدمت میں گلدستے پیش کیے گئے۔ نشست میں پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر خان فاروق، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سرورالہدیٰ اور ڈاکٹر خالد مبشر نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ جلسے کی نظامت کے فرائض پروفیسر کوثر مظہری نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2021

دوروزہ آن لائن ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ دوروزہ آن لائن قومی ریسرچ اسکالرز سمینار میں ملک بھر کی 27 یونیورسٹیوں کے 48 ریسرچ اسکالرز نے اپنے مقالات پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس میں مہمانِ خصوصی پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ آج کے ریسرچ اسکالرز ہی کل کے عظیم محقق اور نقاد ہوں گے بشرطیکہ ان کی صحیح رہنمائی اور تربیت کی جائے۔ افتتاحی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس، دہلی یونیورسٹی پروفیسر نجمہ رحمانی نے ریسرچ اسکالرز کو معیاری اور معتبر تحقیقی کارنامے انجام دینے کی ترغیب دی۔ اجلاس میں چیئرمین شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر محمد علی جوہر نے بحیثیت مہمانِ خصوصی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو تحقیق کی نئی پود سے اردو کے علمی سرمائے میں بیش قیمت اضافے کے امکانات روشن ہیں۔ صدر اجلاس پروفیسر شہزاد انجم نے ریسرچ اسکالرز سمینار کو شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دیرینہ روایت کا حصہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ نئی نسل کے اندر تحقیقی و تنقیدی شعور کی آبیاری کا نہایت اہم وسیلہ ہے۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے استقبالیہ کلمات میں سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ محض ایک رسم مقالہ خوانی کی ادائیگی اور سرٹیفکٹ کے حصول کا عمل نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل مقصد علمی و فکری تہذیب کی بنیادوں کو مستحکم کرنا ہے۔

سمینار کے مختلف تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر خالد جاوید، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور پروفیسر ندیم احمد نے کی۔ جب کہ نظامت اور اظہار تشکر کے فرائض ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر جاوید حسن اور محمد وسیم نے انجام دیے۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس میں دہلی یونیورسٹی سے ریسرچ اسکالر مہر فاطمہ نے 'قائم چاند پوری: غالب کا تخلیقی پیش رو' اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تجمل حسین نے 'اردو ادب کے فروغ میں خلیق انجم کا کردار' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

سمینار کے پہلے اجلاس میں محمد خوشتر (حیدرآباد یونیورسٹی) نے 'مظفر حنفی کی علمی و ادبی خدمات'، محمد علیم الدین شاہ (مگدھ یونیورسٹی، گیا) نے 'جدید تر اردو غزل'، رئیس احمد فراہی (جے این یو) نے 'مصحفی کا نگار خانۂ آب ورنگ'، ثوبان احمد (دہلی یونیورسٹی) نے 'اردو ناولوں میں ہجرت اور اس کی المناکی' اور ضیاء المصطفیٰ (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'اردو صحافت کی تاریخ: ایک تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے اپنے مقالات پیش کیے۔

سمینار کے دوسرے تکنیکی اجلاس میں عقیل احمد (لکھنؤ یونیورسٹی) نے 'لکھنوی ڈراما: فنی خوبیاں اور اصلاح معاشرہ'، شمشیر علی (بی ایچ یو) نے 'اردو کے چند نامور غیر مسلم صحافی'، زاہد حسین میر (مرکزی یونیورسٹی آف کشمیر) نے 'اردو میں تاریخی ناول نگاری: 1980 کے بعد نمائندہ ناول نگاروں کے حوالے سے'، مسعود الحسن خان (محمد علی جوہر یونیورسٹی، رامپور) نے 'مولانا محمد علی جوہر کی اردو صحافت'، ثمینہ بی کے (شری شنکراچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت، کیرلا) نے 'پروفیسر بی شیخ علی بحیثیت نقاد، محقق اور ماہر تعلیمات'، پی ایم جعفر (تھیرو ولا رودر یونیورسٹی، ویلور) نے 'سراج زیبائی بحیثیت شاعر اطفال'، محمد رضوان (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'فن تاریخ گوئی: ایک تعارف'، مجوفہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'اردو کا مقبول عام ادب: منشی فیاض علی کے خصوصی حوالے سے'، نصرت پروین (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'فضیل جعفری

کی کتاب چٹان اور پانی: ایک تجزیاتی مطالعہ' اور محمد وسیم (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'ہفت روزہ اردو اخبار پیغام کا تنقیدی جائزہ' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

سمینار کے تیسرے تکنیکی اجلاس میں جناب اطہر حسین (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس) نے 'اردو تحقیق میں ماہنامہ معارف کی بازیافت'، محترمہ نازیہ (مدراس یونیورسٹی) نے 'جنوبی ہند کی منتخب مزاح نگار خواتین'، جناب شاہ نواز (برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال) نے 'احمد ندیم قاسمی ایک منفرد افسانہ نگار'، جناب ساجد علی (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) نے 'مولانا آزاد اور الجمعیۃ'، یسریٰ راحت (حمیدیہ کالج ،بھوپال) نے 'ڈاکٹر رضیہ حامد کی ادبی خدمات'، محترمہ بشریٰ چشتی (حیدرآباد یونیورسٹی) نے '1980 کے بعد اردو ڈرامے میں حاشیائی کرداروں کی عکاسی'، جناب فیروز خان (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'عرفان صدیقی کی شاعری میں عشق رسول'، محترمہ سیدہ فاطمہ النساء اسماء (ساتاواہنا یونیورسٹی، تلنگانہ) نے 'دکنی تحقیق میں اسلم مرزا کے اضافے'، محترمہ حمیرہ عالیہ (لکھنؤ یونیورسٹی) نے 'اردو میں جاسوسی ادب کی روایت اور ابن صفی کا اختصاص'، محترمہ سعدیہ صدف (عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا) نے '1980 کے بعد مغربی بنگال کی غزلوں کا سیاسی مزاج'، محترمہ تہنیت فاطمہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'الہ آباد کے اہم اشاعتی ادارے'، جناب عبداللہ منیر العالم (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'اردو زبان وادب کے فروغ میں رسالہ 'آج کل' کی خدمات'، جناب محمد یوسف رضا (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'ظہیر دہلوی کی مرثیہ نگاری'، جناب شاہ نواز عالم (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'ابن انشا بحیثیت شاعر'، ظفر الاسلام (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'معین احسن جذبی کی غزلیہ شاعری' اور محترمہ سفینہ خاتون (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'تنویر احمد علوی: بحیثیت محقق و مدون' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

سمینار کے چوتھے تکنیکی اجلاس میں محترمہ رشیدۃ النسا (مراٹھواڑا یونیورسٹی، اورنگ آباد) نے 'اردو ڈراما اور ہندوستانی تہذیب'، جناب محمد اعظمی (نارتھ مہاراشٹرا یونیورسٹی، جلگاؤں) نے 'ڈاکٹر اشفاق انجم کی نعتیہ شاعری'، جناب شبیر احمد لون (پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ) نے 'خاکہ نگاری کا فن اور قرۃ العین حیدر'، محترمہ کوثر جمال (بریلی یونیورسٹی) نے 'رشید حسن خاں کے تحقیقی نظریات'، جناب احمد حسن (گجرات یونیورسٹی، احمد آباد) نے 'جدید غزل اور خلیل الرحمن اعظمی'، جناب پپو رام (پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ) نے 'اردو ادب میں طنز و مزاح کا ارتقائی دور: ایک مختصر جائزہ'، محترمہ اسنیٰ سحر (الہ آباد یونیورسٹی) نے 'فن انشائیہ نگاری اور مجتبیٰ حسین'، جناب سوریہ پرکاش راؤ (الہ آباد یونیورسٹی) نے 'اردو رباعی کی تعریف اور غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ میں اہم صنف کون: ایک جائزہ'، محترمہ صبا (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'فکشن تنقید کے مباحث اور عابد سہیل'، جناب محمد تنظیم عالم (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'غلام عباس بحیثیت افسانہ نگار'، جناب ناظر انور (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'ظفر گورکھپوری: غزل گائیکی کے حوالے سے' اور جناب عبد الواحد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے 'اسلوب احمد انصاری بحیثیت خاکہ نگار' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 27 دسمبر 2021

اترپردیش

تعلیم کی اہمیت اور ہماری ذمے داریاں

لکھنؤ: علامہ شبلی نعمانی میموریل ہیلپ لائن کی جانب سے ایک کانفرنس و اعزازی پروگرام 'تعلیم کی اہمیت اور ہماری ذمہ داریاں' عنوان کے تحت یوپی پریس کلب لکھنؤ میں کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ممتاز و اسلامیہ کالج کے منیجر سید اطہر نبی نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جسٹس بی ڈی نقوی نے شرکت کی، اور مہمان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر انیس انصاری اور ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی وغیرہ شریک ہوئے۔ جلسے کی نظامت پروگرام کے کنوینر و کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر مسیح الدین خاں نے کی۔ اس خصوصی کانفرنس میں مولانا آزاد اردو یونیورسٹی شعبہ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مجاہد الاسلام، آئی ٹی کالج شعبہ ایجوکیشن سے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر روما اسمارٹ جوزف، اسلامیہ ڈگری کالج سے تبسم خاں اور کانپور حلیم مسلم پی جی کالج سے ڈاکٹر ماہ طلعت صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنا قیمتی مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر کچھ علمی و ادبی شخصیات کو ان کی نمایاں خدمات کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ اعزاز یافتہ اشخاص میں عبد العلی یونانی میڈیکل کالج کے ڈائرکٹر یوسف الحسینی، پی ایم ٹی کالج کے سکریٹری ایس احمد، سی ایم ایس کے منیجر جاوید آزاد اور پرواز فاؤنڈیشن کے سکریٹری مجتبیٰ خان کو شال اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ اس تعلیمی کانفرنس میں فرحانہ مالکی کی صاحبزادی آفرین مالکی کی ایک انگریزی کی کتاب کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ مہمان خصوصی جسٹس بی ڈی نقوی نے کہا کہ ہمیں تعلیم کے میدان میں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر انیس انصاری نے کہا کہ حکومتیں بھی تعلیم کے لیے بہت کوشاں رہتی ہیں۔ ہمیں ان کی اسکیم سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی نے کہا کہ ہم آرٹی آئی کے بارے میں سبھی کو بتانا چاہتے ہیں اور رائٹ ٹو ایجوکیشن پر بھی ہم لوگوں نے کافی کام کیے ہیں اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ سید اطہر نبی ایڈوکیٹ نے صدارت کرتے ہوئے کہا کہ فی الحال ہم کو 'نیو ایجوکیشنل پالیسی' کو بھی جاننا چاہیے۔ ابھی یہ نیا تعلیمی نظام لوگ سمجھ نہیں پائے ہیں، اس کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 دسمبر 2021

فلمی دنیا میں اردو

لکھنؤ: اردو ہندوستان کی بیٹی و ہندی کی بہن ہے اور زبان سیکھے بغیر ہم ہندوستان کی ثقافت و تاریخ کو سمجھ نہیں سکتے۔ اگر ہم اردو کے بغیر ہندوستان کی تاریخ و ثقافت کو سمجھنا چاہیں گے تو وہ نصف جانکاری ہی ہوگی، جو سماج کے لیے نقصاندہ ہے۔ یہ ماننا تھا ان مقررین کا جو یہاں اترپردیش اردو اکادمی میں منعقد جشن کے افتتاح کے موقعے پر موجود تھے۔ فلمی دنیا میں اردو پر منعقد سمینار میں مشہور فلمی اداکار رضا مراد کے ساتھ مہابھارت فیم ارجن 'فیروز خان' نے بھی حصہ لیا۔

پہلا سیشن 'فلموں میں اردو کا دخل' نام سے ہوا جس میں بولتے ہوئے فلم اداکار رضا مراد نے کہا کہ بیشتر شعرا زبان سے ناواقف ہیں۔ پہلے کی زبان میں جو چاشنی اور مٹھاس تھی وہ آج دکھائی نہیں دیتی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے لیے ہمیں اپنے بچوں کو گھر میں ٹیوشن لگا کر اردو سکھانی چاہیے۔ واثق خان کی نظامت میں ہوئے اس سیشن میں متحمل آزاد، اسرار خان، بنجے سنگھ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فلموں پر مرکوز پہلے سیشن کے بعد دوسرے سیشن 'صحافت کا خوبصورت چہرہ اردو' میں اے پی سنگھ، ڈاکٹر اکبر علی، زبیر احمد، ایس این لال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تیسرے سیشن 'سیاست میں اردو کی کرامات' میں مرتضیٰ علی، قمر علی، سریندر راجپوت، پردیپ سنگھ، ارجن سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو کی تعریف کی۔ یہاں مقررین نے کہا کہ اردو کے مستقبل کو لے کر جہاں لوگ فکرمند ہیں وہیں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اردو کا مستقبل روشن مانتے ہیں۔ فلم ہو یا ٹی وی شو سب جگہ اردو کی ضرورت ہے۔ اسی ضمن میں اطہر نبی اور چندو پرکاش و دیگر نے 'اردو کا گہوارہ ادب' پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے درمیان ہی ٹیلین

صاحب کی کتاب 'خدا کی عجیب وغریب مخلوقات' کا اجرا ہوا۔ ساتھ ہی چہار بیت، داستان گوئی کو فوزیہ اور دیبہ نے پیش کیا جس سے لوگ لطف اندوز ہوئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 دسمبر 2021

ناصر کاظمی کی شخصیت اور شاعری

میرٹھ: ناصر کاظمی کی ولادت کے موقعے پر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں منعقدہ یک نشستی سمینار میں سہ ماہی 'عالمی جائزہ' کے کورونائی ادب پر مشتمل خاص شمارے 'عالمی وبا نمبر' کی رسم اجرا کو شامل کرکے ادبی تقریب کو مزید پرلطف بنا دیا گیا۔ اس موقعے سے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے گراں قدر خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ "ناصر کاظمی کے پچاس سال گزرنے کے باوجود دوسرا ناصر کاظمی پیدا نہیں ہوا حالانکہ احمد فراز اور پروین شاکر کے یہاں بھی رومانیت ہے لیکن ناصر کاظمی کی رومانویت کو یہ دونوں نہیں پہنچتے۔ حسن زندگی کی تصویر کشی میں ناصر کاظمی کا جواب نہیں۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو لفظوں کے خوبصورت استعاروں میں بیان کرتے جاتے ہیں۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سمینار ہال میں منعقدہ پروگرام میں انھوں نے مزید کہا کہ ناصر کاظمی کا یہ بھی اختصاص ہے کہ وہ اردو ادب میں علامہ اقبال کے بعد واحد ایسے شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں عشق یا بالفاظ دیگر رومانویت کو ایک فلسفے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک رومانیت شہوانیت یا خواہشات کی تکمیل کا نام نہیں بلکہ حیات کے تمام تر سرچشموں کا مرکز و منبع ہے۔ ان کی رومانیت جہاں انسانی زندگی کی سچی تصویر پیش کرکے زندگی کو آئینہ دکھاتی ہے وہیں انسان کو ظلم کے خلاف کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ اس کے اندر حوصلہ اور جوش بھرتی ہے۔

استقبال ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض سیدہ مریم الٰہی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اور سہ ماہی عالمی جائزہ کے مدیر اے رحمان ایڈووکیٹ مہمان خصوصی نے موجودہ صحافت اور اردو شاعری کی رومانیت کے حوالے سے ناصر کاظمی کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اس موقعے پر ساجد علی نے اپنا مقالہ بعنوان 'اردو صحافت کے فروغ میں اخبار الجمعیۃ کا کردار' پیش کرتے ہوئے کہا کہ اخبار الجمعیۃ کی اشاعت کو ایک صدی ہونے کو ہے۔ اس طویل صحافی سفر کا تجزیہ کرنے کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہیں، تاہم الجمعیۃ کی کاوشوں کو منظر عام پر لانا ضروری تھا۔ دوسرے مقالہ نگار تابش فرید نے اپنا مقالہ 'ناصر کاظمی کی رومانوی شاعری' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ناصر کاظمی کا نام ان تخلیق کاروں کی فہرست میں شامل ہے جن کی شمولیت کے بغیر اردو کی کسی ادبی تاریخ کو مکمل اور استناد کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ پروگرام میں معروف شاعر اظہر اقبال نے اپنا کلام پیش کرکے خوب داد وتحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر آصف علی اور ڈاکٹر شاہنواز ہاشمی، دہلی یونیورسٹی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد، شاداب علی، مدیحہ اسلم، طاہرہ پروین، نوید خان، محمد وسیم، فرح ناز، گلستاں، گلناز، محمد عمران، روضا، شفا، ربا عارف، نشا سیفی سمیت عمائدین شہر اور طلبہ وطالبات موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 دسمبر 2021

عالمی یوم عربی زبان

لکھنؤ: عربی زبان کا شمار دنیا کی قدیم ترین زندہ جاوید زبانوں میں ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ میں منظور شدہ چھ زبانوں میں شامل ہے، عرب لیگ کے بائیس ملکوں میں پہلی سرکاری زبان ہے، اور دنیا میں تین سو ملین سے زیادہ عربی بولنے والے افراد موجود ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سعید الرحمٰن سابق صدر شعبۂ عربی، عالیہ یونیورسٹی، کلکتہ مغربی بنگال نے شعبۂ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس میں عالمی یوم عربی زبان کی مناسبت سے منعقدہ آن لائن توسیعی خطبے میں اپنے علمی وتحقیقی خطبہ بعنوان 'ہندوستان میں عربی زبان بول چال: مشکلات اور حل' میں کیا ہے۔ ڈاکٹر سعید الرحمٰن نے اپنے خطبے میں کہا کہ عربی زبان سیکھنے والے طلبہ کو چاہیے کہ وہ اس زبان کو سیکھتے وقت اس کو بولنے کی بھی زیادہ سے زیادہ مشق کریں اور عربی زبان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کریں، کیونکہ کوئی بھی زبان انسان کی زندگی میں تبھی زندہ رہتی ہے جب اس کو تواصل کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ انھوں نے عربی زبان کے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ عربی کا ماضی وحال جتنا شاندار ہے مستقبل بھی اتنا ہی تابناک ہے کیونکہ مشرق وسطی کی بڑھتی ہوئی موجودہ ترقی سے عربی زبان کی عالمی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ انھوں نے عربی زبان کیوں سیکھیں؟ اس کی اہمیت اور ضرورت سے بھی واقف کرایا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سعید الرحمٰن نے مانو لکھنؤ کیمپس کی فراہمی کے لیے شکریہ بھی ادا کیا اور طلبہ کے سوالات کا تشفی بخش جواب بھی دیا۔ اس موقعے پر شائستہ پروین ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مانو لکھنؤ کیمپس نے عالمی یوم عربی زبان کا مختصر تعارف پیش کیا۔ انوار الحق ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مانو لکھنؤ کیمپس نے ڈاکٹر سعید الرحمٰن کا مختصر تعارف پیش کیا۔ جب کہ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ثمامہ فیصل اسسٹنٹ پروفیسر اور اکیڈمک کوآرڈینیٹر شعبۂ عربی مانو لکھنؤ کیمپس نے کی اور اخیر میں کلمہ تشکر بھی پیش کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ثمامہ فیصل، مانو لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ، 21 دسمبر 2021

بہار

اردو ڈائرکٹوریٹ کی کیف عظیم آبادی یادگاری تقریب

پٹنہ: کیف عظیم آبادی کا شمار دبستان عظیم آباد کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی خوبصورت شاعری اور دلکش آواز کے امتزاج سے شائقین شعروسخن کے دل و دماغ پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ یہ باتیں اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام منعقدہ کیف عظیم آبادی یادگاری تقریب سے خطاب کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاعری میں فلسفہ اور مضمون کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی، شاعر کا زیادہ تر تعلق جذبات سے ہی ہوتا ہے۔ کیف کی شاعری سحر انگیز اور جادوئی کیفیت سے پر تھی۔ وہ دل کو چھو لینے والی اور جذباتیت پیدا کردینے والی شاعری کرتے تھے۔ ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ کیف عظیم آبادی کی شخصیت مسحور کن تھی۔ ان کی شاعری میں نغمگی تھی، وہ اپنے خاص لب و لہجے، سادہ اور سلیس انداز بیان کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبول ہوئے۔ وہ ایک پختہ فکر، شائستہ زبان، شگفتہ اسلوب، اور شستہ انداز کے شاعر تھے۔ معروف ادیب ڈاکٹر ابوبکر رضوی نے کہا کہ کیف عظیم آبادی کی شخصیت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ تقریباً چار دہائیوں تک وہ عظیم آباد کی علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی مجالس وتقاریب میں نمایاں رہے اور ان کی موجودگی باعث فخر سمجھی جاتی رہی۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے کیف عظیم آبادی کے چند اشعار سے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے غربت میں زندگی گزاری، ٹیلرنگ کے پیشے سے کے ذریعے اپنی معاشی زندگی بسر کی۔ ایسی عظیم شخصیت کے کارناموں سے اردو داں کے

ساتھ غیراردو داں طبقہ بھی بہرہ ور ہو سکے۔ اس کے لیے ان کے کارناموں کا ہندی ترجمہ بھی ہونا چاہیے، تاکہ غیراردو داں بھی ان کے کارناموں سے واقف ہو سکیں۔ مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کرنے والے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے اسپیشل سکریٹری ڈاکٹر اپندرناتھ پانڈے نے کہا کہ ایسی تقریبات زبان کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے ہونی چاہیے۔ ریسرچ اسکالر فرح ناز نے کیف کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ تقریب کی صدارت علیم اللہ حالی نے کی، جبکہ نظامت حسیب الرحمن انصاری نے کی۔ دوسرے سیشن میں 'بزم سخن' کے عنوان سے مشاعرے کی تقریب منعقد ہوئی، جس کی صدارت معروف شاعر ناشاد اورنگ آبادی نے کی اور نظامت محمد شکیب ایاز نے کی۔ کلام پیش کرنے والے شعرا میں اثر فریدی، معین کوثر، ظفر صدیقی، نیاز نذر فاطمی، چونچ گیاوی اور ارادھنا پرساد کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر اردو لرننگ کورس کے فارغین کو اردو ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے اسناد بھی تقسیم کی گئیں۔ جن میں وشنو جی گیا، رشمی کماری پٹنہ، ڈاکٹر وجے کمار ٹھاکر (پٹنہ)، ڈاکٹر منیشا جھا (پٹنہ)، ابھجیت رنجن (پٹنہ) رخسانہ خاتون (شیخ پورہ) وغیرہ شامل ہیں۔ کورس انسٹرکٹر نور عالم بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 دسمبر 2021

اختر اورینوی نابغہ روزگار شخصیت

پٹنہ: اختر اورینوی کی شخصیت بلاشبہ 'نابغہ' روزگار تھی۔ بہترین افسانہ نگار اور ناول نگار کے علاوہ وہ قابل رشک استاد بھی تھے۔ انھوں نے قابل رشک شاگرد بھی پیدا کیے۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن نگار پروفیسر عبدالصمد نے اردو ڈائرکٹوریٹ بہار حکومت کے زیر اہتمام 29 دسمبر کو اختر اورینوی یادگاری تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا اختر اورینوی نے کئی اصناف ادب میں خامہ فرسائی کی، لیکن وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے۔ اس میدان میں انھوں نے ملک گیر سطح پر عزت و شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ پروفیسر جاوید حیات نے کہا کہ اختر اورینوی بہار میں اردو زبان و ادب کی روشن تاریخ کا ایک روشن نام ہے۔ انھوں نے اختر اورینوی کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اختر اورینوی کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار اور شاعر بھی تھے۔

انھوں نے بتایا کہ بہار کے اردو ادب کی صد سالہ تاریخ کی تدوین کا بڑا کام اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام جاری ہے۔ تین جلدوں پر مشتمل بہار کی صد سالہ ادبی تاریخ نثری و شعری ادب میں بہار کے ادیبوں کے کارنامے کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ روبہ عمل ہے۔ اس موقعے پر اختر اورینوی کی ادبی خدمات کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر محمد منہاج الدین نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس میں بزم سخن کے تحت شعری نشست منعقد کی گئی۔ معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر قاسم خورشید کی صدارت میں چلنے والی اس محفل سخن میں پریم کرن، عابد رضا نقوی، اصغر حسین کامل، افتخار عاکف، فردوس گیاوی، شبانہ عشرت، کاظم رضا اور شاذیہ ناز نے اپنے کلام پیش کیے۔ یادگاری تقریب کی صدارت پروفیسر عبدالصمد نے اور نظامت حسیب الرحمن انصاری نے کی، جب کہ 'بزم سخن' کی نظامت محمد شکیب ایاز کی نے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 دسمبر 2021

تلنگانہ

مصنف ورکشاپ

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، سید حامد لائبریری نے ٹیلر اینڈ فرانسس پبلشنگ گروپ (TFPG) کے اشتراک سے 'مصنف ورکشاپ' کا انعقاد عمل میں آیا۔ ورکشاپ کا عنوان 'ٹیلر اینڈ فرانس' کے ذریعے علمی کتابیں کیسے شائع کی جائیں' تھا۔ اردو یونیورسٹی کے مختلف کیمپوں سے 395 شرکا نے رجسٹر کیا تھا۔ پروفیسر سید عین الحسن وائس چانسلر نے اپنے فکر انگیز افتتاحی خطاب میں کہا کہ تعلیمی ادارے اس کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کی تحقیق کے معیار سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی کے محققین کی تدریسی اور تحقیقی صلاحیتوں میں نکھار کے لیے ایسے پروگراموں کو باقاعدگی سے منعقد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، پرو وائس چانسلر نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے سماجی علوم کے شعبے میں تحقیق کے تازہ ترین رجحانات پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروفیسر صدیقی محمد محمود، رجسٹرار انچارج نے لائبریری کے عملے کو مبارکباد دیتے ہوئے یونیورسٹی میں ریسرچ کلچر کو مضبوط بنانے پر زور دیا۔ ورکشاپ کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر گگندیپ سنگھ، سینئر پبلشر، ایڈیٹوریل، ٹیلر اینڈ فرانسس گروپ نے کتابوں اور جرائد میں علمی مواد کی اشاعت کے اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ انھوں نے روایتی بمقابلہ اوپن ایکسیس پبلشنگ ماڈلز پر بھی اظہار خیال کیا اور ای بکس اور پرنٹیڈ بکس کے علاوہ رسمی پروپوزل کی تیاری کے طریقوں سے واقف کروایا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی عملی مواد میں دریافت کی صلاحیت تحقیقی تحریر کا ایک اہم ترین پہلو ہے کیونکہ یہ کسی بھی تحقیقی کام کی اہمیت پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ تحقیقی کا کام مکمل کرنے کے بعد مصنفین اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ ایسے کاموں کی تشہیر کے لیے سماجی رابطے کی ویب سائٹس کا استعمال کریں تاکہ دیگر اسکالرس حوالہ جات میں اسے استعمال کر سکیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 دسمبر 2021

مہاراشٹر

یوم ترغیب مطالعہ

سولاپور: ہندوستان کے سابق صدر اور بھارت رتن ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش کے موقعے پر ہر سال یوم ترغیب مطالعہ منایا جاتا ہے۔ خادمان اردو

فورم، سولاپور نے امسال منفرد انداز سے آرکڈ انجینئرنگ کالج سولاپور میں نویں جماعت کے طلبہ کے لیے ایک انٹر اسکول آن لائن ٹیسٹ کا اہتمام کیا۔ اس میں شہر کے اردو میڈیم کے مختلف اسکولوں کے کل 45 طلبہ نے حصہ لیا اور اپنا آن لائن ٹیسٹ دیا۔ ٹسٹ کے بعد جو نتیجہ آیا طلبہ کو انچارج پرنسپل ڈاکٹر وکیل باغ، پروفیسر اختر ندف، فورم کے چیئرمین وقار احمد شیخ، سیکریٹری ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار، ناصرالدین الندکر، اقبال باغبان، عبدالمنان شیخ، رفیق خان، سراج بیجاپوری کی موجودگی میں انعامات سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر شفیع چوبدار نے یوم ترغیب کے مطالعے کے انعقاد کے مقصد اور سرکاری ملازمتوں کے لیے طلبہ کے لیے MPSC، UPSC اور CET کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے دیگر امتحانات صرف آن لائن طریقے سے ہوتے ہیں۔ اس مقابلے کی وجہ سے آگے طلبہ کے لیے بہت آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ فورم اسی لیے ایسے مقابلے منعقد کر کے طلبہ میں تعلیمی بیداری پیدا کر رہا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وکیل باغ مطالعہ کے انعقاد کا مقصد اور اس کی اہمیت و

ضرورت کے فوائد بتائے گئے۔

اپنے صدارتی خطاب میں فورم کے چیرمین وقار احمد شیخ نے کہا کہ اردو میڈیم کے طلبہ کو جو بھی مسائل درپیش ہیں ان کے حل کے لیے فورم ہمیشہ مختلف پروگرام منعقد کرتا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر اختر نداف، وجاہت سر نے بھی طلبہ کو چند مفید گراں قدر مشوروں سے فیض یاب کیا۔

آن لائن ٹسٹ میں انعامات حاصل کرنے والے طلبہ پہلا انعام ثیب استاد انعم صدیق مختار (سرسید احمد خان اردو ہائی اسکول)، دوسرا انعام اسمارٹ فون نلا مندو ریحان محمد عثمان (سوشل ہائی سکول)، تیسرا نقد 1500 شیخ نازنین سلام (سرسید احمد خان اردو ہائی سکول)، تشجیعی انعامات: جاگیردار محمد سعد سمیر (سوشل ہائی اسکول)، نگہبان نازیہ عارف (سرسید احمد خان اردو ہائی اسکول)، شیخ حسنہ ضمیر (سرسید احمد خان اردو ہائی اسکول)، شیخ محمد نعمان افروز (پانگل ہائی اسکول)، شاہ پورے عائشہ سلیم (مہترے ہائی اسکول)، مومن بی بی فاطمہ شوکت علی (اردو سیکنڈری اسکول، مندروپ)، پٹیل محمد شکیب یوسف (پروگریسیو ہائی اسکول)، شیخ سعدیہ عبدالستار (سوشل ہائی اسکول)، قاضی ثانیہ صلاح الدین (اردو سیکنڈری اسکول، مندروپ)، شیخ الفیہ سیفن (مہترے ہائی اسکول) کو انعامات دیے گئے۔ پروگرام کی نظامت عبدالمنان شیخ نے کی اور آخر میں اقبال باغبان کے اظہار تشکر کے بعد پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: محمد اقبال باغبان، سولاپور، مہاراشٹر 27 دسمبر 2021

ہریانہ

اردو ادب میں ہریانہ کے ادیبوں کا حصہ

پونہانہ نوح: ریاست ہریانہ کے ضلع نوح کے ہونہانہ میوات میں یونیورسل ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان اردو ادب میں ہریانہ کے ادیبوں کا حصہ منعقد کیا گیا۔ سیمنار میں مہمان خصوصی کے طور پر دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد چاند نے شرکت کی اور اردو ادب میں ہریانوی ادیبوں کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ریسرچ اسکالر محمد چاند نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں ہریانہ کے ادیبوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اپنے خون سے اردو ادب کو سینچا ہے۔ اردو جو آج سب جگہ بولی، سمجھی اور لکھی بھی جاتی ہے اس میں ہریانہ کے ادیبوں کا اہم کردار ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کی نوجوان نسل بھی اردو سے شدید محبت کرتی ہے۔ یہ بے حد خوشی کی بات ہے اور اسی لیے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو اس سرزمین سے کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ سیمنار میں قریب ایک درجن مقالات پیش کیے گئے۔ اس موقعے پر محمد سلیم محمد حسین، محمد مبارک، محمد نعیم، مبارک حسین، محمد ساجد، راشد حسین سمیت کئی حضرات نے بطور مقالہ نگار شرکت کی۔ یونیورسل ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے خزانچی اکرم علی نے بتایا کہ تنظیم اردو کے حوالے سے کافی سنجیدہ ہے اور اردو کی بقا کے لیے اقدامات اٹھانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 28 دسمبر 2021

اعزاز و اکرام

ساہتیہ اکادمی کے انعامات

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی نے 2021 کے ساہتیہ کا اعلان کر دیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 20 ہندوستانی زبانوں، یوا پرسکار 22 ہندوستانی زبانوں اور بال ساہتیہ پرسکار بھی 22 ہندوستان زبانوں کے لیے دیے جاتے ہیں۔ 2021

جناب کوثر صدیقی

جناب عمر فرحت

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لیے ہندی میں دیا پرکاش سنہا، انگریزی میں نیتا گوکھلے اور پنجابی میں خالد حسین کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے۔ گجراتی، میتھلی، منی پوری اور اردو زبانوں کے انعامات کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

اردو میں بال ساہتیہ پرسکار بزرگ شاعر و ادیب جناب کوثر صدیقی (بھوپال) اور اردو میں یوا پرسکار کشمیر کے نوجوان شاعر و ادیب عمر فرحت کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ کوثر صدیقی کو ان کے شعری مجموعہ 'چراغ پھولوں کے' پر جب کہ عمر فرحت کو ان کے شعری مجموعہ 'زمین زاد' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہندی میں یوا پرسکار کے لیے ہمانشو واجپئی، انگریزی کے لیے میگھا مجمدار اور پنجابی کے لیے ویر دیویندر سنگھ کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے، جب کہ ادب اطفال میں ہندی کے لیے دیوندر میواڑی، انگریزی میں انیتا وچھر جنی کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتگان کو ایک لاکھ روپے کی رقم جب کہ یوا پرسکار، بال ساہتیہ پرسکار پانے والوں کو 50 ہزار روپے کی رقم ایک خاص تقریب میں دی جائے گی۔

پریس ریلیز: ساہتیہ اکادمی، دہلی

اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ برائے 2020

لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی نے سال 2020 کے انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ پانچ لاکھ روپے پر مشتمل قومی سطح کا مولانا ابوالکلام آزاد انعام علی گڑھ کے پروفیسر اصغر عباس کو دیا گیا ہے۔ مجموعی ادبی خدمات کے لیے ایک ایک لاکھ روپے کے سات انعام دیے گئے۔ شاعری کے لیے شارق کیفی (بریلی)، فکشن کے لیے خالد جاوید (بریلی) کو انعام سے سرفراز کیا گیا ہے، جب کہ مسعود حسن رضوی انعام برائے تحقیق شمس بدایونی (بریلی)، احتشام حسین انعام برائے تنقید پروفیسر عقیل احمد (علی گڑھ)، ادب برائے اطفال کا عرفان انصاری (جونپور)، بابائے اردو مولوی عبدالحق انعام برائے فروغ اردو ادب پروفیسر عبدالحامد (الہ آباد)، سائنس و ترجمہ کے لیے ڈاکٹر عبدالنصیب خاں (دہلی) کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی کے نام سے موسوم قومی یکجہتی انعام پروفیسر وجے بہادر سنگھ (بنارس) اور انعام برائے خواتین درخشاں تاجور (گورکھپور) کو دیا گیا ہے۔ یہ دونوں انعام ایک ایک لاکھ روپے کے ہیں۔ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کا امیر خسرو انعام مولانا ابوالقاسم فاروقی (الہ آباد) کو دیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن انعام برائے تدریس یونیورسٹی/کالج ایک لاکھ روپے کا انعام ڈاکٹر معراج الحسن (مراد آباد) کو دیا گیا ہے جب کہ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کا پریم چند ایوارڈ پروفیسر شاہد حسین (گورکھپور) کو دیا گیا ہے۔ منشی نول کشور ایوارڈ برائے ادبی رسائل ڈاکٹر سلیم احمد (لکھنؤ) کو دیا گیا ہے۔ صحافت کے شعبے میں پرنٹ میڈیا کے لیے اکبر علی بلگرامی اور حمایت حسین جائسی کو 50-50 ہزار روپے کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے لیے خورشید احمد (گونڈہ) کو 50 ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔ نوجوان صحافیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے 25-25 ہزار روپے کے دو انعام بالترتیب محمد عاطف (گورکھپوری) اور محمد عامر (بارہ بنکی)، الیکٹرانک میڈیا محمد عرفان (تہذیب چینل، گورکھپوری) کو دیا گیا ہے اور گورکھپور کے نوشاد احمد کو کتابت کے 25 ہزار روپے کے انعام سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اردو اکادمی نے چار زمروں میں کتابوں پر 25-25 ہزار روپے کے پندرہ انعام، 20-20 ہزار روپے کے 20 انعام، 15-15 ہزار روپے کے 25 انعام اور 10-10 ہزار روپے کے 116 انعامات تقسیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 دسمبر 2021

ہریانہ اردو اکادمی انعامات 20-2019

چنڈی گڑھ: ہریانہ اردو اکادمی نے 20-2019 کے لیے مختلف سالانہ انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ فخر ہریانہ ایوارڈ کروکشیتر کے 94 سالہ بزرگ ہمت سنگھ سنہا 'ناظم' اور پانی پت کے ممتاز شاعر ڈاکٹر کمار پانی پتی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ دونوں کو 5-5 لاکھ روپے کی رقم دی جائے گی۔ 2019 کا حالی ایوارڈ ڈاکٹر قمر الدین ذاکر (نوح، میوات) اور 2020 کا حالی ایوارڈ ممتاز شاعر

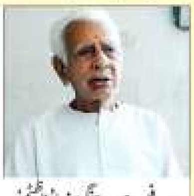
پروفیسر ہمت سنگھ سنہا 'ناظم'

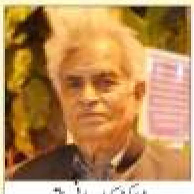
ڈاکٹر کمار پانی پتی

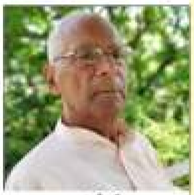
جناب کرشن کمار طور

ڈاکٹر نصیر الدین ازہر

ساہتیہ اکادمی اور غالب ایوارڈ یافتہ معروف شاعر اور سہ ماہی سربز کے مدیر جناب کرشن کمار طور کو دیا جائے گا۔ اس ایوارڈ کی رقم 3 لاکھ روپے ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سمان 2019 کے لیے ڈاکٹر نصیر الدین ازہر اور 2020 کے لیے ڈاکٹر قمر رئیس (قمر الحسن چودھری) (سونی پت) کا انتخاب کیا گیا ہے۔ 2019 کا سید مظفر حسین برنی ایوارڈ پانی پت کے زاہد الاحسانی اور 2020 کا ڈاکٹر ویلس راج سپرا کروکشیتر کو دیا جائے گا۔ 2019 کا خواجہ احمد عباس ایوارڈ روپ نرائن چندنا (کرنال) کو اور 2019 کا منشی گمانی لال ایوارڈ انیس الحسن صدیقی (گڑگاؤں) کو دیا جائے گا۔ 2019 کا سریندر پنڈت سوز ایوارڈ شری دیویندر گوکل (نئی دہلی) اور 2020 کا ایوارڈ ڈاکٹر نفس انبالوی (انبالہ) کو دیا جائے گا۔ 2019 کا اردو ترجمہ نگاری ایوارڈ سریندر بنسل اور 2019 کا ڈاکٹر جاوید وشسٹ ایوارڈ ڈاکٹر رحمٰن اختر (پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ)، 2019 کا بال کرشن مضطر ایوارڈ شری سرداری لال دھون کمل (پنچکولہ) اور 2020 کا ایوارڈ اقبال احمد انصاری (پانی پت) کو دیا جائے گا۔ 2019 کا جسونت سنگھ ٹوہانوی ایوارڈ نیرج رائے زادہ (پنچکولہ) کو دیا جائے گا جب کہ 2019 کا اردو غزل سرائی ایوارڈ ایس ڈی شرما (پنچکولہ) اور 2020 کا سنجیو ماگو مسافر کو دیا جائے گا۔

پریس ریلیز، ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ، ہریانہ

پروفیسر حمید سہروردی

گلبرگہ: پروفیسر حمید سہروردی، اُردو افسانے اور نظم کا نشانِ امتیاز ہیں۔ انھوں نے ادب کے کاز کو تقویت عطا کی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد اعظم شاہد (بنگلور)

نے کیا۔ یہ تقریب 26 دسمبر 2021 بروز اتوار دوپہر تین بجے انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ میں منعقد کی گئی تھی۔ پروفیسر محمد اعظم شاہد نے مزید کہا حمید سہروردی نے اپنے فن افسانہ سے بیدر، مہاراشٹر اور گلبرگہ کو افسانے کے باب میں شناخت دلائی۔ 150 سے زائد قلم کاروں نے ان کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے۔ اعظم شاہد نے کہا کہ انجمن نے حمید سہروردی کی ادبی خدمات کا اعتراف اور کارنامۂ حیات ایوارڈ تفویض کر کے ایک فن کار کی ہنرمندی کا اعتراف کیا ہے اور ایک روشن مثال قائم کی ہے۔ پروفیسر پریملا امبیکر (صدر شعبہ ہندی، جامعہ گلبرگہ) نے حمید سہروردی کی شخصیت کو منفرد قرار دیتے ہوئے کہا اردو افسانے پر ان کے نشانات گہرے ہیں۔ پریملا امبیکر نے کہا کہ انھوں نے پاکستانی صداکار فیصل سعید ضرغام کی آواز میں حمید سہروردی کا مشہور افسانہ خواب در خواب سماعت کیا تھا۔ افسانے کے متعلق پریملا امبیکر نے کہا افسانہ مرد اور عورت کے باہمی رشتہ کو واضح کرتا ہے اور یہ تانیثیت کے حوالے سے بہت خوبصورت افسانہ ہے۔

ڈاکٹر جلیل تنویر (گلبرگہ) نے اپنی تقریر میں کہا کہ حمید سہروردی کی شہرت دور دور تک ہے۔ وہ دوران گریجویشن ہی قومی سطح پر اپنی پہچان بنا چکے تھے۔

ڈاکٹر کوثر پروین (گلبرگہ) نے کہا کہ حمید سہروردی کی شعبہ اردو فارسی میں تدریسی خدمات قابل قدر رہی ہیں اور افسانوی ادب میں ان کی شناخت مستحکم ہے۔ انھوں نے کہا کہ انجمن نے 'انجمن کارنامۂ حیات ایوارڈ' کے لیے معتبر شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے افسانے اور نظم کی صورت میں جو ادب خلق کیا ہے وہ شہرت کے لیے نہیں کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اعتراف اور قدر شناسی سے فن کار کو حوصلہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی خدمات کے اعتراف اور انجمن کا اولین انجمن کارنامۂ حیات ایوارڈ تفویض کرنے پر انجمن کے ارباب حل وعقد کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین (صدر انجمن) نے کہا کہ حمید سہروردی نے ہمیشہ لکھنے کو ترجیح دی ہے۔ وہ ایک غیر متنازعہ فنکار ہیں اور تقریر سے زیادہ تحریر پر یقین رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر انیس صدیقی (معتمد انجمن) نے حمید سہروردی کی خدمات عالیہ میں پیش سپاس نامہ دل نشین انداز میں پڑھ کر سنایا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسماء تبسم (شریک معتمد) نے بہ حسن خوبی انجام دیے۔ جناب واجد اختر صدیقی کے اظہار تشکر پر یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، کرناٹک، 28 دسمبر 2021

اصغر وجاہت

فتح پور: ہندی ادب کو ناول، ڈراما، یادداشتیں، کہانیاں وغیرہ دینے والے ضلع کے اصغر وجاہت کو تلسی داس پر مبنی ان کے ڈرامے 'مہابلی' کو 'ویاس اعزاز' کے لیے منتخب کیا گیا ہے جس کے تحت انھیں کے کے برلا فاؤنڈیشن کی جانب سے 4 لاکھ روپے نقد، توصیفی سند سے سرفراز کیا جائے گا۔ کے کے برلا فاؤنڈیشن کے

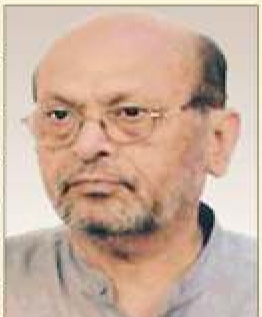

ڈائرکٹر ڈاکٹر سریش ریتو پرنا کے مطابق معروف ادیب اصغر وجاہت کے شاگرد شاعر شیوشرن بندھو ہتھگامی کی جانب سے جاری اعلامیہ کے ذریعے ڈاکٹر اصغر وجاہت کے ڈراما 'مہابلی' کا انتخاب 2021 کے 'ویاس اعزاز' کے لیے کیا گیا ہے۔ تلسی داس پر مبنی یہ کتاب 2019 میں شائع ہوئی تھی۔ اس باوقار ایوارڈ کا فیصلہ ہندی اب کے پروفیسر رام جی تیواری کی سربراہی میں سلیکشن کمیٹی نے کیا۔ اصغر وجاہت نے کہا کہ ڈراما مہابلی تلسی داس اور ان کی کتاب رام چرت مانس کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ تلسی داس نے رام کتھا کو مقبول بنانے کے لیے اودھی زبان میں لکھنے کی پہل کی۔ ڈرامے کا دوسرا رخ تلسی داس اور بادشاہ کے

درمیان تعلقات پر مرکوز ہے۔ تلسی داس دوسرے ہم عصر شاعروں کی طرح کبھی بھی شاہی پناہ میں نہیں گئے۔ 16ویں صدی میں تلسی داس کے ہمعصر مغل شہنشاہ اکبر تھے، جو ملک کے تمام باصلاحیت لوگوں کو اپنے دربار میں لانے کا شوق رکھتے تھے۔ تاریخ یہ ثابت نہیں کرتی کہ اکبر نے تلسی داس کو دربار میں مدعو کیا تھا، مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ اکبر رام اور تلسی داس کی کہانی سے بخوبی واقف تھے، انھوں نے سونے کا ایک سکہ بنایا تھا، جس پر رام اور سیتا کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اس سکے کو رام ٹکا کہا جاتا تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں اور راجہ ٹوڈرمل دو ایسے لوگ تھے جو اکبر کے نورتن بھی تھے اور تلسی داس کے دوست بھی۔

اس ایوارڈ کے لیے اصغر وجاہت کو سوامی وگیانند، ظفر اقبال ظفر، ڈاکٹر اوم پرکاش اوتھی، قمر صدیقی، شیو شرن سنگھ چوہان، انشومالی، رام لکھن سنگھ پریہار، پرانجال، ڈاکٹر وارث انصاری، پریم نند، جمال احمد، راج فتح پوری، شیوم ہتھگامی، کے کے ترپاٹھی، سید عبداللہ جعفری، زرگام، راجندر ساہو، شیو سنگھ ساگر، وشق صنم وغیرہ نے مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 دسمبر 2021

فاروق بخشی

حیدرآباد: معروف شاعر اور نقاد پروفیسر فاروق بخشی کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں صدر شعبۂ اردو مقرر کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے جاری کردہ اعلامیے کے مطابق پروفیسر فاروق بخشی کے عہدۂ صدارت کی مدت دو برس ہوگی۔ پروفیسر فاروق بخشی سابقہ چار دہائیوں سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے 1980 میں اپنے تدریسی کریئر کا آغاز دہلی کے قدیم ادارے سے کیا تھا۔ 1986 میں وہ کوٹہ یونیورسٹی سے ملحقہ پوسٹ گریجویٹ کالج سے وابستہ ہوئے، دو مرتبہ وہاں صدر شعبہ بھی رہے۔ بعد ازاں انھوں نے موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی، اودے پور کے شعبہ اردو میں پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 2017 میں پروفیسر فاروق بخشی نے مرکزی یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے جوائن

کیا۔ ان کے تین شعری مجموعے پلکوں کے سائے، اداس لمحوں کے موسم، وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھوں نے دو درجن سے زائد کتابوں کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ درس و تدریس کے علاوہ پروفیسر فاروق بخشی مختلف تنظیموں اور اکادمیوں کے متعدد مرتبہ صدر اور رکن خاص بھی رہے ہیں نیز انھیں ان کی ادبی خدمات پر مختلف اکادمیوں نے انعام، ایوارڈ اور اعزازی تمغات سے بھی نوازا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 دسمبر 2021

پروفیسر احمد محفوظ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے استاد پروفیسر احمد محفوظ کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اترپردیش کی ایک معروف ادبی تنظیم 'گفتگو' نے 'میر تقی میر' ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ دراصل یوپی کے پریاگ راج (الہ آباد) میں میر تقی میر کی تین سوویں یوم پیدائش پر گفتگو تنظیم نے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیراشتراک ہندوستانی اکیڈمی جشن میر کے عنوان سے ایک پروگرام کا انعقاد کیا۔ ایوارڈ کی حصولیابی پر پروفیسر احمد محفوظ نے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں ان تمام اراکین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے میر تقی میر تین سوویں یوم پیدائش پر جشن کے انعقاد کا فریضہ انجام دیا۔ واضح رہے کہ جس کے زیراہتمام یہ فریضہ انجام دیا گیا وہ ایک معروف ادبی تنظیم 'گفتگو' ہے۔ اس کے سربراہ امتیاز احمد غازی ہیں، وہ گفتگو کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی نکالتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جنوری 2022

سلیمان اختر

نئی دھلی: امریکی سفارت خانہ سے تین زبانوں میں شائع ہونے والی میگزین 'اسپین' کے اردو ایڈیشن کے مدیر ڈاکٹر سید سلیمان اختر کو ایگل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں حال ہی میں منعقد ہوئی ایک پروقار تقریب میں دیا گیا۔ 2012 سے میگزین کی ادارت کررہے سلیمان اختر کو یہ اعزاز اردو اسپین کو نئی بلندیوں تک پہنچانے میں ان کے عزم اور میگزین کو نئے قارئین سے متعارف کرانے کی ان کی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔ اسپین میگزین سفارت خانہ کے امور عامہ کے شعبے کے تحت آنے والے پریس آفس سے شائع ہوتا ہے۔ سلیمان اختر کا آبائی وطن صوبہ بہار کا دربھنگہ ضلع ہے۔ یہاں سے گریجویشن کے بعد انھوں نے جے این یو سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی مکمل کی۔ ماس کمیونیکیشن، ایڈورٹائزنگ اور جرنلزم میں بھی ماسٹرس کرچکے سلیمان اختر نے 'ہندوستان میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو زبان' پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ان کی کتاب 'الیکٹرانک میڈیا کی تاریخ' پر انھیں دہلی اردو اکادمی نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 دسمبر 2021

ستیش ورما

نئی دھلی: نئی دہلی کے وگیان بھون میں غیرسرکاری تنظیم انڈین بریو ہارٹس کی جانب سے مختلف شعبوں میں قابل ستائش کام کرنے والی اہم شخصیات کو سال 2021 کا نیشنل گورو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقعے پر جموں و کشمیر میں راشٹریہ سہارا کے سینئر صحافی و رائٹر ستیش ورما کو نیشنل گورو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی جانب سے یہ ایوارڈ ان کے بھائی صحافی اوم ورما نے حاصل کیا۔ اس موقعے پر یوگی امیش جی مہاراج، سدھانشو جی مہاراج کے علاوہ کئی اہم سیاسی ہستیاں موجود رہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 31 دسمبر 2021

طوبیٰ رقیہ

نئی دھلی: الجامعہ اسلامیہ شانتاپورم کیرالہ کی طالبہ طوبیٰ رقیہ نے قومی سطح کے عربی خطاطی کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا ہے۔ اس مقابلے کا اہتمام نئی دہلی واقع سعودی عرب کے سفارت خانہ نے بین الاقوامی عربی دن کی تقریب کے ایک حصے کے طور پر کیا تھا۔ مقابلہ دو مرحلوں میں منعقد ہوا۔ پہلے مرحلے میں ملک بھر کے اسلامی اعلیٰ تعلیمی اداروں سے دو دو طلبا نے آن لائن موڈ میں حصہ لیا۔ ان میں سے منتخب پانچ امیدواروں کو 18 دسمبر 2021 کو سنٹر فار انفارمیشن ٹیکنالوجی، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہونے والے فائنل راؤنڈ کے لیے نئی دہلی مدعو کیا گیا تھا۔ طوبیٰ رقیہ نے احمد بن محمد الکہتانی کی موجودگی میں استاد ماجد بن عبدالرحمٰن العتیبی سے ایوارڈ حاصل کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 دسمبر 2021

رسم اجرا

طالب جونپوری کے 100 شعر

پریاگ راج: ادب گھر کریلی میں طالب جونپوری کے شعری مجموعہ 'طالب جونپوری کے 100 شعر' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر فلمی دنیا کے نغمہ نگار ابراہیم اشک نے مذکورہ مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ طالب کی شاعری میں حقیقت کی عکاسی ہے اور ان کی شاعری گنگا جمنی تہذیب سے رچی بسی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی شاعری میں ادب کی وراثت دکھائی دیتی ہے۔ 'گفتگو کے صدر امتیاز احمد غازی نے کہا کہ طالب جونپوری نے شاعری کے سارے رموز اور بحور سے واقفیت حاصل کی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ نسل نو کی شاعری میں زبان و بیان کا شعور بہت کم ہوگیا ہے لیکن طالب جونپوری کی شاعری میں لاجواب شعور ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ حب الوطنی جھلکتی ہے جس کی وجہ سے وہ آج کے دور ایک کامیاب شاعر ہیں۔ پروگرام کی صدارت کررہے روی نندن سنگھ نے کہا کہ طالب جونپوری کی شاعری میں معاشرے کے تئیں الگ سے فکر اور راہ راست صاف طور سے دکھائی دیتی ہے۔ پروگرام کی نظامت سردار منموہن سنگھ تنہا نے کی۔

دوسرے مرحلے میں مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں عشق سلطانپوری، اہل بانو، شیلیندر جے، نریش مہارانی، انا الہ آبادی، راجیو نسیم، نینا موہن شریواستو، سوربھ شریواستو، مہک جونپوری، اسد غازی پوری، سلال الہ آبادی، پرکاش سنگھ اشک، شاہد علی شاہد، شریف الہ آبادی وغیرہ نے شرکت کی اور بہترین اشعار سنائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جنوری 2022

ایک شجر سایہ دار

امروهه: 5 دسمبر کی شب شہر کی مشہور ثقافتی تنظیم کاروانِ خلوص کے صدر محبوب حسین زیدی کی کتاب 'ایک شجر سایہ دار' کے نئے ایڈیشن کی رسم اجرا اردو ادب کی نامور شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مہمان خصوصی جسٹس شبیہ الحسنین، پروفیسر وسیم بریلوی اور اردو ادب کی نامور شخصیت کامنا پرساد نے شمع روشن کرکے پروگرام کا آغاز کیا۔ مہمانوں کا استقبال تنظیم کے جنرل سکریٹری اور بار ایسوی ایشن کے سابق صدر ایم اسلام عالمی نے کیا۔ مقررین نے امروہہ شہر کو منفرد قرار دیتے ہوئے آج کے دور میں کتابوں اور ادبی پروگراموں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ جسٹس شبیہ الحسنین شاستری نے کہا کہ امروہہ نے پوری دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کیا ہے۔ جشن بہار کی کنوینر محترمہ کامنا پرساد نے کہا کہ امروہہ نے ہر دور میں مشہور شخصیات پیدا کی ہیں۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمان خان، پروفیسر وسیم بریلوی، اظہر عنایتی، آئی اے ایس ڈاکٹر اکھلیش کمار مشرا، منصور عثمانی، پاپولر میرٹھی، شکیل شمسی نے بھی کتاب کے تناظر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 دسمبر 2021

جگدیش پرکاش: فکروفن، اور ایک قدم اور

نئی دهلی: انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں معروف مصنف جگدیش پرکاش کی تخلیق 'ایک قدم اور' اور آصف اعظمی کی تخلیق 'جگدیش پرکاش فکروفن' کا اجرا اہم ترین شخصیت کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ انڈین ڈیولپمنٹ اینڈ ایجوکیشنل ایسوی ایٹ (آئیڈیا کمیونی کیشن) کے زیر اہتمام منعقدہ پروقار تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے کیرالہ کے گورنر عارف محمد خان نے کہا کہ اردو ایک متعارف ہندوستانی زبان ہے جو پرکشش ہے، یہ ہمارا قیمتی ورثہ بھی ہے۔ جو چیز قیمتی ہے اس کی حفاظت زیادہ درکار ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، بلکہ زبان ایک تہذیب کا نام ہے۔ انھوں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کسی ایک طبقے کا نہیں بلکہ ایک مشترکہ سرمایہ ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جگدیش پرکاش نے اس زمانے میں اس بات کو جھٹلایا ہے کہ اردو زبان کسی مذہب اور فرقہ کی زبان ہے، جگدیش پرکاش نے تقسیم ہند کے بعد نفرت کا نہیں بلکہ محبت کا کام کیا ہے جو قابل مبارکباد ہے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے سچیدانند جوشی نے کہا کہ جگدیش پرکاش اس طرح لکھتے ہیں کہ ان کی زبان سے پھول جھڑتے ہیں، ہم دعا گو ہیں کہ وہ مستقل ایسے ہی لکھتے رہیں۔ سچیدانند جوشی نے کہا کہ ان کی تحریروں میں سنسکرتی اور پراکرتی کی خاص جھلک نظر آتی ہے اور ان کی یہ 21 مضامین پر مشتمل کتاب اردو تہذیب وثقافت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ جشن بہار کے روح رواں کامنا پرساد نے کہا کہ جگدیش پرکاش کا پیشہ شاعری نہیں ہے، مگر وہ اردو زبان سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی 11 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اردو میڈیم لاہور سے انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ان کے مشہور کلام ہندی فلموں کی بھی زینت بن چکے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان اخوت ومحبت اور خالص ہندوستانی زبان ہے جو مکمل تہذیب بھی ہے اور ہماری شخصیت کی عکاس بھی ہے۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ جات اور اردو ادب سے وابستہ اہم شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 دسمبر 2021

اسکالرشپ اسکیمیں

مالیگاؤں: مشہور ماہر تعلیم، کئی کتابوں کے مصنف اور کیریئر رہنما اشفاق عمر نے طلبہ کے لیے اسکالرشپ اسکیم کی معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا کہ 'اسکالرشپ اسکیمیں' میں 81 اسکالرشپ اسکیموں کا ذکر موجود ہے جس سے طلبہ اپنی زندگی میں تعلیمی منزل طے کرنے کے لیے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے صبا لینڈ ڈیولپرز کی معاونت سے 'اسکالرشپ اسکیمیں' کی رسم اجرا کے موقعے پر کہیں۔ انھوں نے کتاب 'اسکالرشپ اسکیمیں' سے متعلق تفصیلات بتائیں کہ اس کتاب میں جماعت اوّل سے تعلیم کی آخری منزل تک اور اندرون ملک اور بیرون ملک ہر کورس کے لیے گورنمنٹ اور مختلف اداروں کی جاری کردہ اسکالرشپ اسکیموں کی تفصیلی معلومات درج کی گئی ہیں۔ کتاب میں تعلیمی منصوبہ بندی کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کی مدد سے ہم اپنے بچوں کو ایک بہترین زندگی دے سکتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ وقت میں اسکالرشپ اسکیموں سے متعلق بہت تفصیلی وسیر حاصل گفتگو کی۔ کتاب 'اسکالرشپ اسکیموں' کی رسم اجرا اشفاق عمر کے صاحبزادے محمد عزیز اور دیگر کے ہاتھوں انجام پائی۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر نشین مشیر احمد انصاری (ممبئی) نے کہا کہ ایسی مفید اسکیموں کی معلومات اسکولوں میں طلبہ تک راست پہنچے تو قوم کو اس سے بے پناہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اس قسم کے تعلیمی فلاحی کاموں کے لیے ایک مرکز کے قیام کی اہمیت پر زور دیا۔ شہر کے معروف سرجن ڈاکٹر سعید احمد فیضی نے قوم کے موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے تلقین کی کہ وقت کو ضائع کرنے سے بچنا چاہیے اور اپنے مقصد کی جانب گامزن رہنا چاہیے۔ سی سی آئی کے صدر پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نے موجودہ وقت میں اسکالرشپ کی اسکیموں کی اہمیت کو وضاحت سے سامعین کے سامنے پیش کیا۔ محمدیہ طبیہ کالج کے سابق پرنسپل عرفان احمد انصاری نے مہنگی ترین اعلیٰ تعلیم کے حصول میں اسکالرشپ اسکیموں کے مثبت کردار پر روشنی ڈالی۔ عبدالرحیم چڑے والے صاحب نے زور دے کر کہا کہ اسکالرشپ

اسکیموں کے موضوع پر غریب اور سلم علاقوں میں محنت کرنے کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ غربت ترک تعلیم کی وجہ نہ بن سکے۔ پروگرام کا آغاز قاری عدنان احمد پریاگی کی قرأت سے ہوا۔ ابتدائی کلمات ادا کرتے ہوئے کنویز احمد ایوبی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 دسمبر 2021

ہوامحل

گلبرگہ: منظور وقار مقبول اور کامیاب ادیب ہیں انھوں نے جہاں طنز و مزاح افسانہ، افسانچہ اور خاکہ اور خاکہ نگاری کے میدان میں اپنی قلمی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے، وہیں بچوں کی کہانیوں کی کتاب 'ہوامحل' کی اشاعت عمل میں لاکر ایک قابل ستائش کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار صدر اجلاس پروفیسر جلیل تنویر نے کیا۔ پروفیسر جلیل تنویر کاغذ پبلشرز گلبرگہ کے زیر اہتمام 19/دسمبر 2021 کو رشید جاوید ہال گلبرگہ میں منعقد جلسہ اجرا سے مخاطب تھے۔ پروفیسر جلیل تنویر نے مزید کہا کہ منظور وقار کی کتاب اور ادب اطفال کی دیگر کتابیں بچوں کے مطالعہ کے لیے اُردو میڈیم اسکولوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہے۔ جلسے کے آغاز میں ڈاکٹر غضنفر اقبال (ڈائریکٹر کاغذ پبلشرز گلبرگہ) نے صدر جلسہ، مہمانان خصوصی اور سامعین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ منظور وقار ایک ہمہ جہت قلمکار ہیں۔ ہوامحل کی اشاعت ان کی قلمی کاوشوں کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ رسم اجرا میں شریک مہمانان خصوصی جناب عزیز اللہ سرمست (سینئر صحافی و ادیب) ڈاکٹر انیس صدیقی (ممتاز نقاد و انشاریہ ساز) جناب واجد اختر صدیقی (معروف شاعر و ادیب) اور جناب سراج وجیہہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ منظور وقار ایک برق رفتار قلمکار ہیں ان کی ہمہ رنگ و ہمہ جہت کاوشیں حیرت انگیز ہیں جناب عثمان باشاہ اور واجد اختر صدیقی نے ایک ہزار ایک روپے میں ایک ایک کتاب خرید کر کتابیں خریدنے کے چلن کو عام کیا سراج وجیہہ تیر انداز، خواجہ گیسودراز اور دیگر احباب نے ہوامحل کی اشاعت و رسم اجرا پر منظور وقار کو تہنیت پیش کی۔ جاوید اقبال صدیقی

منظور وقار کی کتاب 'ہوامحل' کے اجرا کا منظر

نے نظامت کے فرائض بہ حسن خوبی انجام دیے، ناصر عظیم نے شکریہ ادا کیا۔ جلسے میں شہر کے ادبا و شعرا اور ادب ذوق احباب کی کثیر تعداد موجود تھی۔

رپورٹ: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، کرناٹک، 22 دسمبر 2021

جہانِ ادب کے سیاح: ڈاکٹر امام اعظم

دربھنگہ: 11 دسمبر بروز ہفتہ پروفیسر خالد حسین خاں (سابق صدر، شعبۂ اردو، میرٹھ یونیورسٹی مقیم شاہجہاں پور، یوپی) کی کتاب 'جہانِ ادب کے سیاح: ڈاکٹر امام اعظم'

پروفیسر مشتاق احمد، پروفیسر آفتاب اشرف اور پروفیسر افتخار احمد کو ڈاکٹر امام اعظم کے ذریعے پیش کی گئی۔ پروفیسر مشتاق احمد نے کتاب ملنے پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی خدمت میں منہمک قلم کاروں اور ان کی خدمات کا اعتراف لازمی ہے۔ ایسا ہی ایک اعتراف نامہ اس کتاب کی صورت میں میرے ہاتھوں میں ہے جو پروفیسر خالد حسین خاں کی تخلیق ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی تین کتابوں اور ان پر لکھی گئیں تین کتابوں کا مبسوط تجزیہ پروفیسر موصوف نے کیا ہے جو ایک اہم کام ہے۔ موصوف اپنے خوبصورت اسلوب اور طرزِ تحریر کے لیے اردو دنیا میں معروف ہیں۔ پروفیسر آفتاب اشرف نے اس کتاب کے حوالے سے اپنی گفتگو میں کہا کہ پروفیسر خالد حسین خاں نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے یہ کتاب قلم بند کی ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کی گلابی طرزِ تحریر بے حد متاثر کن ہوتی ہے۔ ایک کتاب میں چھ کتابوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو اپنے آپ میں اہم ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گی۔ پروفیسر افتخار احمد نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر خالد حسین خاں کا قلم رواں دواں ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 دسمبر 2021

امروہہ کی دس عالمی شخصیات

امروھہ: ہمیں اپنے مذہبی رہنماؤں، بزرگوں، مجاہدین آزادی اور مختلف شعبوں میں امروہہ کا نام دنیا بھر میں روشن کرنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ آنے والی نسلیں ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی تاریخ لکھ سکیں کیونکہ آج کی سرگرمیاں کل کی تاریخ ہے۔ ان خیالات کا اظہار صدر ایم ایل اے اور صدر اتر پردیش پبلک اکاؤنٹس کمیٹی حاجی محبوب علی نے آج بجنور روڈ پر واقع نشا پیلس میں مسلم کمیٹی امروہہ کے زیر اہتمام امروہہ کی دس عالمی شخصیات پر مبنی کتاب کی رسم اجرا تقریب میں کیا۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے معروف فلمساز کمال امروہوی کی صاحبزادی رخسار کمال نے کہا کہ امروہہ آج بھی ان کے رگ و ریشے میں بسا ہوا ہے، بابا کی وراثت کے تحفظ کے لیے امروہہ میں آتی ہوں، تو کتابوں، تصویروں، جوتوں اور کپڑوں کی دھول صاف کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں۔ ضلع پنچایت کے صدر شیو سوروپ ٹنڈن نے امروہہ کی شاندار روایت کو دنیا کے سامنے اپنی شناخت قرار دیا۔ اویس مصطفیٰ رضوی اور کتاب کے مصنف پروفیسر ناشر نقوی نے کہا کہ کتاب میں امروہہ کی اہم شخصیات کو شامل کیا گیا ہے، جنھوں نے اپنے فن سے دنیا بھر میں امروہہ کا نام روشن کیا۔ بحر سائنس میں بھٹناگر ایوارڈ حاصل کرنے والے ڈاکٹر وجیہ احمد نقوی نے کہا کہ امروہہ کے وشنو سہائے اور بھگون سہائے نے حکومت ہند میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا اور وہ دونوں مختلف صوبوں کے گورنر اور چیف سکریٹری رہ چکے ہیں۔ مسلم کمیٹی کی تاریخ پیش کرتے ہوئے کنویز مہتاب علی نے سابق صدر مرحوم آفتاب سیفی اور موجودہ صدر حاجی نسیم خان کی کوششوں سے قائم ہونے والے اس ادارے کے موجودہ کام کا جائزہ لیا اور امروہہ کی جاری خدمات کو اہل امروہہ کے لیے اہم قرار دیا۔ مفتی عبدالرزاق استاد حدیث نے امروہہ سے اپنی وابستگی اور مختلف شعبوں میں یہاں کے لوگوں کی جانب سے کی جانے والی خدمات پر روشنی ڈالی جب کہ معروف شاعر خورشید حیدر مظفر نگری نے اپنی غزلیں سنا کر خواب داد سمیٹی۔ بھونیس کمار شرما، ڈاکٹر جمشید کمال، حاجی خورشید انور، سرتاج عالم منصوری وغیرہ مقررین نے اس کتاب کو امروہہ کی ایک اہم دستاویز قرار دیا۔ پروگرام کی نظامت مسلم کمیٹی کے ترجمان منصور احمد ایڈووکیٹ نے کی۔ آخر میں صدر مسلم کمیٹی حاجی نسیم خان نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2021

'دردتہ جام' اور 'عزیز بگھروی ایک انقلابی شاعر'

حاجی پور: ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ادیب اور ناقد کی حیثیت سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ وہ اپنی کتابوں کے حوالے سے ہمیشہ اردو ادب میں زندہ رہیں گے۔ انھوں نے کلاس روم کے اندر اور باہر اپنے شاگردوں کی ادبی پرورش بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ کی۔ یہ باتیں بی پی ایس سی پٹنہ کے رکن امتیاز احمد کریمی نے 'کاروان ادب' حاجی پور کی جانب سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اور ڈاکٹر لطیف احمد خان کی کتابوں کی رسم اجرا کے موقعے سے منعقد پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ممتاز احمد خاں نے اردو تحریک کی سمت میں ہمیں جو راہ دکھائی ہے، ہمیں اسے آگے بڑھانا ہے، یہی ممتاز احمد خاں کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے کہا کہ ڈاکٹر استاد ممتاز احمد خاں نے مسلسل نصف صدی تک اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ انھوں نے اپنی پوری توانائی ادب و شاعری اور اردو تحریک میں جھونک دی۔ انھوں نے علم کا دریا بہایا اور اپنا لہو اردو کے لیے خرچ کیا۔ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ عصر حاضر کے ممتاز ادیب و دانشور تھے، ان کی شخصیت کئی اعتبار سے لائق ستائش، لائق فخر و لائق تقلید ہے۔ ضلع ویشالی کو ان کی شخصیت پر ناز تھا ہے اور رہے گا۔ اس موقعے پر پروفیسر ابوالحیات نے کہا کہ مرحوم ڈاکٹر خان میرے استاذ گرامی تھے۔ وہ شرافت وتہذیب کے اعلیٰ نمونہ، علمیت وقابلیت کے مجسمہ اور اعلیٰ اخلاق وکردار کے پیکر تھے۔ ان کی ذات گرامی نے بہتوں کو فیض پہنچایا۔ اسسٹنٹ پروفیسر کامران غنی صبا نے کہا کہ بحیثیت استاد ممتاز احمد خاں مثالی تھے، ادب وشاعری اور تنقید وتحقیق سے ان کا رشتہ بھی مثالی ہے۔ وہ فنافی الادب تھے اور وہ اپنے شاگردوں کے دل میں زندہ تھے اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی کتاب 'دردتہ جام' اور ڈاکٹر لطیف احمد خاں کی کتاب 'عزیز بگھروی: ایک انقلابی شاعر' کا اجرا مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر لطیف احمد خاں کی کتاب 'عزیز بگھروی: ایک انقلابی شاعر' پر کاروان ادب حاجی پور کے جنرل سکریٹری انوارالحسن وسطوی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جنوری 2022

آئینہ اردو صحافت

مراد آباد: سالنامہ آئینہ اردو صحافت کی سالانہ رسم اجرا تقریب 2 جنوری کو کمپنی باغ واقع سینانی بھون میں منعقد ہوئی۔ مرتضیٰ اقبال کا مرتب کردہ یہ رسالے کا ساتواں ایڈیشن ہے۔ اس پر سب نے انھیں مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر مقررین نے صحافت کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ رسم اجرا تقریب کی صدارت سینئر صحافی ایم کے پوربی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر رباب انجم نے سرانجام دیے۔ منتظمین کی جانب سے مہمانوں کو اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جنوری 2022

پلازمہ

رانچی: انجمن بقائے ادب رانچی (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام

جناب امتیاز غدر صاحب کے افسانوں کا مجموعہ 'پلازمہ' کا اجرا ایک سادہ مگر پروقار تقریب میں بدست مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد خان، سابق وائس چانسلر، رانچی یونیورسٹی، مہمان اعزازی، جناب حسیب اختر سابق ڈی ڈی سی کوڈرما، تقریب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کلیروی، سابق شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، ناظم تقریب جناب نصیر افسر وجنرل سکریٹری، انجمن بقائے ادب رانچی ودیگر معززین کے ہاتھوں 26 دسمبر بروز اتوار بوقت گیارہ بجے دن انجمن اسلامیہ رانچی کے رحمانیہ مسافر خانہ ہال میں عمل میں آیا۔ سب سے پہلے مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد خان، سابق وائس چانسلر، رانچی یونیورسٹی، صدر تقریب پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کلیروی، سابق صدر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی ومہمان اعزازی جناب حسیب اختر صاحب، سابق ڈی ڈی سی، کوڈرما وصاحب کتاب جناب امتیاز غدر صاحب کو گلدستہ و مومنٹو پیش کر کے استقبال کیا گیا۔ بعد ازاں مہمان خصوصی نے شمع روشن کر کے تقریب کا آغاز کیا۔ جناب نصیر افسر نے استقبالیہ خطاب پیش کیا۔ معززین کے ہاتھوں جناب امتیاز غدر کے افسانوں کا مجموعہ 'پلازمہ' کی رونمائی ہوئی۔ مہمان خصوصی نے کہا کہ پلازمہ کے افسانوں کا محور دراصل مہلک بیماری کورونا ہے اور اس کے کردار اسی کے آس پاس نظر آتے ہیں۔ صدر محفل نے اپنے خطاب میں کہا کہ مہلک بیماری کورونا مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ دوسرے نام اومی کرون سے پوری دنیا میں اپنے پاؤں پھیلا رہی ہے۔ ایسے میں کورونا سے متعلق امتیاز صاحب کے افسانوں کا مجموعہ پلازمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مہمان اعزازی نے کہا کہ افسانوں کا مجموعہ پلازمہ انسانوں کے لیے ایک تنبیہ سے کم نہیں ہے۔ موجودہ دور میں ایسی کتابوں کا منظر عام پر آنا خوش آئند ہے۔ نظامت کے فرائض انجمن بقائے ادب رانچی کے جنرل سکریٹری جناب نصیر افسر نے انجام دیے۔ انجمن بقائے ادب رانچی کے سکریٹری جناب محمد سمیع اللہ خان اصدقی کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام ختم ہوا۔

روزنامہ 'الحیات' رانچی، 27 دسمبر 2021

یونانی میڈیسن انڈیکس

نئی دہلی: جامعہ ہمدرد کے نیشنل فاؤنڈیشن میں پہلی یونانی میڈیسن انڈیکس کی رسم اجرا اوڈما کے صدر حامد احمد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ یہ کتاب اولیا ہربل کنسل فینسی کمپنی کے ایما پر منظر عام پر آئی جس کو تمام ڈاکٹروں کی نگرانی میں مرتب کیا گیا۔ اس موقعے پر جامعہ ہمدرد کے چانسلر حامد احمد نے کہا کہ اس کتاب کی اہمیت وہ حضرات اچھی طرح سمجھیں گے جنھیں ادویات کو تلاش کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ اس سے انھیں تمام امراض کے علاج میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ یونانی میڈیسن انڈیکس میں تمام دواساز کمپنیوں کے ذریعے بنائی جارہی ادویات کی تفصیلی معلومات موجود ہیں۔ اہم شرکا میں حکیم محسن دہلوی، مطیع اللہ مجید، حکیم ارباب الدین، پرویز احمد جلیس احمد، حکیم عذیر بقائی، حکیم نبیل احمد اور اوڈما کے کوآرڈینیٹر نوشاد احمد بھی موجود رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 جنوری 2022

گلستانِ ہند

نئی دهلی: ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں ڈاکٹر تقی عابدی کی تدوین کردہ کتاب ’گلستان ہند‘ بال مکند بے صبرؔ کا اساتذہ اور دانشوران کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ واضح رہے کہ ’گلستان ہند‘ منشی بال مکند بے صبر کی تصنیف ہے جو پہلی بار 1871 میں شائع ہوئی تھی۔ تاہم اس کا آج ایک بھی نسخہ دستیاب نہیں ہے، سوائے اس ایک نسخے کے جو ڈاکٹر تقی عابدی کی ذاتی لائبریری کنیڈا میں موجود ہے۔ لہٰذا ڈیڑھ سو سال بعد ڈاکٹر تقی عابدی نے تحقیق و تدوین کے بعد اس نسخے کی اشاعت کی۔ منشی بال مکند بے صبر غالب کے شاگرد اور ہرگوپال تفتہ کے بھانجے تھے۔ اردو فارسی کے بہترین شاعر اور علم عروض و قوافی کے ماہر تھے۔ اس کتاب کے محقق کے بقول یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو سعدی شیرازی کی گلستان کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ کتاب حسن یوسف کی طرح ہے جو اب تک کنویں میں بند تھی لیکن اب یہ دنیا کے سامنے پیش کردی گئی ہے جس کی روشنی ادبی دنیا کو یقیناً منور کرے گی۔ ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے چیئرمین پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور تقی عابدی کی اس کتاب کو ایک بازیافت اور اردو تحقیق کے باب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ پروگرام کی مہمان خصوصی کامنا پرساد نے اپنی گفتگو میں کہا کہ بے صبر کی اردو اگرچہ آج نہیں بولی جاتی لیکن اس کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت بہر حال ضرور ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کتاب کا انتساب کامنا پرساد کے نام کیا ہے جو اردو کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہیں۔ اس پروگرام میں صدارت کے فرائض ڈاکٹر اطہر فاروقی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر خلیل الرحمٰن سینئر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ، روی کانت مشرا نہرو میموریل لائبریری، ہندی کے نامور ادیب و شاعر پروفیسر جیتندر، کمارا گنو نے بہت اہم گفتگو کی اور پروفیسر رضوان الرحمٰن، ڈاکٹر توحید خان، ڈاکٹر سمیع الرحمٰن، ڈاکٹر محسن، ڈاکٹر شفیع ایوب اور ڈاکٹر لیاقت کے علاوہ ریسرچ اسکالروں نے بھی شرکت کی۔ جب کہ تالیف حیدر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روز نامہ ’میرا وطن‘، دہلی، 1 جنوری 2022

اختتام

امروهه: شہر امروہہ کے ایوان گلزار میں ایک منفرد شعری تخلیق ’اختتام‘ کی رونمائی استاد شاعر مرزا ساجد حسین اور ماہر قانون اسلام عالمی و دیگر اہم شخصیات کے دست مبارک سے عمل میں لائی گئی۔ یہ ایک منفرد قسم کی شاعری پر مبنی کتاب تھی جس کو اہل علم و ادب نے بہت پسند کیا۔ شعری اور افسانوی مجموعے کی رسم اجرا تو اکثر سننے اور دیکھنے کو ملتی ہے لیکن کسی ایسے مجموعے کے اجرا کی تقریب پہلی مرتبہ منعقد ہوئی جو قطعات تاریخ پر مبنی ہو۔ محمد شکور کوثر امروہوی فن تاریخ گوئی میں ماہر ہیں۔ انھوں نے سیکڑوں شخصیات کی وفات پر قطعات تاریخ نظم کیے ہیں۔ ان ہی قطعات تاریخ پر مبنی ان کا مجموعہ ’اختتام‘ منظر عام پر آیا ہے۔ ’اختتام‘ نامی اس مجموعے کی رسم اجرا امروہہ کی معروف علمی اور ادبی ہستی مرزا ساجد امروہوی کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقعے پر فن تاریخ گوئی پر معروف مصنف اور ناقد ڈاکٹر مصباح صدیقی نے ایک مقالہ بھی پیش کیا۔ ڈاکٹر مصباح نے تاریخ گوئی کی فنی باریکیوں کو بیان کرتے ہوئے قطعات تاریخ کی قسمیں بتائیں۔ ڈاکٹر مصباح صدیقی کے مطابق ایک ہی مصرع میں وفات یا پیدائش کا سن نکال لینا سب سے مشکل کام ہے۔ فنی باریکیوں کی روشنی میں ڈاکٹر مصباح صدیقی نے کہا کہ کوثر امروہوی کے نظم کردہ تمام قطعات میں تاریخ چوتھے مصرع سے برآمد ہوتی ہے جسے محض الہام ہی کہا جاسکتا ہے۔ ’اختتام‘ میں دو سو سے زائد شخصیات کی وفات پر نظم کیے گئے پانچ سو سے زائد قطعات تاریخ شامل ہیں۔

روز نامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 1 جنوری 2022

پتنگ

ممبئی: سائنس کو اردو ادب سے جوڑنے والی بچوں کی

ادیب شاہ تاج خان کی کتاب ’پتنگ‘ کے دوسرے ایڈیشن کے اجرا کی رسم 3 جنوری بروز پیر بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ ضلع پریشد اردو اسکول وٹی میں منعقد کی گئی۔ یہ اجرا کی تقریب اس لیے بھی انوکھی ثابت ہوئی کہ یہ رسم اپنے روایتی انداز سے پرے ضلع پریشد اردو اسکول کے طلبہ کے ہاتھوں سے انجام دی گئی تھی۔ اس پر رونق تقریب کی صدارت ڈرامہ نگار و آنگیا پال گھر کے سکریٹری جناب نعیم احمد صاحب نے کی۔ اس موقعے پر آنگیا پال گھر کے سینئر رکن سلیم عمرانی اور صدر تنویر احمد اور گریجویٹ معلمہ حنا کوثر موجود تھیں۔ تنویر احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ شاہ تاج خان کی کتاب پتنگ کی پہلی جلد کا اجرا بھی ضلع پریشد اردو اسکول کے طلبہ کے ہاتھوں انجام پایا تھا اور اس کے دوسرے ایڈیشن کا اجرا بھی آج بچوں کے ہاتھوں انجام پایا۔ آپ نے کہا کہ یہ کتاب بچوں کی کتاب ہے تو بچوں کے ہی ہاتھوں اس کا اجرا کیا جانا ادب اطفال کی دنیا میں ایک نئی شروعات ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ اس نئی شروعات سے طلبہ میں کتاب کو پڑھنے کا تجسس بڑھے گا اور وہ بڑی اپنائیت کے ساتھ کتاب کے مطالعہ کی جانب راغب ہوں گے۔

آخر میں اس تقریب کے صدر جناب نعیم احمد صاحب نے اظہار خیال کرتے ہوئے طلبہ سے کہا کہ وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں کیوں کہ ان سائنسی کہانیوں کے مجموعہ کو آپ کے لیے مصنفہ نے بڑے پیار سے مرتب کیا ہے کہ کہانیوں کے انداز میں آپ کو سائنسی تصورات کو سمجھنے میں آسانی ہو اور آپ کو مزا بھی آئے۔ آپ نے کہا کہ اردو ادب میں سائنسی کہانیاں شائع کر کے شاہ تاج خان نے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ہے۔ آپ نے طلبہ سے کہا کہ آؤ کتابوں سے دوستی کریں مہم کے تحت گشتی لائبریری میں ایسی بہت سی پیاری پیاری کتابیں طلبہ کے لیے رکھی گئی ہیں، آپ طلبہ ان کتابوں سے ضرور دوستی کریں کیونکہ اچھی کتابیں اپنے دوستوں کو بام عروج پر پہنچا دیتی ہیں۔ اس پروقار تقریب کے آخر میں ضلع پریشد اردو اسکول وٹی کے طلبہ کے لیے آنگیا پال گھر کی جانب سے اے پی جے عبدالکلام گشتی لائبریری کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: شاہ تاج خان، مہاراشٹر، 4 جنوری 2022

اضطراب بیکل

غازی پور: سیورائی تحصیل کے گاؤں موضع بارا واقع گلشن محمود کے صحن میں 29 دسمبر کے روز بارا ساہتیہ منچ کے

زیر اہتمام ایک ادبی اور شعری نشست منعقد ہوئی جس میں ثروت محمود خاں کا مرتب کردہ اور باراساہتیہ منچ کی جانب سے شائع کردہ گاؤں کے بزرگ استاد شاعر رستم خاں بکِل باروی کا مجموعۂ کلام 'اضطراب بکِل' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق وزیر سیاحت اوم پرکاش سنگھ اور مہمانان اعزازی کی حیثیت سے مولانا ارشد سراج مکی، ماسٹر منصور عالم خاں اور آمینہ خاتون پرنسپل فاطمہ گرلس انٹر کالج نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت حاجی منصور خاں اور نظامت ڈاکٹر ناہیدہ خاتون نے انجام دی۔ مہمان خصوصی اوم پرکاش سنگھ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ملک کی آزادی میں قربانی سے لے کر ادبی اور ثقافتی شعبوں میں موضع بارا کی شراکت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی روایت کا نتیجہ 'اضطراب بکِل' ہے، جسے ثروت محمود خاں نے مرتب کرکے باراساہتیہ منچ کے زیر سایہ شائع کیا ہے۔ اعزازی مہمانان مولانا ارشد سراج مکی، ماسٹر منصور عالم خاں اور آمینہ خاتون نے شعری مجموعۂ کلام 'اضطراب بکِل' پر اپنے تجزیاتی تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ رستم خاں بکِل کی شاعری حالات حاضرہ کی آئینہ دار بھی ہے اور اردو شاعری کا ایک نمونہ بھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 دسمبر 2021

اردو کی ترویج واشاعت میں غیر مسلموں کی خدمات

نئی دهلی: خسرو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع کردہ کتاب 'اردو کی ترویج و اشاعت میں غیر مسلموں کی خدمات' کی رسم رونمائی ہوئی۔ کتاب کے مصنف تالیف حیدر ہیں۔ تقریب رونمائی میں جشن بہار ٹرسٹ کی بانی محترمہ کامنا پرساد مہمان خصوصی جب کہ بزرگ شاعر پی پی سریواستو رند مہمان اعزازی تھے۔ صدارت انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی۔ کامنا پرساد نے کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اردو زبان ہمیشہ سے مشترکہ تہذیب کی علامت رہی ہے اور ہندوستان میں بہت سے ہندو، سکھ او دیگر مذاہب کے پیروکار شعرا اور شاعرات نے اپنی مادری زبان سے زیادہ اردو زبان میں شاعری کی اور شہرت پائی۔ بنیادی طور پر اردو انسانی اتحاد کی نمائندہ زبان ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں منعقد اس تقریب میں خسرو فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹرس شری روہت کھیڑا، سراج الدین قریشی، شری رنجن مکھرجی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پہلی خاتون پرو وائس چانسلر پروفیسر تسنیم فاطمہ، اردو کے مشہور نقاد، شاعر اور دہلی اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں اردو کے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، شکاگو سے آئی ہوئی مہمان محترمہ ہما احمد، وزارت ثقافت کے ڈائرکٹر شری سنجے گرگ، مشہور شاعر ذکی طارق شریک تھے۔ خسرو فاؤنڈیشن کے چیئرمین پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے استقبالیہ خطبے میں خسرو فاؤنڈیشن کے قیام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمارا مقصد موجودہ حالات میں معاشرے کو جوڑنا ہے۔ ہم سیاست سے اوپر اٹھ کر لوگوں کو قریب لانا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تالیف حیدر کو اس موضوع کے ساتھ اپنے مشن کا حصہ اس لیے بنایا گیا کہ وہ نوجوان ہیں اور معاشرے کو جوڑنے کا کام اب نئی نسل کو کرنا ہوگا۔ ہم ہندی کے فروغ میں مسلمانوں کے اہم کردار کو بھی اجاگر کرنے پر کام کرا رہے ہیں جسے بہت جلد کتابی شکل میں سامنے لایا جائے گا۔ مہمان اعزازی پی پی شریواستو 'رند' کا پیغام ان کی موجودگی میں ذکی طارق نے پیش کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خسرو فاؤنڈیشن کی اس پہل کی نہ صرف ستائش کی بلکہ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اگر ممکن ہوا تو مستقبل میں انجمن ترقی اردو (ہند) بھی فاؤنڈیشن کی کسی بھی علمی و ادبی سرگرمی میں شریک ہوسکتی ہے۔ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے بلاشبہ ہندوستان میں ایسے لوگوں نے کام کیا ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں رہی ہے۔ یہی ملک کی تہذیب اور وراثت کی خوبصورتی کا نمایاں پہلو ہے۔ جلسے کے اختتام پر خسرو فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر اور انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 22 دسمبر 2021

وفیات

پروفیسر حسین الحق

پٹنه: اردو کے مشہور ناول نگار اور مگدھ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر حسین الحق کا 23 دسمبر کی صبح ایک ہسپتال میں دوران علاج انتقال ہوگیا۔ وہ 72 سال کے تھے اور تقریباً دو ڈھائی سال سے گلے کے کینسر میں مبتلا تھے جس میں علاج سے افاقہ تھا لیکن پچھلے ہفتہ ان کی طبیعت اچانک

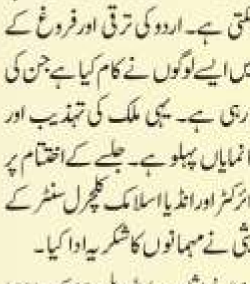

بگڑ گئی اور ان کو پٹنہ کے میدانتا ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی تدفین بعد نماز جمعہ آبائی وطن سہسرام میں کی گئی۔ وہ سہسرام کی مشہور خانقاہ دائرہ حضرت وصی کے سجادہ نشین بھی تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے انجینئر شارع علی حق اور ڈاکٹر شعور ناز ش اور دو بیٹیاں ایما اور ایمن شامل ہیں۔ مشہور شاعر پروفیسر عین تابش اور زین رامش ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مرحوم کو اسی سال مارچ میں ان کے ناول 'اماوس میں خواب' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا۔ مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے ہی صدر شعبہ کی حیثیت سے 2013 میں وظیفہ یاب ہوئے۔ وہ ڈیڑھ سو سے زیادہ افسانوں اور تین ناولوں کے خالق ہیں۔ ان کا پہلا ناول 'بولو مت چپ رہو' 1990 میں شائع ہوا، دوسرا 'فرات' 1992 میں اور تیسرا 'اماوس میں خواب' 2017 میں منظر عام پر آیا۔ وہ اس سے قبل دوسرے اعزازات کے علاوہ غالب ایوارڈ سے بھی سرفراز ہوچکے تھے۔ ان کے انتقال سے ملک کے علمی، ادبی اور دینی حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے ان کی رحلت پر گہرے صدمے کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 دسمبر 2021

وقار ناصری

لکھنؤ: دبستان لکھنؤ کے ممتاز ادیب وشاعر وقار ناصری کا 30 دسمبر کو ان کے آبائی مکان پر مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 81 برس کی تھی۔ مرحوم پچھلے کچھ مہینوں سے پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا تھے۔ چند روز پہلے انھیں

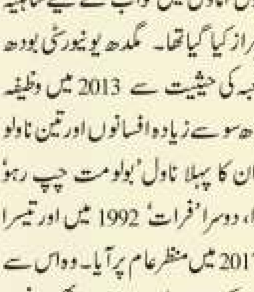

دل کا دورہ بھی پڑ گیا تھا، اس کے علاوہ گردوں نے بھی کام کرنا بند کردیا تھا۔ وقار ناصری ممتاز ادیب و شاعر پروفیسر مہدی حسین ناصری کے پوتے اور مشہور ناول و افسانہ نگار مرحومہ مسرور جہاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاعری اور ادب کا رجحان انھیں ورثے میں ملا تھا اور تقریباً 30 سال کی عمر سے ہی انھوں نے شاعری شروع کردی تھی۔ ان کی غزلیں اور نظمیں شب خون، کتاب ارتقا جیسے ممتاز رسائل میں برابر چھپتی رہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'غبار صحرا' تقریباً 30 سال پہلے منظر عام پر آیا جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ بعد میں رثائی ادب کا ایک

مجموعہ 'پیش خیمہ' بھی شائع ہوا۔ اوائل وقت کے ساتھ ان کا رجحان نثر کی طرف ہوتا گیا اور ان کے دو ناول 'دریچے' اور 'قصہ خواب کہانی' اور 'خزاں کے دنوں میں محبت' منظرعام پر آئے۔ انھوں نے کثرت سے مضامین لکھے جو 'نیا دور' میں پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے 'شہر میر اور ناصر کاظمی' اور 'ایک ذہنی جلاوطن' منظرعام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ تلمیحات کی کتاب 'نیرنگ تلمیحات' اور تحقیقی مضمون کا مجموعہ 'افکار اور آثار' بھی شائع ہوئے۔ انھوں نے قرۃ العین حیدر اور پروفیسر مہدی حسن ناصری پر بھی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ 'شہر میں کرفیو' اور 'ہزار چوراسی کی ماں' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مرحوم کی تدفین کربلا تال کٹورہ میں عزیز واقارب اور علم دوست لوگوں کے درمیان بعد مغربین انجام پائی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 دسمبر 2021

مظفر حسین سید

نئی دہلی: اردو کے معروف صحافی، ادیب، نقاد اور مترجم مظفر حسین سید کا 9 جنوری مارہرہ شریف میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 72 سال تھی۔ وہ کافی دنوں سے علیل تھے۔

شارق ادیب کے قلمی نام سے مشہور مظفر حسین سید کی پیدائش مرادآباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مارہرہ شریف میں حاصل کی جہاں ان کے والد سید اختر حسین زیدی ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1974 میں اردو میں ایم اے کرنے کے بعد مظفر حسین سید نے صحافت کو مشغلہ بنایا۔ معروف استاد پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار کی سرپرستی میں نئے افسانہ نگاروں کی انجمن تشکیل دی۔ دوران طالب علمی میں ہی ان کے متعدد افسانے ملک کے موقر جرائد میں شائع ہوئے اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ علی گڑھ سے ہفتہ وار اخبار 'ہم نوا' اور 'علی گڑھ ٹائمس' شائع کیے۔ صحافت سے غیر معمولی دلچسپی انھیں دہلی لے آئی اور یہاں انھوں نے اس وقت کے معروف اخبارات الجمعیۃ، دعوت، قومی آواز اور اخبار نو میں خدمات انجام دیں۔ ان کے بیشتر مضامین ماہنامہ 'آجکل' اور ہفتہ وار 'ہماری زبان' میں شائع ہوئے۔ معصوم مرادآبادی کی اطلاع کے مطابق مظفر حسین سید نے مشہور وکیل اور سیاست داں ڈی ڈی ٹھاکر کی سرپرستی میں 'حال ہند' کے نام سے ایک معیاری ماہنامہ بھی جاری کیا تھا۔ آخر میں اپنا اشاعتی ادارہ 'سید ایسوسی ایٹ' دریا گنج میں قائم کیا اور بہت سی کتابیں شائع کیں۔ دہلی میں ٹرانسلیشن بیورو کی داغ بیل بھی ڈالی۔ آخر میں صحت خراب رہنے لگی تو علی گڑھ، مرادآباد اور مارہرہ آتے جاتے رہے لیکن انھوں نے آخری سانس مارہرہ میں لی۔ بعد ناز ظہر سرکردہ افراد کی موجودگی میں مظفر حسین سید کی تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 جنوری 2022

ابراہیم اشک

ممبئی: اردو کے مشہور شاعر، نغمہ نویس ابراہیم اشک 16 جنوری 2022 کو ممبئی کے مضافات میں میرا روڈ میں دار فانی سے کوچ کرگئے۔ ابراہیم خاں غوری المعروف ابراہیم اشک کی پیدائش 20 جولائی 1951 کو اجین میں ہوئی۔

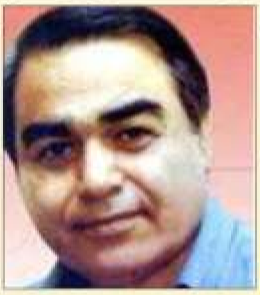

انھوں نے اندور یونیورسٹی سے 1973 میں بی اے اور 74-1973 میں ہندی سے لٹریچر میں ایم اے کیا تھا۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز صحافت سے کیا تھا۔ سشما، شمع اور ہندی کی معروف میگزین 'سریتا' سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ انھوں نے نظموں، غزلوں، دوہوں اور افسانوں میں طبع آزمائی کی۔ الہام، آگہی، کربلا، انداز بیان کچھ اور اور تنقیدی شعور ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ 'رام جی کا دکھ' ان کا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کے افسانوں کا ہندی اور انگریزی زبان میں ترجمہ بھی شائع ہوا۔ انھوں نے بہت سی فلموں میں گانے لکھے جن میں کہو نا پیار ہے، جانشین، اعتبار، آپ مجھے اچھے لگنے لگے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا گانا 'کہو نا پیار ہے' بہت مقبول ہوا۔ ابراہیم اشک کو کئی ایوارڈز بھی ملے ہیں جن میں اسٹارڈز قابل ذکر ہیں۔ 17 جنوری 2022 کی صبح میرا روڈ کے قبرستان میں کورونا پروٹوکول کے تحت اہل خانہ اور قریبی رشتے داروں کی موجودگی میں ان کی تدفین ہوئی۔

روزنامہ 'ممبئی اردو نیوز' ممبئی، 18 جنوری 2022

سید وقارالدین قادری

حیدرآباد: روزنامہ 'رہنمائے دکن' کے ایڈیٹر سید وقارالدین قادری ولد سید یوسف الدین قادری مرحوم کا 9 دسمبر کی رات انتقال ہوگیا۔ وہ چند ماہ سے علیل تھے اور ایک نجی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ 9 دسمبر کو بعد مغرب سید وقارالدین کے قلب پر حملہ ہوا اور وہ رات 11.30 بجے اس دار فانی سے کوچ کرگئے۔ ان کی عمر 82 برس تھی۔ سید وقارالدین انڈو عرب لیگ کے صدر نشین تھے۔ حیدرآباد کی صحافتی دنیا میں انتہائی معتبر اور شریف النفس شخصیت کے طور پر مقبول عام تھے۔ سید وقارالدین قادری کے صدر عراق صدام حسین مرحوم، فلسطین کے صدر مرحوم یاسر عرفات، سابق صدر فلسطین محمود عباس سے شخصی اور انتہائی قریبی مراسم تھے۔

روزنامہ اخبار مشرق دہلی، 11 دسمبر 2021

شہاب الدین مرادآبادی

مرادآباد: شہر جگر کے مشہور استاد شاعر شہاب مرادآبادی 2 دسمبر کی شب دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے غزل اکیڈمی کا ایک تعزیتی اجلاس قومی سکریٹری کشش وارثی کی زیر صدارت محمد علی روڈ پر واقع غزل اکیڈمی کے دفتر میں منعقد ہوا۔ تعزیتی اجلاس میں شہر جگر کے استاد شاعر شہاب مرادآبادی کی وفات کو اردو شاعری کا عظیم نقصان بتایا گیا۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد ظہر جامع مسجد میں ادا کی گئی۔ ککھر واقع حافظ صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ جنازے میں شہر کے شعراء اور معززین کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 3 جنوری 2022

شاہد قمر آفریدی

علی گڑھ: شہر کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی شاہد قمر آفریدی کا 16 دسمبر حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ ان کا اصل نام ولی اللہ خاں تھا۔ وہ 78 سال کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور دوران طالب علمی میں ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں متحرک رہے۔ طلبا یونین کے ترجمان 'علی گیرین' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اپنے کیریئر کی شروعات ماہنامہ 'جمیلہ' (دہلی) سے کی اور اپنی ادارت میں ضخیم سرسید نمبر شائع کیا۔ بہ سلسلہ ملازمت کئی سال سعودی عرب میں مقیم رہے۔ واپسی پر جامعہ اردو علی گڑھ سے وابستہ ہوگئے۔ سبکدوشی کے بعد ادبی سرگرمیاں آخر دم تک جاری رکھیں، سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں شاہ جمال قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ انقلاب 17 دسمبر 2021

24ویں قومی اردو کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں

उर्दू दुनिया, मासिक, फरवरी-२०२२,वर्ष:२४, अंक:२
URDU DUNIYA Monthly, February-2022, Vol.24, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6